ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمایئے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ـ ہے مجلد للعہ ؍

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ ؍ مجلد سہ ؍

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ـ ہے مجلد للعہ ؍

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہ ؍

۱۹۳۹ء نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ ؍

فہم قرآن جدید ایڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ ؍ مجلد سہ ؍

غلامانِ اسلام۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ ؍ مجلد سہ ؍

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک بسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ ؍ مجلد سہ ؍

۱۹۴۰ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت صہ ؍ مجلد سہ ؍

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ ؍

وحیِ الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد سہ ؍

تاریخِ انقلابِ روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ ؍

بُرہان

جلد ہیزدہم　　　　شمارہ (۱)

جنوری ۱۹۴۷ء مطابق صفر المظفر ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد	۲
۲ قرآن مجید اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟	جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی	
۳ اسباب کفر و جحود	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ	
۴ بچوں کی تعلیم و تربیت	سعید احمد	
۵ تبصرے۔	م۔ ح۔	

کیا نسبت ہے تاریخ میں اس وحشت و بربریت اور درندگی و سبعیت کی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی لیکن مسلمانوں کے نامی گرامی زعماء میں سے کتنے ہیں جو وہاں پہونچے ہوں، چند جماعتوں کی طرف سے کچھ وفد گئے بھی تو رپورٹ مرتب کرنے کیلیے حالات کا مشاہدہ کر آئے، اخبارات میں بیان شائع کرا دیے، چندہ کی اپیلیں کر دیں اور بس ہندوؤں میں گاندھی جی جس مرتبہ کے لیڈر ہیں کیا مسلمانوں میں بھی اسی مرتبہ کا کوئی لیڈر وہاں پہونچا اور اس نے وہاں کے مصیبت زدہ مسلمانوں کے زخمی دل و جگر پر اپنے ہاتھ سے تسکین و اطمینان کا پھایہ رکھنے کی کوشش کی جب گھر میں آگ لگ رہی ہو اور تمام سامان جل بھن کر خاک سیاہ ہو رہا ہو اس وقت محض بیان دیدینا کیونکر تقاضائے ہمدردی کی تکمیل کر سکتا ہے، پھر اس سلسلہ میں جو بیانات شائع کیے گئے انمیں بار بار انتقالِ آبادی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ انتقالِ آبادی کا معاملہ اگر ہزاروں کا ہوتا تو اس پر غور بھی کیا جا سکتا تھا لیکن لاکھوں، کروروں کی آبادی کو کس طرح ایک حصہ ملک سے منتقل کر کے دوسرے حصہ میں آباد کیا جا سکتا ہے، پھر اس ناممکن العمل تجویز کو عمل میں لانا اگر مسلمانوں کیلیے ایسا ہی نہایت ضروری اور مفید ہے تو اس کا اہتمام و انصرام خود کرنا چاہیے تھا مگر اس دریوزہ گری کا برا ہو کہ اس کے لیے بھی درخواست وائسرائے بہادر سے ہی کی جا رہی ہے۔ گویا۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوے جس کے سبب　　اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

آہ اے خدا! آج آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی اور قلب یہ کیا محسوس کر رہا ہے کہ تمام صفاتِ کمال، عزم و ہمت، جوشِ عمل، خود اعتمادی، عقل و فہم اور عزتِ نفس، غیروں میں موجود ہیں اور خود تیرے نام لیواؤں کا دامن ان سے تہی ہے، ہمارا جو قدم اٹھتا ہے غلط ہوتا ہے۔ جو بات ہماری زبان سے نکلتی ہے وہ محض جذبات انگیز ہوتی ہے عمل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا، قومیں بن رہی ہیں اور ہم بگڑ رہے ہیں اغیار پار رہے ہیں اور ہم کھو رہے ہیں۔

اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل　　نہ کنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را

ندوۃ المصنفین اور ہندستان کے دیگر علمی اور دینی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ دہلی، کلکتہ کے مشہور و معروف صاحبِ خیر جناب محترم شیخ فیروز الدین صاحب بنگال کے مسلم حلقے سے کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر منتخب کیے گئے ہیں اس حلقے سے جو دوسرے اصحاب کھڑے ہوئے تھے انہوں نے موصوف کے حق میں اپنا نام واپس لے لیا اور اس طرح جناب شیخ صاحب بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ ہم اُس مخصوص تعلق کی بنا پر جو جناب موصوف کو ندوۃ المصنفین سے ہے اس اعزاز پر اُن کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ آنریبل شیخ فیروز الدین کا وجود اس زمانے میں مسلمانوں کے علمی، ۴۴

۴۴ مذہبی اور اجتماعی کاموں کی تکمیل کے لیے ان کی شخصیت بہت ہی قیمتی ہے۔

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۵)

بصائر موعظت اور بصیرت توام ہیں کیونکہ جس کو بصیرت نصیب ہو جائے وہی موعظت بھی حاصل کر سکتا ہے اور جو نصیحت حاصل ہی نہ کرنا چاہتا ہو اُس کو بصیرت سے کیا سروکار بلکہ یوں کہیے کہ عبرت و نصیحت در حقیقت بصیرت کا قدرتی نتیجہ ہیں، جب قرآن "موعظۃ" ہے تو اس کو "بصیرت" بھی ضرور ہونا چاہیے ورنہ شجرِ بے ثمر اور گلِ بے رنگ و بو کی طرح ہو کر رہ جائے گا جو اُس کی شانِ رفیع کے قطعاً خلاف ہے۔

"بصیرت" اپنے معانی اور مدلولات کے لحاظ سے وسیع المعنی لفظ ہے۔ قلبی عقیدہ، علم یقین، یقینی معرفت، عبرت، حجت، برہانِ روشن، فطانت، قلب میں ادراکِ تام و کامل کا حصول، یہ سب ایک ہی حقیقت کا بیان ہیں اور آخری معنی "بصارت" کے مقابل ہیں یعنی آنکھوں کے مشاہدہ سے کسی شئے کا کامل احساس "بصارت" ہے اور قلب سے کامل ادراک کا نام "بصیرت" ہے، چنانچہ آیات "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ" اور "بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ" اس فرق کو نمایاں کرتی ہیں۔

پس قرآن بلاشبہ ان تمام معانی اور مطالب کی روشنی میں "بصیرت" ہے، وہ کہتا ہے کہ میں صرف اپنی ظاہری شکل و صورت اور اپنے الفاظ و نقوش کی ہیئت و ترتیب میں "کتاب" اور "قرآن" نہیں ہوں بلکہ اس لیے بھی ہوں کہ قلبِ انسانی کے لیے ایک روشن عقیدہ اور واضح اعتقاد ہوں، لہٰذا صرف زبان سے میری صداقت کا اقرار کافی نہیں ہے بلکہ قلبی یقین

کی مطابقت بھی اس کے لیے لازمی اور ضروری ہے اور یہ کیوں ہے اس لیے کہ میں ظنون و اوہام وساوس وہواجس اور خیالات وقیاسات نہیں ہوں بلکہ "علم یقین" اور "یقین جازم" ہوں اور میری تعلیم اور مجھ سے حاصل کردہ معرفت یقین محکم پر مبنی ہے۔ میں "ذخیرۂ عبرت" بھی ہوں اور "خزانۂ حجت وبرہان" بھی، میں خود بھی "فطانت" ہوں اس لیے کہ "قول حکیم" ہوں اور دوسروں کی فطانت کے لیے دلیل راہ بھی ہوں اور ہر ایک مدرکِ حقیقت کے لیے آئینۂ ادراکِ کامل بھی۔

اگر بصارت میرے نقوش والفاظ اور نظم وترتیب سے اعجاز کا مشاہدہ کرتی ہے تو میرے معانی ومفاہیم اور مطالب ومدلولات عقل وخرد اور قلبِ صادق کے لیے "بصیرت" کا آئینہ دکھاتے ہیں۔

غور کرو! کہ توحیدِ خالص کی حقیقت تک کس نے پہنچایا، رسالت سے متعلق افراط وتفریط کی گمرہی سے بچا کر طریقِ مستقیم کس نے دکھایا، کائناتِ رنگ وبو میں وہ کون سی الہامی کتاب ہے جس نے ایک "اُمّی" کی معرفت دینی ودنیوی نظام کامل کا معجزانہ مظاہرہ کیا اور ماضی کے سارباتوں کو مستقبل کے لیے جہاں بین وجہاں بان بنایا، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش اور دھندلے خاکوں کو کدورت سے صاف کرکے کس نے بساطِ عالم پر روشن کیا اور مستقبل کے پردہ ہائے غیب کو چاک کرکے کس نے عروج وزوال اور ہدایت وضلالتِ اقوام کو روشناس کرایا، اُمم ماضیہ اور اقوام سالفہ کے عبرت آموز اخبار وواقعات کو پیش کرکے رشد وہدایت اور عبرت وموعظت کے لیے کس نے سامان مہیا کیا اور ملل حقہ میں وحدتِ ادیان کا فراموش شدہ قانون کس نے دہرایا اور معاش ومعاد کو توام بنا کر کس نے حیاتِ مستعار کا پیوند حیاتِ سرمدی کے ساتھ لگایا ہو اگر ان سب سوالات کا جواب صرف اکائی سے دینا چاہتے ہو تو اُس صورت میں یہی کہنا پڑے گا کہ ایسا منظم دستور، محکم قانون، جازم عقیدہ، کامل فطانت، اور ادراکِ تام "قرآن" ہی ہے جو سرتاسر "بصیرۃ" ہی "بصیرۃ" ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علما تفسیر نے اس کے مقامِ بصیرۃ کو "علم" سے تعبیر کیا ہے یعنی

جب جہل کے مقابلہ میں "علم" کہدو تو گویا تم نے سب کچھ کہدیا اور اس سے زیادہ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

کیونکہ جب تم یہ کہنا چاہو کہ وہ نور ہے ظلمت نہیں، حق ہے باطل نہیں، صدق ہے کذب نہیں، عبرت ہے تمسخر نہیں، یقین ہے ظنون و اوہام نہیں، بیان و تبیین ہے اخفاء و ستر نہیں، برہان ہے تقلیدِ جامد نہیں، ہدایت ہے ضلالت نہیں، استقامت ہے زیغ نہیں، تو ان سب کی بجائے بس ایک بات یہ کہہ دو کہ وہ "علم" ہے "جہالۃ" نہیں ہے، اس لیے کہ جُہالۃ" عمیٰ اور کور باطنی ہے اور "علم" بصارت و بصیرت ہے" فَاِنَّھَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ"

لیکن اس کو "بصیرۃ" نہیں "بصائر" کہا گیا ہے یعنی مفرد کے نہیں بلکہ جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، کیونکہ وہ ایک گوشہ کی بصیرت تو نہیں ہے یا ایک پہلو اور رُخ کے لیے تو بصیرت فراہم نہیں کرتا بلکہ وہ تو ہر گوشہ اور ہر سمت اور ہر موقعہ اور ہر محل میں بصیرت ہی بصیرت ہے، الٰہیات ہوں یا مادیات، عقائد ہوں یا اعمال و اخلاق، معاش و معاد ہو یا قصص و اخبار، ہر ایک شعبہ دینی و دنیوی کے لیے بصیرت مہیا کرتا ہے اس لیے وہ صرف "بصیرت" کیسے ہو سکتا تھا وہ تو "بصائر" ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِىَ فَعَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (انعام)	بلا شبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے بصیرتیں آپہونچیں، بس جس شخص نے ان حقیقتوں کا مشاہدہ کیا اُس نے اپنے نفس کو ہی فائدہ پہونچایا اور جس نے اندھا پن اختیار کرلیا تو اُس کا نقصان بھی اُسی پر پڑا اور میں (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) تمہارے لیے نگہبان نہیں بنایا گیا
هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ	یہ تمہارے پروردگار کی جانب سے بصیرتیں

وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ	ہیں اور ہدایت و رحمت ہیں اُن لوگوں کے
يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف)	لیے جو مومن ہیں۔
هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ	یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں اور ہدایت
هُدًى وَّرَحْمَةٌ	اور رحمت ہیں اُن لوگوں کے لیے جو یقین کرتے
لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (جاثیہ)	ہیں۔

حُکُم | ادیانِ سابقہ کی تصدیق، اُن میں نسخ و مسخ اور تحریف کی نگہبانی اور بصائر و عبر اور مواعظ و نصائح کی فراوانی کے بعد قانونِ قدرت کا تقاضا ہے کہ ان حقائق پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے والوں کے لیے "حکم" بھی برسرِ کار آنا چاہیے تاکہ اس کے امتثال سے سعادت اور اُس کے انکار سے شقاوت مثمر و منتج ہو اور ہر فرد اور جماعت اپنے اعمال و افعال میں قانونِ پاداشِ عمل کو پیشِ نظر رکھنے پر مجبور ہو۔

پس قرآنِ عزیز یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ہی وہ "حُکُم" ہوں جو اس ترقی پذیر کائنات کے لیے بقاءِ نسلِ انسانی تک ہمہ گیر ہے اور جس کے امتثال سے سعادتِ کُبریٰ کا حصول اور انکار پر شقاوتِ ابدی کا نزول ہوتا ہے اور ایک نفسِ انسانی خدائے قدوس کی اس حجتِ بالغہ کے بعد جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کے پاداشِ عمل کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

اس لیے آج کسی قوم اور کسی گروہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ میرے "حُکُم" سے سرتابی کرے اور یہ کہہ کر مخلصی پیدا کرے کہ وہ نزولِ قرآن سے قبل نازل شدہ کتابِ الٰہی اور دینِ سابق پر ایمان رکھتا ہے اور اس لیے قرآنِ عزیز کے امتثال کا محتاج نہیں ہے کسی بھی ملّت کو یہ حق اس لیے حاصل نہیں ہے کہ جب میں تاریخِ ملل و ادیان کی روشنی میں برہان اور حجت بن کر یہ ثابت کر چکا کہ ادیانِ سابقہ کے قبول کرنے والوں نے اُن کی حقیقی تعلیم کو فنا کر دیا اور مسخ و تحریف کی گند چھری سے

ذبح کر دیا اور آج نہ وہ ایمانیات میں اُس کے سچے پیرو ہیں اور نہ احکام و اعمال میں اُس کے حامل بلکہ ادیانِ قدیم اور مللِ سابقہ کی سچی اور صاف تعلیم کی اساس و بنیاد درحقیقت وہ ہے جس کو آج میں پیش کر رہا ہوں اور "صراطِ مستقیم" اس کے ماسوا کچھ نہیں ہے گویا میں قوموں کا وہ بھولا ہوا دینی اور ملّی سبق ہوں جو اس کامل و مکمل شکل میں تم کو درسِ ہدایت دے رہا ہوں تو پھر اگر حجتِ حقہ یہ ثابت کر چکا ہے کہ میں "حق" ہوں" نور" ہوں" برہان" ہوں" مصدق" ہوں " مہیمن" ہوں تب جو فردِ انسانی مجھ سے روگردانی کرتا ہے، وہ بلاشبہ حق کی جگہ" باطل" نور کی بجائے" ظلمت" برہان کے بدلہ" رسومِ جاہلیت کی، مصدق کے عوض" مکذّب" کی اور مہیمن کے مقابل" منسوخ و محرف" کی پیروی کرتا ہے اور اس طرح جادۂ حق اور صراطِ مستقیم سے بے راہ ہو جاتا ہے۔

تم اس پر تعجب نہ کرو کہ میں" حُکْمًا عَرَبِيًّا" ہوں، یعنی میری زبان عربی ہے، اس لیے کہ جب تم اس پر تعجب اور حیرانی کا اظہار کرتے ہو تو دوسرے الفاظ میں گویا تاریخ ادیان کے روشن پہلو کے منکر اور یا اس سے بے خبر ہونے کے معترف ہو جاتے ہو۔

کیا تم فراموش کر دو گے کہ خدا کا قانونِ قدرت ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جس کسی قوم کسی ملّت، اور کسی گروہ میں اُس نے اپنا ہادی یا پیغمبر بھیجا ہے تو جس قوم میں بھی وہ بھیجا گیا ہے اُس کی دعوت و تبلیغ اور کتابِ الٰہی کا نزول اُسی زبان میں ہوا ہے، چنانچہ سامی اقوام نے سامی زبانوں میں اور غیر سامی ملتوں نے اپنی اپنی مروجہ زبانوں میں ہی" صوتِ ہادی" کو سنا اور سمجھا ہے۔

تو اب اگر ایک وقت معین ہو چکا تھا کہ خدائے کائنات کا پیغام تمام کائنات میں اقوام و ملل میں جدا جدا نہ سنا اور سمجھا جائے بلکہ توحید الٰہی کے محدود و مفید پیغاماتِ حق نے اب عالَمِ انسانی کو نشو و ارتقاء کی اُس منزل پر پہونچا دیا ہے کہ بالغ نظری اور بلند نگاہی اپنے کمالات کو نمایاں کرے اور وحدتِ ادیان ایک حقیقی وحدت کی شکل میں منصۂ شہود پر آ جائے تب عقلِ سلیم اور فطرتِ مستقیم یہی فیصلہ کرتی ہے کہ دینِ وحدت۔ پیغامِ اقوام لعلمِ کائنات کی

صد المختلف اور متعدد زبانوں میں نہیں بلکہ ایک اور صرف ایک ہی زبان میں سنی اور سمجھی جائے تاکہ قانونِ وحدت یہاں بھی اپنی جگہ برقرار رہے اور اختلاف و انتشار اپنا دخل نہ پا سکے اور جب یہ فیصلہ حق اور صحیح ہے تو پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور جس قوم میں پیغمبرِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا خدا کے پیغام کا بھی اُسی قوم کی زبان میں نزول ہوا۔

اور اگر یہ بات آج مسلمات میں سے ہے کہ قوموں کے تہذیب و تمدن اور ثقافت (کلچر) کی سب سے بڑی ترجمان "قومی زبان" ہوتی ہے اور وہی کسی جماعت کی خصوصیات وامتیازات کا پتہ دیتی اور قوموں کے درمیان اس کو ممتاز بناتی ہے تو پھر علم الالسنہ اس کے لیے شاہدِ عدل ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت عربی ہی وہ زبان تھی جو عالی خیالات اور بلند افکار کے لیے موزوں، روحانی اور علوی تعبیرات کے لیے جاذب، دقیق مضامین کی ادا کے لیے مناسب اور باریک سے باریک فروق اور نازک سے نازک امتیازات کے لیے وسیع، شوکتِ الفاظ میں رفیع، اور فصاحت و بلاغتِ کلام میں بدیع، غرض زندہ زبانوں میں اپنی رفعت وشوکت اور وسعت وطلاقت میں ہمہ گیر اور لغوی مواد میں "ام الالسنہ" کہلانے کی مستحق تھی، اس لیے قرآنِ عزیز کا "عربی زبان" میں نزول گویا تمدنی اور ثقافتی اور عمرانی ولسانی حیثیت سے بھی اُس کے عالم گیر و ہمہ گیر پیغام ہونے پر برہانِ محکم اور حجتِ مبرم ہے۔

حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّا جَعَلْنٰهُ	حٰمٓ قسم ہے اس کتاب واضح کی ہم نے
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝	اُس کو رکھا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھو۔
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ	اور یہ قرآن پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔
بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ	لے کر اترتا ہے اس کو فرشتہ معتبر تیرے دل پر
مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ	تاکہ تو ڈر انے والوں میں سے ہو صاف عربی
مُّبِيْنٍ ۝ (شعراء)	زبان میں۔
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ	اور جس طرح ہم نے اور کتابیں اُن کی قوم کی زبان میں

حُكْمًا عَرَبِيًّا		نازل کی ہیں) اسی طرح ہم نے اتارا قرآن کو
"حکم عربی"۔		(رعد)

الحاصل، قرآن کہتا ہے کہ میں ایسا نظام کامل ہوں کہ کائنات انسانی کے تمام دینی و دنیوی حوائج و حوادث کے لیے میرے احکام اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک انسان جن امور کا مکلف ہو سکتا ہے اُن سے متعلق میرے احکام حاوی اور ہمہ گیر ہیں اس لیے مجھ کو صرف یہ نہ کہو کہ میں "ذو حکم" یا "ذو الامر" ہوں یا "حاکم" و "آمر" ہوں بلکہ مجموعۂ احکام الٰہی کا ایسا رفیع و وقیع سرمایہ ہوں کہ گویا سرتاسر "حُکم" ہوں۔

روح | لیکن صرف اس قدر کافی نہیں ہے کہ میں "حکم" ہوں اس لیے کہ "حکم" تو ایک خاص طرزِ تعبیر کا نتیجہ ہے جو بُری اور اچھی دونوں صورتوں میں وجود پذیر ہوتا رہتا ہے تو کیا میری بھی یہی شان ہے؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ میرے احکام کا ہر ایک گوشہ اور ہر ایک گوشہ اپنے اندر روحِ حیاتِ سرمدی رکھتا ہے اور جو ہستی بھی اُس کے قبول کے لیے گوشِ حق نیوش اور قلبِ حق کیش رکھتی ہے اُس کی زندگی کے بیجان لاشہ میں یہ احکام روحِ تازہ پھونکتے اور زندۂ جاوید بنا دیتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ میرے نزول سے قبل کائناتِ انسانی کی انفرادی و اجتماعی زندگی اور حیاتِ دینی و ملی یا موت کا شکار ہو چکی تھی اور یا کشمکشِ موت و حیات کے ہاتھوں مرغ بسمل بنی ہوئی تھی۔

ہندستان کا قدیم مذہب صرف رسم و رواج کا ایک بے روح ڈھانچہ تھا جس کے ہر رگ و ریشہ سے روح مسلوب ہو چکی تھی، توحید کی جگہ شرک نے لے لی تھی، خدا پرستی مسخ ہو کر اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی نذر ہو چکی تھی، معاشرت نے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اور جزا و سزا اعمال کو کردار کی جگہ نسب و نسل کے ساتھ وابستہ کر کے خود انسان کو انسان کا غلام بنا دیا تھا جو چھوا چھوت اور چھوت، اچھوت کی آلودگیوں اور گھنونے پن کی شکل و صورت میں نظر آ رہی تھی، شوہر کی موت پر ایک عورت کو زندہ ستی ہونا پڑتا تھا، نکاح بیوگان حرام کاری کے مرادف

تھا، اور عورت ہر قسم کی وراثت سے محروم تھی گویا انسانی حقوق سے محروم بے چارہ و مجبور تھی غرض الٰہیات و عبادات بوجھل اور پُر مشقت رسموں اور قیودات سے جکڑے ہوئے تھے اور تمدن و معاشرت پر ایسی کڑی پابندیاں عائد تھیں، کہ انسانی حقوق تک پامال و برباد ہو چکے تھے۔

نصاریٰ و یہود میں تقلیدِ جامد اور رسومِ ظاہری نے نہ صرف اخلاق و اعمال کو مسخ کر دیا تھا بلکہ معتقدات و ایمانیات کو بھی شرک اور رسوم جاہلیت کے پردوں میں مستور کر دیا تھا۔

روما اور فلسطین کی تاریخ قدیم شاہد ہے کہ وہاں بھی انسانیت دو حصوں میں تقسیم نظر آتی ہے نہ غلام انسانوں میں شمار ہے اور نہ انسانی حقوق کا اُس سے کوئی واسطہ، عورت بھی مرد کی خواہشات کا کھلونا تھی اور بس خواہ وہ کنواری مریمؑ کے تقدس کے نام پر "نن" ہو یا قصور و محلّات کی زیب و زینت، رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی مہلک جنگوں نے مذہب کو خونریزی اور سفاکی بلکہ درندگی کا دوسرا نام ہو دیا تھا حتیٰ کہ آزادیِ فکر کی جگہ جمود و خمود اور کورانہ تقلید نے لے لی تھی اور مذہب میں عقل و خرد اور دلیل و برہان ایک بے معنیٰ بات ہو کر رہ گئے تھے۔

زردشتی مذہب کے نام پر ایران میں مانی اور مزدک نے وہ اناری برپا کر دی کہ تہذیب و حیا نے شرم سے آنکھ بند کر لی۔ صاف اور صریح شرک و دوئی کے ساتھ عورت کا صرف عورت رہ جانا اور ماں، بہن بیٹی کا حقیقی رشتہ مفقود کر دینا نالی اور انسانی حقوق میں فوضویت اور ماردرپدر آزادی دیدینا، اس تعلیم نے انسانیت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔

غور فرمایئے کہ اگر کسی معاشرہ کا اجتماعی نظام ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو جس میں عقل و فکر کی آزادی سلب کر کے اُس کی بنیادوں کو صرف رسوم اور خود ساختہ شرطوں اور پابندیوں کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے تو اہل دانش فیصلہ کریں کہ ایسے معاشرہ اور سماج کے اجتماعی نظام کا کیا حشر ہوگا۔ کیا اُس کی کوئی اینٹ بھی سیدھی اور دراست کہی جاسکتی ہے؟ مگر اسلام سے قبل ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں کہ ایشیا و یورپ اور عرب و عجم میں کوئی ایک خطہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کا سماجی نظام جاہلی رسوم

اور باطل قیود و شروط کے جال میں الجھا ہوا نہ ہو اور آزادیِ فکر کو کسی صورت میں بھی کوئی مقام حاصل ہو سکا ہو۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دلیل و برہان کی جگہ "پاپا" "برہمن" اور "موبد" کی شخصیتوں نے لے لی اور انجیل، توراۃ، زبور، اوستا، وید کی حقیقی تعلیمات یکسر فراموش ہو کر ان کا نعم البدل رسوم جاہلیت قرار پائیں اور آہستہ آہستہ انھوں نے اس طرح مذہب اور دھرم کی شکل اختیار کر لی کہ اس کے خلاف وقت کے سچے مذاہب کی تعلیمات فنا کے گھاٹ اتر گئیں اور چشم بصیرت سے غور کرنے والی کسی ہستی کو بھی یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ وہ آزادیِ فکر کے ساتھ حق کا اعلان کر سکے اور جس شخصیت نے بھی اس اقدام کی جسارت کی اس کو بے دین اور ملحد و زندیق کا خطاب دیا گیا۔

تاریخ کے ابوابِ ماضی اگر اپنے نقوش میں کذب کی رنگ آمیزی سے پاک ہیں تو ان میں یہ حقیقت نمایاں اور ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ قرآن نے اپنے پیغام کی بنیاد سر تا سر دلیل و برہان پر رکھی ہے اور جمود و خمود اور کورانہ تقلید و پابندی رسوم کو جہالت قرار دے کر صحیح آزادیِ فکر و آزادیِ رائے کا وہ دروازہ کھول دیا ہے جس کو ہزاروں برس ہوئے کہ مدعیانِ مذاہب و ادیان نے دین و مذہب کے نام پر بند کر دیا تھا، چنانچہ یورپ میں لوتھر کی وہ آواز جو اصلاحِ کنیسہ کے نام سے گونجی اور جس نے تمام یورپ کو تاریکی اور جہالت سے نجات دلا کر ترقی کی راہ پر لگا دیا، اور ہندوستان میں شنکر اچاریہ کی وہ صدا جو ناستکوں کے الحاد اور بت پرستوں کی بت پرستی کے خلاف بلند ہوئی یقیناً قرآن کی صدا، بازگشت ہی کہی جا سکتی ہے، کیونکہ قرآن کی اس تعلیمِ حق کے علاوہ دنیائے مذاہب و ادیان میں کوئی ایک بھی اس پکار سے آشنا نہیں تھا، یہ قرآن ہی کی گرج اور کڑک نے خفتہ عقلوں اور خوابیدہ دماغوں کو بیدار کر کے ہوا کا رخ بدل دیا اور زمانہ کی باگ تاریکی سے روشنی کی جانب موڑ دی۔

غرض کائناتِ انسانی کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ اجتماعی اور ملی حیات سے محروم ایک بے جان لاشہ اور جسم بے روح نظر آتا تھا، جدھر دیکھیے تاریکی اور ظلمت کا دور تھا اور ہر ایک طالبِ حق

غیبی نصرت و امداد کے لیے چشم براہ تھا کہ اچانک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور سرزمین حجاز میں نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور اُن پر وحیِ الٰہی نے نزولِ اجلال کیا اور قرآن نے نازل ہو کر کائنات کی پوری بساط اُلٹ دی اور عالمِ انسانی کے مُردہ لاشہ میں جان ڈال دی، بے روح جسم کو روحِ حیات سے تازہ دم بنا دیا اور ظلمت و تاریکی کے پردوں کو چاک کر کے اس طرح تاباں و درخشاں کر دیا گویا آفتابِ عالم تاب نے طلوع ہو کر شب دیجور کی ساری ظلمتوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا ہے

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ — اور اسی طرح ہم نے تمہاری جانب روح (قرآن)

رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ) — کی وحی کی اپنے حکم سے۔

یعنی جس طرح بدن کے لیے روح ہے اسی طرح قلب کے لیے بھی روح ہے اور اگر اجسام بے روح "لاشہ" ہیں تو قلوبِ بے روح بھی "مردہ" ہیں اور اُن کے لیے قرآن ہی روحِ حیات ہے، روحِ ابدی و روحِ سرمدی۔

یوں تو ہر زمانہ اور ہر دور میں نازل شدہ، وحی الٰہی قلوبِ مردہ کے لیے روحِ تازہ ثابت ہوئی ہیں تاہم "روحِ کامل" کا شرف صرف قرآن ہی کو حاصل ہے اس لیے دیگر کتب سماویہ کے لیے اگرچہ بہت سے اوصافِ عالیہ کا اطلاق ہوا ہے لیکن اُن کو روح کہہ کر نہیں پکارا گیا اور یہ قرآن ہی ہے جس کو "روح" سے تعبیر کیا گیا کیونکہ بلاغتِ کلام کا تقاضا ہے کہ جب ایک ہی وصف مختلف موصوف میں موجود ہو تو پھر اس کا اطلاق ایسے ہی موصوف کے ساتھ ہونا چاہیے جس میں یہ صفت کامل و مکمل طور پر پائی جاتی ہو تاکہ امتیاز ہو سکے اور اُس کی عظمت و جلالت منصۂ شہود پر آ سکے۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اگرچہ جبرئیل امین (جو عبرانی الٰہیات میں ناموسِ اکبر کے نام سے معروف ہیں) کی اہم ڈیوٹی یہی رہی ہے کہ وہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے پاس خدا کی وحی پہونچاتے رہیں اور وہ برابر انبیاء و مرسلین سابقین کے دور میں یہ فریضہ ادا فرماتے رہے تاہم

اُن میں سے کسی بھی الہامی کتاب اور الہامی صحیفہ کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے جبرئیل (علیہ السلام) کو "روح" کے لقب سے یاد نہیں فرمایا اور یہ صرف قرآن ہی کے لیے مخصوص قرار پایا کہ اُس کے نزول کے سلسلہ میں جب جبرئیل (علیہ السلام) کا ذکر آئے تو اُن کو "روح" سے تعبیر کیا جائے چنانچہ شعراء میں ہے "وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ" اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن کے "روح" ہونے کا ہی یہ کمال یا خصوصی امتیاز ہے کہ سورہ قدر میں بھی جبرئیل کو "روح" سے ہی تعبیر کیا گیا ہے "تَنَزَّلُ الْمَلٰئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا" اور یہ اس لیے کہ قرآن کے متعلق یہ بتایا جا چکا ہے کہ اُس کا نزول رمضان المبارک میں ہوا ہے سورہ بقرہ میں ہے "شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ" اور یہ بھی ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اُس کا نزول شب مبارک میں ہوا "حٰمٓ وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ" اور وہ شب مبارک لیلۃ القدر ہے "اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ" تو ضروری ٹھہرا کہ جس ماہ میں اور جس شب میں قرآنِ عزیز کا نزولِ اوّلی ہوا ہے اُس کو ہر سال بطور یادگار منایا جائے اور اُن تمام سعادتوں سے بہرہ اندوز ہوا جائے جو نزول قرآن کے وقت اُس کے مجد و شرف کے لیے مخصوص کی گئی تھیں تاکہ طالب حق اور جویائے مجد و شرف اس سعادتِ کبریٰ سے محروم نہ رہے اور وہ تمام افضال و برکات جو سمٹ کر اس شب میں سما گئی تھیں ایک ایک ہو کر مردِ مومن کے قلب کا نور بن جائیں اور اُس کو حیاتِ ابدی و سرمدی کی نعمت سے مالا مال کر دیں اور جب کہ قرآن کی ایک مخصوص صفت "روح" ہے اور اُس کے لانے والے خدا کے ایلچی کو بھی اس خدمت کی بدولت "روح" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا گیا تو از بس ضروری ہوا کہ ہر سال جب بھی شب مبارک، شب قدر اپنی تمام رعنائیوں اور بے پناہ جمال آرائیوں کے ساتھ بقعۂ نور بن کر آئے تو اس میں بے شمار اور ان گنت فرشتگانِ رحمت کے علاوہ خصوصیت سے "روح" (جبرئیل علیہ السلام) کا بھی اس وصف عالی کے ساتھ نزول ہو اور "روحِ امین" "روحِ قرآن" کے ساتھ وابستہ ہو کر کائناتِ انسانی کے نیم مردہ حیاتِ اجتماعی میں روح پھونکنے کا اعلان کرے اور پکارے کہ آج کی رات خدا کی رحمت نے "روحِ حق" کی یادگار منانے کے لیے مخصوص کر دی ہے کیونکہ اُس کا کلام بھی "روح" ہے اور لانے والا

ایلچی بھی" روح" بس کون خوش بخت و روشن سعادت انسان ہے جو آج کی شب اس "نورٌ علیٰ نورٌ" کو مشعل ہدایت بنا کر دین و دنیا کی کامرانی و کامگاری حاصل کرے اور حیاتِ سرمدی و ابدی کا جویا یاسؔ و ناامیدی کی موت پر قدم رکھ کر "روحِ حیات" تک پہونچ جائے۔

بلاغ| اسی لیے جب درد مند اور صالح قلوب کائناتِ انسانی کی ان تو بر تو ظلمتوں اور تاریکیوں سے گھبرا کر "روحِ حیات" کے طالب ہوئے اور انسانی فلاح و نجاح کی چہار جانب تشنہ سامانی پر نظر کر کے آبِ حیات کے لیے سراسیمہ نظر آئے تو اس وقت قرآن ہی پیغامِ الٰہی بن کر سامنے آیا اور اُس نے ڈوبتے ہوؤں کو سہارا دیا اور وہ سب کچھ سنایا اور بتلایا جس نے ادیان و ملل کی کائنات ہی کو بدل ڈالا اور مُردہ روحانیت کو حیاتِ تازہ بخشی۔ بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائی اور رہِ منزل کو صراطِ مستقیم پر لگا دیا۔ اُس نے گذشتہ قوموں کے عبرت ناک واقعات بیان کر کے ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر پیش کی، احکام دے کر انار کی کا سدِ باب کیا وعد و وعید پیش کر کے پاداشِ عمل کے عواقب سے آگاہ کیا، غرض پیغام بری کے اُن فرائض کو پوری طرح انجام دیا جو دینے والی ہستی کے نزدیک رشد و ہدایتِ عالم کے لیے ازبس ضروری ہے اور ادا، فرض کے بعد یہ کہہ کر خدا کی حجت کو پورا کر دیا" اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

آج تاریخ شاہد ہے کہ بلاشبہ اُس کا پیغام دُکھی دلوں کے لیے مرہمِ حیات، تشنہ کاموں کے لیے آبِ حیات، قنوطیوں کے لیے بشارت، گمرہوں کے لیے ہدایت، غلاموں کے لیے سبقِ حریت، احرار کے لیے درسِ موعظت، مظلوموں کے لیے عدل و نصفت، ظالموں کے لیے سرمایۂ عبرت، غرض مجموعۂ کائنات کے لیے رشد و ہدایت اور "پیغام بشارت" ثابت ہوا، چنانچہ اس حقیقت کو سورۂ ابراہیم میں اس مختصر اعجازِ کلام کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔

هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَ	یہ لوگوں کے لیے "پیغام" ہے اور تاکہ متنبہ ہو جائیں
لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ	اُس سے اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ہے، ایک،

اَلْعَزِيْزُ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ — اور تاکہ سوچ لیں عقل والے۔
اُولُوا الْاَلْبَابِ (ابراہیم)

بیان | پھر قرآن کہتا ہے کہ میں "بیان" ہوں "خفا" نہیں ہوں۔ اس لیے کہ جب میں بلاغ (پیغام) ہوں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خفا اور ستر حقیقت کروں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ "الحق مرٌّ" حق کڑوا ہوتا ہے اس لیے میرا "بیان" ہونا اُن قوموں اور ملّتوں کے لیے تلخی اور ناگواری کا باعث ہوگا جن کے حالاتِ ماضیہ اور واقعاتِ سالفہ خدا کے پیغام کے مقابلہ میں سرکشی اور تمرّدی سے مملو ہیں اور ساری داستانِ حیات بغاوت و سرکشی سے لبریز ہے بلکہ اُن کے لیے بھی باعثِ تکلیف ثابت ہوگا جو آج بھی خدا کی رشد و ہدایت کے مقابلہ میں "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ" کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور "فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى" کو اسوہ بنائے ہوئے ہیں مگر میں قوموں اور جماعتوں کی خوشنودی و ناخوشی کے لیے نہیں ہوں اور نہ میں انسانی دماغوں کی کاوش ہوں کہ ماسوی اللہ کی رضا و غیر رضا کی بنیادوں پر اپنے پیغام کی بنا درکھوں اور حق و صداقت کا کتمان و خفا کر کے "حقیقت" کو بے حقیقت بنا دوں۔ اس لیے میں ہر امرِ حق کے لیے "بیان" ہوں، احکامِ الٰہی کے لیے بیان ہوں، عقائد و ایمانیات کے لیے بیان ہوں اور اخلاق و اعمال سب ہی کے لیے بیان ہوں۔

کیا یہ امر مسلّم نہیں ہے کہ "الساکت عن الحق شیطان اخرس۔ حق کے اظہار پر خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے" بس جب یہ صحیح ہے تو پھر تم ایسے پیغام کے متعلق کیا تصور رکھتے ہو جو کمزور انسانوں کی جانب سے نہیں بلکہ قادرِ مطلق کی طرف سے ہے، جو مرعوب اور خوف زدہ روحوں کی کیفیات کا ترجمان نہیں، بلکہ مالک الملک کی شئون الٰہیہ سے وابستہ ہے اور کلامِ الٰہی ہے، جو ستر و کتمان کے لیے نہیں آیا بلکہ ظہور و وضوح کے لیے نازل ہوا ہے اور ان ہی حقائق کے پیشِ نظر میری خصوصی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے "بیان" ہوں۔

وَهٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ — اور یہ (قرآن) بیان ہے لوگوں کے لیے اور

مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران) ہدایت و نصیحت ہے متقیوں کے لیے۔

آیاتِ بیّنات | بیان و وضوح کا یہی کرشمہ میری ہر ایک آیت اور ہر ایک جملہ سے عیاں اور نمایاں ہے اس لیے میں "بیان" بھی ہوں اور "بیّنات" بھی اور "آیاتِ بیّنات" بھی ہوں اور "بیّنہ" بھی یعنی گو کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لیے کتبِ سماویہ کا نزول ہوتا رہا اور انہوں نے "ہدایت" بن کر پیغامِ حق کا فرض انجام دیا لیکن ان سب میں یہ خصوصیت مجھ کو ہی حاصل ہے کہ معارفِ الٰہیہ اور احکامِ عملیہ کے متعلق جو کشفِ حقیقت اور وضوحِ بیان میں لے کر آیا ہوں یہ امتیاز دوسری کتابوں کو حاصل نہیں ہے کہ نہ میری حقیقت میں کوئی التباس ہے اور نہ میرے احکام اور اوامر و نواہی میں کوئی ستر و خفا ہے، نہ استعارات و کنایات ہیں اور نہ اغلاق و معمّہ۔

بلاشبہ توراۃ ہدایت و نور ہے لیکن اس میں غوامض و مشکلاتِ معانی کی اس قدر کثرت ہے کہ بعض جگہ اصل مسئلہ کی حقیقت تک مشتبہ ہو جاتی ہے، اس لیے ہدایت وحق کی وہ برق ضو افگن جو قرآن میں نظر آتی ہے نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح انجیل بھی کتبِ سماویہ میں بلاشبہ نور و ہدایت ہے تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اُس کے مواعظ و احکام اور بصائر و امثال میں جو اغلاق اور ابہام ہے اُس نے بہت سے مقامات کے مفاہیم کو خود محققینِ توراۃ پر مشتبہ کر دیا اور وہ حقیقتِ حال کے متعلق غلط روی میں مبتلا ہو گئے حتیٰ کہ بائبل نے ایک جگہ خود ہی یہ اقرار کر لیا ہے کہ "مسیح نے فرمایا! میں ہر ایک بات تم سے نہ کہونگا اور بہت سی باتیں ہیں جو کہنے کے لائق ہیں مگر وقت نہیں آیا کہ کہوں اور تمہارے پاس "روحِ حق" فارقلیط آئے گا جو تم سے وہ سب کچھ کہہ ڈالے گا"۔

نیز دانیال (علیہ السلام) کی کتاب میں ہے کہ یہ صحیفہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے مگر اس کے باوجود اُس کے اکثر مضامین رموز و اشارات کی ایک چیستان ہیں، جن کے سمجھنے کے لیے دماغی کاوشوں کو سخت صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی فیصلہ کن رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اور یہی حال موجودہ اوراقِ اَوِستا کا ہے۔

لیکن قرآن کے معانی ومفاہیم کے سمجھنے سے متعلق نہ تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو تاریکی سے
اسطہ پڑا اور نہ سلفِ صالحین اندھیرے میں حیران وسرگرداں نظر آئے بلکہ لغتِ عرب اور
یاوراتِ زبان اور سیاق وسباقِ عبارت پر جو شخص جس قدر بصیرت رکھتا ہے قرآن اُن میں سے
ہرایک کے لیے ایک واضح بیان، ظاہر کلام، اور صاف وسادہ حقیقت بن کر ضوء افگن ہے۔
پس قرآن کا یہ دعویٰ حق ہے کہ وہ کتبِ سماویہ میں سب سے افضل وبرتر ہے اور
س وصفِ خاص میں بھی ممتاز ہے کہ وہ ہدایت کے لیے "آیاتِ بیّنات" ہے اور امورِ الٰہیہ
ورحق وباطل کے امتیاز کے لیے "بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ" ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ)
مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق وباطل سے جدا کرنے کی۔

(آل عمران)۔ صف۔

وَكَذٰلِكَ أَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ بَیِّنٰتٍ (حج)
اور یوں اتارا ہم نے یہ قرآن کھلی باتیں۔

یونس، مریم، جاثیہ، سبا، نور، حدید، مجادلہ،

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ (انعام)
سو آچکی تمہارے پاس حجت تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت۔

متشابہ | مسطورہ بالا امتیاز کو پیش نظر لاکر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر قرآن کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ "بیان"
"بیّنہ" "بیّنات" اور "آیاتِ بیّنات" ہے جس میں خفاء، رمز، اغلاق، اشتباہ، قطعاً موجود نہیں ہے تو پھر
قرآن نے یہ کیوں کہا ہے کہ وہ "متشابہ" ہے؟ اس لیے کہ قرآن نے متشابہ کہا ہے "مشتبہ" نہیں
کہا اور اگرچہ ان دونوں کا مادہ ش، ب، ہ ہے، تاہم دونوں کے معنی جدا جدا ہیں کیونکہ مشتبہ تو اس

صورتِ حال کا نام ہے جس میں کسی ایک جانب کا تعین نہ ہو سکے اور تردد و اضطراب اور قلق وانتشار اُس کا لازمی نتیجہ ہے اور اس کے برخلاف متشابہ اُس حقیقت کا نام ہے جس میں دو یا چند امور ایک دوسرے کے ساتھ ہم شکل ہم صورت ہوں اور ان میں یکسانیت و ہم رنگی پائی جاتی ہو تو قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ میری تمام آیات، احکام امثال و قصص، وعد و وعید، بیان حق و صدق مضارّ منافعِ معاد و معاش غرض حُسنِ کلام اور صدقِ مضامین کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوی اور ہم رنگ ہیں اور جس طرح توام بچے اکثر ایک دوسرے کے ہم شکل و ہم شبیہ ہوتے ہیں ٹھیک اُسی طرح میرے نظم و معانی کے تمام انواعِ مضامین و ادا میں بلیغ مشابہت پائی جاتی اور تمام و کمال یک رنگی ہویدا ہے اس لیے میرا "بیان" و "بینہ" ہونا میرے "متشابہ" ہونے کے خلاف نہیں ہے بلکہ مزید تائید و تقویت کا باعث ہے اور یہ بھی میرا ایک خصوصی امتیاز ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ   اللہ نے ہی اتارا سب سے اچھی بات

كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا   (قرآن) کو جو ہے کتاب مشابہت رکھنے والی۔

(باقی آئندہ)

اسباب کفر وجحود

جو قرآن مجید میں بیان ہوئے

تیسرا سبب۔ استکبار واستہزاء

از جناب ڈاکٹر میر ولی اللہ صاحب ایڈووکیٹ ایبٹ آباد

(۳)

کفر وجحود کے پہلے سبب یعنی تقلید آباؤ اکابر وغیرہ اور دوسرے سبب یعنی اعراض کا ذکر ہو چکا اس مضمون میں تیسرے سبب یعنی استکبار واستہزا کا بیان مطلوب ہے، پہلے دو سبب اپنی ہمہ گیری کی وجہ سے خطرناک ہیں، تیسرا سبب مجرمیت کے لحاظ سے ان دونوں سے زیادہ خطرناک ہے تقلید و اعراض کا مرتکب اتنا مجرم نہیں، جتنا استکبار و استہزا کا مرتکب، تقلید و اعراض کا مجرم ایک گونہ نادانستہ طور سے سستی بے پرواہی اور غفلت کا شکار ہوتا ہے لیکن استکبار و استہزا کا مرتکب دیدہ و دانستہ کفر وجحود کو ایمان و اقرار پر ترجیح دیتا ہے۔

تکبر اور ایمان کی دشمنی آگ اور روئی کی دشمنی ہے۔ ایک حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان اور تکبر ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

وعن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہ	ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ کہا کہ فرمایا رسول
صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل النار	کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نہیں داخل ہوگا دوزخ
احدٌ فی قلبہٖ مثقال حبۃٍ من	میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں رائی کے دانہ کے

خردلٍ من ایمانٍ ولا یدخل	برابر بھی ایمان ہوگا، اور نہیں داخل ہوگا بہشت
احدٌ فی قلبہ مثقال	میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں رائی کے
حبۃٍ من خردلٍ من کبرٍ	دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا۔ روایت کیا
رواہ مسلم (مشکوٰۃ باب الغضب	اسے مسلم نے (بحوالہ مشکوٰۃ)
والکبر الفصل الاول)	

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تکبّر اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے حتیٰ کہ جس دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، اُس دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر نہیں ہوسکتا اسی طرح اگر کسی دل میں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی تکبّر موجود ہو، اس دل میں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔

بظاہر بات بہت سخت ہے اور انداز بیان اس سے بھی سخت تر یہی وجہ ہے کہ شارحینِ حدیث نے اس حدیث کی شرح میں تاویلیں کی ہیں، صاحب اشعۃ اللمعات نے لکھا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرّہ بھر ایمان ہو۔ وہ دوزخ میں (ہمیشہ کے لیے) داخل نہیں ہوتا۔ اور جس شخص کے دل میں ذرہ بھر تکبر ہو وہ (سابقین کے ساتھ) بہشت میں داخل نہیں ہوتا، مطلب یہ کہ جس آدمی کے دل میں تھوڑا سا ایمان بھی ہو، وہ کچھ عرصہ دوزخ میں رہ کر بہشت میں داخل ہو جائے گا۔ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہ سکتا اور جس آدمی کے دل میں تھوڑا سا تکبّر بھی ہو، وہ جاتے ہی بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا، کچھ عرصہ ضرور دوزخ میں رہنا پڑے گا۔

یہ تعبیر ہر چند حدیث کے الفاظ کی ظاہری سختی کو دور کر دیتی ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ میں اس تعبیر کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اگر اس حدیث کا یہی مطلب ہوتا تو ضرور ہے کہ الفاظ اور ہوتے اور طرز بیان اور ہوتا۔

حدیث کا پہلا حصہ تو بہر حال کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا، حدیث کے دوسرے حصّے کا اگر یہ مطلب لیا جائے۔ کہ جس شخص کے دل میں مستقل طور سے تکبّر کا تھوڑا بہت مادّہ موجود ہو۔ وہ

کبھی بہشت میں نہیں جاسکتا، تو اس حصے میں بھی کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ قرآن مجید میں بار بار متکبرین کو جہنمی کہا گیا ہے۔ اور احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہے، یہ اور بات ہے کہ آدمی انسانی کمزوریوں کے زیرِ اثر گاہے ماہے کبر کا مرتکب ہوجائے، ایسا آدمی یقیناً بعد میں اپنے کیے پر پشیمان بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن جو شخص ایسا متکبر ہو، کہ تکبر اس کی فطرتِ ثانی بن چکا ہو، وہ ہرگز ایماندار نہیں ہوسکتا اور کسی صورت میں بھی بہشت کا حقدار نہیں بن سکتا۔

تکبر سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اور اپنی صفات کو دوسروں کے مقابلہ میں برتر سمجھے، دوسروں کو بنظرِ حقارت دیکھے۔ اپنے سے بظاہر کم درجے کے لوگوں کی بات کو ہنسی مزاق میں اڑا دے، کلمۂ حق کی تضحیک کرے اور اپنی صفات و کمالات پر اتراتا رہے۔

نسب پر تکبر | ہر بات کی بنا پر تکبر ہوسکتا ہے۔ مثلاً جسمانی طاقت پر، قد و قامت پر، خوش وضعی، خوش اندامی پر، دولت پر، علم پر، اثر و رسوخ پر، کسی نوع کی سروری پر، قوم پر، خاندان پر، آبا و اجداد وغیرہ وغیرہ، لیکن سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ عام تکبر قوم، خاندان اور آبا و اجداد کی بنا پر ہوتا ہے، اقوام کی تقسیم کے لیے ہندو دنیا بھر میں بدنام ہیں۔ اسلام قومی تقسیم کو حد درجہ مذموم سمجھتا ہے لیکن نہایت افسوس اور شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جہاں ہندو اس تقسیم کے ضرر رساں اثرات سے بہت حد تک مصئون ہو چکے ہیں اور روزانہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہاں مسلمان اس لعنت میں بیش از بیش مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، یہ قصہ سچا ہے یا جھوٹا۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت کا صحیح آئینہ بردار ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک پٹھان اپنے گاؤں کے مولوی صاحب کے پاس گیا اور پوچھا کہ "ہمارے حضرت صاحب (یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پٹھان تھے یا ہندکی"۔ (پٹھان تمام غیر پٹھان اقوام کو ہندکی کہتے ہیں) مولوی صاحب نے کہا کہ "خان صاحب آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں"۔ پٹھان نے جواب دیا کہ "اگر آں جنابؐ ہندکی ہوں تو (نعوذ باللہ) ہم ان کا کلمہ پڑھنا چھوڑ دیں"۔

یاد نہیں کس صاحب نے کہا تھا لیکن کہا ضرور تھا کہ "ہم اولیا کے تذکروں میں بافند

نداؤں، گل کاروں خشت سازوں اور دیگر پیشہ وروں کے نام کثرت سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اہلِ بیت کے نام شاذ و نادر ہی ملتے ہیں" گویا ان صاحب کے نزدیک خدا رسیدہ ہونا صرف اہلِ بیت کا حق ہے، پیشہ وروں کا حق نہیں، یہ زمانۂ جاہلیت کی وہی ذہنیت ہے جسے دور کرنے کے لیے اسلام نے اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اسلام کی پیروی کا دعویٰ کر کے فلاں ابن فلاں کی بنا پر تکبّر کرنا اسلام کا انکار کرنا ہے اور یہی تکبّر بعض لوگوں کے لیے کفر و جحود کا باعث بن جاتا ہے۔

انسانی زندگی کی صبحِ اول ابھی دوپہر کے حدود میں بھی داخل نہ ہوئی تھی۔ کہ تکبّر بر بنائے خاندان کی وجہ سے، انسان کے سامنے، ایک نامراد کے گلے میں ابدی لعنت کا طوق ڈالا گیا، یہ انسان کے لیے ایک عظیم الشان اور ناقابلِ فراموش درسِ عبرت تھا۔ لیکن۔ ع وائے نہ یک بار کہ صد بار وائے، بر حالِ انسان کہ اس نے بجائے عبرت حاصل کرنے کے اسی خطرناک تکبّر کو اپنا خاصہ بنا لیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ	اور پیدا کیا ہم نے تم کو اور صورتیں بنائیں تمہاری
قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ	پھر کہا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو۔ پس سجدہ
فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ	کیا انہوں نے لیکن ابلیس نے نہ کیا۔ وہ سجدہ
السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا	کرنے والوں سے نہ ہوا۔ اللہ نے اُسے کہا کہ
تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۔	تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے منع کیا حالانکہ
قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۔	میں نے تجھے حکم دیا تھا، ابلیس نے جواب دیا
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ	کہ میں بہتر ہوں آدم سے۔ کیونکہ تو نے مجھے آگ
مِنْ طِيْنٍ ۝ (۷-۱۱ و ۱۲)	سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے پیدا کیا۔

ایک اور مقام پر ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲-۳۴)

اور جب کہا ہم نے فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو سجدہ کیا انہوں نے لیکن شیطان نے نہ کیا نہ مانا اور تکبر کیا اور تھا کافروں سے۔

نسلی امتیاز پر تکبر کرنے کی وجہ سے کفر و جحود میں مبتلا ہونے کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ شیطان کی تقلید میں انسان نے بھی "انا خیر منہ" کہنا شروع کر دیا۔ اور قومی یا خاندانی امتیاز کی بنا پر دوسروں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگا۔ آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں فلاں قوم کا چشم و چراغ ہوں اور یہ فلاں قوم کا فرد ہے۔ اس لیے مجھے اس پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ فی الواقعہ شیطان کے اس قول کو دُہرا رہا ہے کہ "خلقتنی من نار و خلقتہ من طین" ہم سب کے لیے یہ غور کا مقام ہے کہ ہم اس معاملے میں شیطان کے نقش قدم پر تو نہیں چل رہے۔

انسان کا خاندان کی بنا پر تکبر کرنا شیطان کے تکبر کے مقابلے میں بہت زیادہ مذموم ہے۔ کیونکہ شیطان تو پھر آگ سے پیدا ہوا تھا اور آدم اُس کے مقابلے میں مٹی سے پیدا ہوا تھا۔ لیکن آدمی کا آدمی کے مقابلے میں تکبر کرنا مطلق بے معنی ہے کیونکہ تمام آدمی آدم کی اولاد سے ہیں اور مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں سب سے اوّل ایمان لانے والے وہی لوگ ہوئے ہیں جو ضعیف، مسکین اور دنیاوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کم حیثیت ہوتے تھے۔ اور یہ بھی امر واقع ہے کہ ان ایمانداروں کو دیکھ کر اُمرا رؤسا اور دوسرے صاحب وجاہت لوگ محض اس تکبر کی وجہ سے کفر و جحود میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ ہم ایسے بے مایہ لوگوں کی جماعت میں کیوں شریک ہوں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ — اور جب پڑھی جاتی ہیں اُن پر ہماری روشن آیتیں

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ	تو کافر مومنوں کو کہتے ہیں۔ کہ ان دو فریقوں میں
اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ	سے کون ہے بہتر مقام کے لحاظ سے اور
مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ (۱۹-۷۳)	کون ہے بہتر مجلس میں۔

دو فریق یعنی مومن اور کافر۔ غریب مسلمانوں کو دیکھ کر امیر کافر اللہ تعالیٰ کی آیاتِ بیّنات سے محض اس لیے انکار کر دیتے تھے کہ ہم ان مسلمانوں کے مقابلے میں جاہ و ثروت کے لحاظ سے بلند تر مقام پر ہیں اور مجالس میں ہم ان لوگوں سے زیادہ معزز اور مکرم سمجھے جاتے ہیں۔ ہم ان کی جماعت میں کیوں شریک ہوں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ	اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ ایمان لاؤ جیسا
اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ	کہ اور لوگ ایمان لائے ہیں۔ تو جواب دیتے
كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ	ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ بے وقوف
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ	لوگ ایمان لائے۔ خبردار رہو کہ یہ خود بیوقوف
لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۲-۱۳)	ہیں۔ لیکن نہیں جانتے۔

عقل پر تکبر | یہ اپنے علم اور عقل پر تکبر ہے۔ اور اسی تکبر کی بنا پر یہ لوگ ایمان لانے سے منکر ہو جاتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ دیکھو اور لوگ ایمان لے آئے۔ تم کیوں ایمان نہیں لاتے۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ ایمان لانے والے لوگ ہمارے مقابلے میں کم علم اور کم عقل ہیں ہم ان بے وقوفوں کی جماعت میں کیوں شریک ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تکبر کرنے والے خود بے وقوف ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

اپنی عقل پر تکبر کرنے والے لوگ نہ صرف دولتِ ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں، بلکہ اور کئی فوائد سے بھی بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ لوگ کوئی بات سُنیں گے تو اس پر محض اس لیے غور نہ کریں گے کہ ہم کہنے والے سے زیادہ عقل مند ہیں۔ اس کی بات ہماری توجّہ کی مستحق نہیں، کوئی چیز پڑھیں گے تو اس پر تدبر نہ کریں گے۔ بدیں خیال کہ ہم خود سب کچھ جانتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا	تحقیق وہ لوگ جو گنہ گار ہیں۔ اُن لوگوں پر جو ایمان
مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ ۔	لائے ہنستے تھے، اور جب گذرتے تھے اُن کے
وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ۔	پاس سے تو آنکھیں مارتے تھے۔ اور جب اپنے
وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا	لوگوں کی طرف پھر کر جاتے تھے تو باتیں بناتے
فَكِهِیْنَ۔ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا	ہوئے جاتے تھے۔ اور جب دیکھتے تھے اُن کو تو
اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۔ (۸۳-۲۹) (مطففین)	کہتے تھے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں۔

یہ نامُراد لوگوں کی عادت ہے، لوگوں پر ہنسنا، انہیں دیکھ کر آنکھیں مارنا، اور جاتے ہوئے طرح طرح کی باتیں بنانا۔ یہ استہزا ان لوگوں کے لیے کفر و جحود کا باعث بن جاتا ہے۔

یہ روزانہ تجربے کی بات ہے کہ لوگ کوئی تقریر سُن کر آئیں گے، یا کہیں وعظ کی مجلس سے واپس آئیں گے، تو رستے میں رنگا رنگ بیہودہ تنقیدیں کرتے تمسخر کرتے اور آنکھیں مارتے جائیں گے کبھی بھول کر بھی جو کچھ سُنا ہے اُس پر غور نہ کریں گے۔

دوزخ میں متکبرین کی اکثریت

قرآنِ مجید کے اکثر مقامات سے معلوم ہوتا ہے، کہ اہلِ دوزخ کی اکثریت ان ہی استکبار و استہزا کرنے والوں کی ہوگی، تقلید و اعراض کی وجہ سے گمراہ ہو جانے والوں کے لیے تو پھر بخشے جانے کی گنجایش ہو سکتی ہے، استکبار و استہزا کرنے والے عفو و مغفرت کے قطعًا حق دار نہیں ہو سکتے، یہ لوگ بدترین قسم کے مجرم ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔

عن حارثة بن وهب قال قال	حارثہ بن وہبؓ سے روایت ہے کہ کہا کہ فرمایا
رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کیا میں تمہیں
الا اخبركم باهل الجنة كل	اہلِ جنت کی خبر نہ دوں۔ تمام ضعیف لوگ جنہیں
ضعيف متضعف لو اقسم	لوگ حقیر سمجھتے ہیں اگر وہ قسم کریں اللہ پر تو ضرور
على الله لابره۔ الا اخبركم	سچا کرے اللہ اس کو۔ کیا میں تمہیں اہلِ دوزخ

باهل النار کل عُتُلٍ جَوَّاظٍ مُستکبِرٍ ۔ (متفق علیہ)	کی خبر نہ دوں۔ تمام درشت طبع، بخیل اور تکبر کرنے والے۔

(مشکوٰۃ۔ باب الغضبُ الکبر فصل اول)

یعنی اہلِ جنت کی اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جو کم حیثیت اور ضعیف ہیں اور جنہیں لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن خدا کے نزدیک ان کی اتنی قدر ہے کہ اگر وہ کسی بات پر اصرار کریں تو خدا اُسے ضرور پورا کرے، اور اہلِ دوزخ کی اکثریت اُن لوگوں کی ہوگی جو درشت طبع بخیل اور متکبر ہوں گے۔

یہی بات مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا	(دوزخی) کہیں گے کہ اے ہمارے رب!
وَکُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ۔ رَبَّنَا	غالب آئی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گمراہ قوم تھے
اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا	اے ہمارے رب نکال ہم کو اس سے (یعنی
فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔ قَالَ اخْسَئُوْا	دوزخ سے) اگر ہم پھر ایسا کریں گے تو ظالم ہوں گے۔
فِیْهَا وَلَا تُکَلِّمُوْنِ۔ اِنَّهٗ کَانَ	خدا کہے گا دور ہو دوزخ میں اور مجھ سے بات
فَرِیْقٌ مِّنْ عِبَادِیْ یَقُوْلُوْنَ	نہ کرو۔ میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو کہتے
رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا	تھے کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ہم کو
وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ	بخش اور ہم پر رحم کر۔ تو بڑا رحم کرنے والا ہے
الرّٰحِمِیْنَ۔ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ	تم نے ان لوگوں سے تمسخر کیا حتیٰ کہ بھلا دی
سِخْرِیًّا حَتّٰٓی اَنْسَوْکُمْ ذِکْرِیْ	انہوں نے تمہیں میری یاد۔ اور تم اُن لوگوں پر
وَکُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَکُوْنَ (۲۳: ۱۰۶ تا ۱۱۰)	ہنستے تھے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ دوزخی اکثر وہی لوگ ہوں گے جو ایمان داروں پر ہنستے اور ان کے ساتھ تمسخر کیا کرتے تھے، یہی استہزا ان لوگوں کے کفر و جحود کا باعث بنا تھا

بَلٰی قَدْ جَآءَتْکَ اٰیٰتِیْ فَکَذَّبْتَ	یوں نہیں۔ بلکہ آئیں تیرے پاس میری نشانیاں،
بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ	پس جھٹلایا تونے ان کو اور تکبّر کیا، اور تھا تو کافروں
مِنَ الْكٰفِرِيْنَ . وَيَوْمَ	سے۔ اور قیامت کے دن تو دیکھے گا اُن لوگوں
الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا	کو جو اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں کہ اُن کے مُنہ
عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ	کالے ہونگے، کیا نہیں ہے دوزخ میں متکبّرین
اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى	کے لیے رہنے کی جگہ۔

لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔ (۳۹-۵۹و۶۰)

عذاب دیکھ کر کافر طرح طرح کے عذر کریں گے، انہیں جواب میں کہا جائے گا کہ تم نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا اور تکبّر کیا، آج تمہارا کوئی عذر مقبول نہیں۔ پھر فرمایا کہ اِن متکبّرین کے مُنہ کالے ہونگے اور دوزخ اُن کے رہنے کی جگہ ہوگی۔

قرآن مجید میں اکثر مقامات پر دوزخیوں کو اُن کا استکبار اور استہزا یاد دلایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جہنم کی اکثریت ان ہی مستکبرین کی ہوگی۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ	اور کہا تمہارے رب نے کہ دعا کرو مجھ سے میں
اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ	تمہارے لیے قبول کروں گا، جو لوگ میری
الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ	عبادت سے تکبّر کرتے ہیں وہ جلدی داخل
سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ	ہوں گے دوزخ میں ذلیل ہوکر۔

دٰخِرِيْنَ ۔ (۴۰-۶۰)

معلوم ہوا کہ بعض بدبختوں کو خدا کی عبادت کرنے اور دعا کرنے سے اُن کا تکبّر مانع ہوتا ہے، یہ نامراد خدا کے آگے سر جھکانے کو بھی باعثِ عار سمجھتے ہیں، نعوذ باللہ من شرور انفسنا، یہ شقاوت زدہ لوگ شیطان سے بھی زیادہ خبیث ہیں۔

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ	وہ لوگ جو جھٹلاتے ہیں کتاب کو اور اس چیز کو جس کے

وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا فَسَوْفَ	ساتھ ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا۔ پس البتہ
يَعْلَمُوْنَ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْ	انہیں معلوم ہو جائے گا، جب ان کی گردنوں
اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ	میں طوق ہونگے، اور زنجیریں، گھسیٹے جائیں گے
يُسْحَبُوْنَ۔ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي	گرم پانی میں، پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔
النَّارِ يُسْجَرُوْنَ۔ ثُمَّ قِيْلَ	پھر کہا جائے گا انہیں، کہاں ہیں وہ (معبود)
لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۔	جنہیں تم شریک کرتے تھے سوائے اللہ کے
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا	وہ کہیں گے کہ وہ ہم سے کھوئے گئے۔ بلکہ ہم
عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا	تو اس سے پہلے (سوائے خدا کے) اور کسی
مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا كَذٰلِكَ	کو پکارتے ہی نہ تھے، اس طرح گمراہ کرتا ہے اللہ
يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ۔ ذٰلِكُمْ	کافروں کو، یہ اس لیے ہے کہ تم زمین میں ناحق
بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي	خوش ہوتے تھے، اور اس لیے کہ تم اتراتے
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ	تھے، داخل ہو دوزخ کے دروازوں میں ہمیشہ
تَمْرَحُوْنَ۔ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ	وہیں رہنے کے لیے، پس بری ہے جگہ تکبر
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى	کرنے والوں کی۔
الْمُتَكَبِّرِيْنَ۔ (۴۰۔ ۷۰ تا ۷۶)	

مشرکین شرک میں اس لیے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے تکبر کی وجہ سے پیغمبروں کی تعلیم کو اور خدا کی کتابوں کو جھٹلاتے ہیں۔ پیغمبروں کے مقابلے میں اپنی دولت اور جاہ و ثروت پر اتراتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کرتے کہ اُن کی موجودگی میں اور کوئی منصبِ رسالت سے سرفراز کیا جائے۔

اِن آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کو پُر کرنے والے متکبر لوگ ہوں گے کیونکہ اُن کے تکبر نے انہیں کفر و شرک میں مبتلا کر دیا تھا۔

اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ. طَعَامُ الْأَثِيمِ	درخت زقوم کا، کھانا ہے گنہگار کا۔ گلے ہوئے
كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ. كَغَلْيِ	تانبے کی طرح پیٹوں میں جوش کرتا ہے، جیسے جوش
الْحَمِيمِ. خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ	کرتا ہے گرم پانی، پکڑو اس کو پھر گھسیٹو اس کو
سَوَاءِ الْجَحِيمِ. ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ	دوزخ کے بیچوں بیچ، پھر ڈالو اس کے سر پر گرم
رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ.	پانی سے عذاب۔ چکھ۔ تو بڑا عزت والا اور
ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ	بزرگی والا تھا۔
الْكَرِيمُ. (۴۴-۴۳ تا ۴۹)	

اِن آیات میں جس ہولناک عذاب کا ذکر ہے۔ اس کے مستحق وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ جو دنیا میں اپنے آپ کو بہت معزز اور بہت بلند مرتبت سمجھتے ہیں، اور جن کا تکبّر اُن سے گناہ کراتا ہے اور ایمان لانے سے روکتا ہے، عذاب پر عذاب یہ کہ عین بوقتِ عذاب اِن لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم تو بڑے معزز اور مکرم تھے، اب یہ لطف بھی اٹھاؤ۔

ذَٰلِكُمْ بِأَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ	یہ اس لیے ہے کہ تم نے آیات اللہ سے ٹھٹھا
هُزُوًا وَغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا	کیا۔ اور دنیا کی زندگانی نے تمہیں فریب دیا۔ آج
فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ	وہ نہ نکالے جائیں گے دوزخ سے اور نہ اُن کا
يُسْتَعْتَبُونَ. (۴۵-۳۵)	کوئی عذر قبول کیا جائے گا۔

یہ خطاب ہے دوزخیوں سے، کہ تم کو دنیاوی وجاہت نے فریب دیا، اور اس غرور میں تم آیاتِ الٰہی سے تمسخر کرتے رہے۔ آج تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہاری کوئی معذرت مقبول نہ ہوگی، قرآنِ مجید میں جابجا دوزخیوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ تم دنیاوی دولت و ثروت کی بنا پر تکبر کرتے تھے۔ اور آیات اللہ سے استہزا۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى	اور جس دن پیش کیے جائیں گے کافر آگ پر (تو اُن
النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي	سے کہا جائے گا کہ تم اپنی نیکیاں دنیا کی زندگی

حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ	میں ہی لے گئے اور تم نے ان سے فائدہ اٹھالیا
بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ	آج بدلہ دیے جاؤ گے تم رسوائی کے عذاب سے
الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ	کیونکہ تم تکبر کرتے تھے۔ زمین میں بغیر حق کے اور
فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا	اس لیے کہ تم فسق کرتے تھے۔
كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (۲۰۔۴۶)	

"اذہبتم طیباتکم" کی دو توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ تم نے دنیا میں کوئی نیک کام کیے بھی تھے۔ تو ان کا بدلہ تمہیں دنیا ہی میں دے دیا گیا تھا۔ آج تمہارے لیے صرف عذاب ہی۔ دوسری توجیہ یہ کہ تمہارے پاس دنیا میں مال و دولت اور جاہ وعزت وغیرہ کچھ اچھی چیزیں تھیں۔ تو تم اُن سے دنیا میں ہی فائدہ اٹھا چکے۔ یہاں وہ چیزیں تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔

یہاں بھی قرآن مجید نے استکبار کو بغیر حق کہا ہے، بات بھی یہی ہے کہ انسان اپنی حقیقت اور حیثیت کو سمجھے تو اسے معلوم ہو جائے کہ تکبر کرنے کا اُسے کوئی حق حاصل نہیں،

عیب است بزرگ برکشیدن خود را　　　وز جملۂ خلق برگزیدن خود را

از مردمک دیدہ بباید آموخت　　　دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

(عبداللہ انصاری)

باوجود یقین کے انکار

قرآن مجید سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض بدنصیب لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کے دلوں پر پیغمبروں کی تعلیم کی اور آیات اللہ کی حقیقت وصداقت روشن ہو جاتی ہے اور ایک حد تک وہ اس کی طرف مائل بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے اُن کا تکبر انہیں ایمان لانے سے روک دیتا ہے اور اس لیے وہ مدت العمر کفر میں مبتلا رہتے ہیں۔

وَإِذَا رَأَوْكَ إِنْ يَتَّخِذُونَكَ	اور جب تجھے دیکھتے ہیں تو تجھ پر تمسخر کرتے ہیں اور
إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ	بس۔ (اور کہتے ہیں کہ) "کیا یہی ہے، جس کو خدا نے
اللَّهُ رَسُولًا۔ إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا	پیغمبر بنا کر بھیجا۔ نزدیک تھا کہ یہ ہم کو ہمارے

عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا	معبودوں سے ہٹا دیتا اگر ہم اُن پر اڑے نہ رہتے
عَلَيْهَا وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ	البتہ جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو انہیں
يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ	معلوم ہو جائے گا کہ کون رستے سے گمراہ
سَبِيْلًا۔ (۲۵-۴۱ و ۴۲)	ہوا۔

شروع میں خطاب ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ کفار جب آنحضرتؐ کو دیکھتے اور اُن کی باتیں سُنتے تو اُن پر تمسخر کرتے اور کہتے کہ دیکھو ہم پر خدا نے کس کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ کوئی شہر کا رئیس اور دولت مند شخص ہوتا تو بات تھی۔ اس شخص کی کیا حیثیت ہے کہ یہ ہمارا پیغمبر بنے۔ یہ ان بدبختوں کا تکبّر تھا۔ جو اُن سے یہ باتیں کہلواتا تھا۔

دوسری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا ان لوگوں پر اثر بھی ہو جاتا تھا اور وہ دل میں توحید کے قایل بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن اُن کا تکبّر انہیں ایمان لانے سے روکتا تھا، اور اس لیے وہ اپنے جھوٹے معبودوں کی پرستش محض ضد کی وجہ سے نہیں چھوڑتے تھے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً	پس جب آئیں اُن کے پاس ہماری آنکھیں
قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔	کھول دینے والی نشانیاں تو انہوں نے کہا کہ یہ
وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ	جادو ہے ظاہر۔ اور انکار کیا ان نشانیوں کا
اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ	ظلم اور تکبّر کی وجہ سے۔ حالانکہ اِن کے دلوں کو
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ	(ان نشانیوں کی صداقت کا) یقین ہو گیا تھا۔
الْمُفْسِدِيْنَ۔ (۲۷-۱۳ و ۱۴)	پس دیکھ کہ مفسدین کا کیا انجام ہوا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چند نشانیاں (یعنی معجزات) دے کر فرعون اور اُس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اور آنحضرتؐ نے ان لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائیں، تو ان کے دلوں کو ان نشانیوں کی صداقت کا یقین آ گیا۔ لیکن تکبّر کی وجہ سے انہوں نے ان معجزات کو جادو کہہ کر

ان کا انکار کر دیا۔

یہ شقاوت کی بدترین مثال تھی۔ آج اگر ہم بھی ٹھنڈے دل سے سوچیں تو معلوم ہو جائیگا کہ بارہا بارہم نے کئی ایسی نئی باتیں سُنیں جن کی صداقت کا ہم کو یقین ہو گیا لیکن ہم نے محض ضد اور تکبّر کی وجہ سے انہیں رد کر دیا۔

قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک متکبّر لوگ انبیا علیہم السلام کی تعلیم و تبلیغ سے اور آسمانی کتابوں سے بدیں وجہ مستفیض نہ ہو سکے کہ وہ ہمیشہ پیغمبروں کی تحقیر کرتے رہے اور استکبار و استہزا سے پیش آتے رہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ	(نوح نے) کہا اے میرے پروردگار میں نے
لَیْلًا وَّ نَهَارًا۔ فَلَمْ یَزِدْهُمْ	بلایا اپنی قوم کو رات اور دن۔ لیکن میرے پکارنے
دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا۔ وَ اِنِّیْ	سے وہ اور زیادہ بھاگے اور میں نے جب کبھی
كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ	انہیں پکارا تاکہ تو انہیں بخشے، تو انہوں نے اپنی
جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ	انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑے
وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا	اوڑھ لیے اور ضد پر قائم رہے اور تکبّر کیا بڑا تکبّر
وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (۷۱: ۵-۷)	

کپڑے اوڑھ لینے سے مراد یہ تھی کہ اِس بات کا ہم پر اثر نہ ہو۔ ایک آدمی بات کرے اور دوسرا کانوں میں اُنگلیاں ڈال لے اور کپڑے اپنے ارد گرد لپیٹ لے، تو یہ بھی بات کرنے والے کی تحقیر اور اپنے تکبّر کا اظہار ہے اور تمسخر کرنا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ضد پر قائم رہنا یعنی کفر پر اصرار کرنا بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں پر پیغمبر کی تعلیم کا اثر ہو گیا تھا۔ لیکن محض ضد اور تکبّر کی وجہ سے وہ ایمان نہ لائے

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ	اور انہوں نے اللہ کی قسم کھائی۔ اتنی سخت قسم،
لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ لَّیَكُوْنُنَّ	کہ اگر آئے اُن کے پاس ڈرانے والا۔ تو وہ

اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ	ہر امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے اور
فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ	جب آیا اُن کے پاس ڈرانے والا، تو اُلٹی اُن کی
اِلَّا نُفُورًا۔ اِسْتِكْبَارًا فِي	بیزاری زیادہ ہوئی۔ زمین میں تکبر کرنے اور بُری
الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۔ (فاطر ۵)	تجویزیں کرنے کی وجہ سے۔

دنیا ہمیشہ اس انتظار میں رہتی ہے کہ ع مردے از غیب بروں آید وکارے بکند۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی کوئی مردِ خدا پیدا ہوا۔ تو اہلِ دنیا نے اس کی تحقیر و تذلیل ہیں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ صدہا مردانِ خدا کو لوگوں نے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہونچائیں اور صدہا کو قتل کیا۔ اہلِ زمانہ کی یہ روش صرف پیغمبروں اور دوسرے مذہبی راہنماؤں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ مختلف علوم وفنون کے ہزارہا اُستادانِ کامل بھی اسی سلوک کا شکار ہوگئے۔ ایسے تمام واقعات کی ذمہ داری عموماً معاصرانہ حسد، تکبر اور بد اندیشی کے جذبات پر ہی رہی ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ	افسوس ہے بندوں پر۔ اُن کے پاس کبھی کوئی
رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ	رسول نہیں آیا کہ انہوں نے اس کے ساتھ
(۳۶ - ۳۰)	تمسخر نہ کیا ہو۔

انبیاء (علیہم السلام) پر استہزا

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام کے ساتھ لوگ استکبار واستہزا سے پیش آتے رہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ	تجھ سے پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی ٹھٹھا کیا گیا
قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا	ان میں سے ٹھٹھا کرنے والوں کو اُس چیز نے
مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ	گھیر لیا۔ جس کے ساتھ وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔
يَسْتَهْزِءُوْنَ (۶ - ۱۰)	

یہ خطاب ہے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ کفار ان سے بھی تمسخر کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ آں حضرتؐ کی تسلی کے لیے کہتا ہے کہ یہ سلوک صرف آپ سے نہیں کیا جا رہا

بلکہ آپ سے پہلے بھی تمام پیغمبروں کے ساتھ متکبّر لوگ یہی سلوک کرتے چلے آئے ہیں، اور مزید تسلّی کے لیے یہ بھی کہا کہ ان لوگوں کا انجام دردناک ہوا۔ اور جس چیز سے انہیں پیغمبر ڈراتے تھے اور جس چیز سے وہ تمسخر کیا کرتے تھے آخرکار وہی چیز ان کو پیش آئی۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۔ (۴۰۔۸۳)

اور جب آئے اُن کے پاس اُن کے پیغمبر روشن دلیلیں لے کر تو خوش ہوئے وہ اُس علم پر جو اُن کے پاس تھا۔ اور گھیر لیا اُن کو اُس چیز نے جس کے ساتھ وہ ٹھٹھے کرتے تھے۔

یہ مثال ہے اپنے علم اور اپنی عقل پر تکبر کرنے اور تکبّر کی وجہ سے ہر نئی چیز پر استہزا کرنے کی۔ نوعِ انسانی آج تک اِس لعنت میں مبتلا ہے۔ ہر آدمی اپنے علم اور اپنی عقل کو کامل سمجھتا ہے اور یہ گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اور آدمی اس سے عالم تر یا عاقل تر ثابت ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کوئی ایسی نئی چیز سُن لیتے ہیں جو ہمارے علم یا ہماری عقل کے مسلّمات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تو ہم بغیر تامّل و تدبّر کے اس چیز پر قہقہہ لگا کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ علما کا حسد اور تکبّر علم کی ترقی کے راستے میں سب سے زیادہ خطرناک رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۔ (۴۳۔۶ و ۷)

اور کتنے پیغمبر بھیجے ہم نے پہلی قوموں میں۔ اور جب بھی کوئی پیغمبر اُن کے پاس آتا تھا۔ وہ اُس سے ٹھٹھا کرتے تھے۔

اِن آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ متکبّرین نے ہر نبی کا استقبال استکبار و استہزا سے کیا۔ ظالم انسان خدا کے مقابلے میں بھی تکبّر کرتا ہے۔ پیغمبر اس کے تکبر سے کس طرح بچتے۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۔ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا

پھر بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور ظاہر معجزوں کے ساتھ۔ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف۔ پس

وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ	انہوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔ انہوں
فَقَالُوْا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ	نے کہا کیا ہم ایمان لائیں اپنی طرح کے دو آدمیوں
مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ	پر۔ حالانکہ ان کی قوم کے لوگ ہماری بندگی کرتے
(۲۳- ۴۵ تا ۴۷)	ہیں۔

ان آیات سے چند در چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھائی فرعونیوں کے پاس گئے تو آیاتِ الٰہی اور سلطانِ مبین کے ساتھ گئے۔ ان نشانیوں اور معجزات کو دیکھ کر کوئی آدمی اُن کا منکر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک آیت سے جو پہلے اسی مضمون میں لکھی جا چکی ہے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی بھی اِن آیات اور معجزات کے دل سے منکر نہ تھے۔

(۲) فرعونیوں کا انکار محض تکبر کی وجہ سے تھا انہوں نے کہا کہ موسیٰ اور ہارون ہماری طرح کے دو آدمی ہیں اور آدمی بھی اُس قوم کے جو ہماری رعایا ہیں۔ ہم کیوں ان کو خدا کا پیغمبر مان کر ان پر ایمان لے آئیں۔

تو دلِ خود را دلے پنداشتی
جستجوئے اہلِ دل بگذاشتی　　رومی

انسان کی یہ بڑی خطرناک کمزوری ہے کہ وہ ہر کسی کو اپنے برابر بلکہ اپنے کم تر سمجھتا ہے اور اسی لیے وہ ہزارہا فیوض و برکات سے محروم رہتا ہے۔

(۳) تکبر کرنا سرکش لوگوں کا کام ہے۔

(۴) وقومهما لنا عابدون۔ یہ تو ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم یعنی بنی اسرائیل فرعونیوں کی رعایا تھے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ فرعون یا فرعونیوں کی "عبادت" نہیں کرتے تھے یعنی اُن کے "عابد" نہ تھے۔ باوجود اس کے کہا گیا کہ قومهما لنا عابدون۔

اس سے لفظ عبادت کے معنوں پر روشنی پڑتی ہے اور ہماری حالت پر بھی۔ کیا

انگریز ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ " لنا عابدون" پھر ہماری " ایاک نعبد" اور " ایاک نستعین" کی حقیقت اور صداقت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

چناں دین و دنیا بہم دیگر ند | تو گوئی کہ در زیر یک چادر اند

(فردوسی)

قوت پر تکبر

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۴۱-۱۵)

پس جو تھے عاد، تکبر کیا انہوں نے زمین میں بغیر حق کے۔ اور کہا کہ کون ہم سے قوت میں زیادہ ہے۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا جس نے انہیں پیدا کیا ان سے قوت میں زیادہ ہے اور وہ ہماری آیات سے انکار کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ قوم عاد کے لوگ بڑے تنآور اور طاقت ور ہوتے تھے، انہوں نے اپنی جسمانی قوت پر تکبر کیا اور اس وجہ سے وہ آیات الٰہی سے کفر و جحود کے مرتکب ہوئے۔

قرآن مجید نے جابجا تکبر کو بغیرِ حق کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو گو وہ اپنی صفات میں کتنا ہی کامل ہو، تکبر کرنے کا حق حاصل نہیں، قرآن کریم نے جابجا آفرینشِ آدم اور تخلیقِ بنی آدم کی تفصیلات اور مراتب کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے تاکہ انسان اپنی حقیقت اور حیثیت پر غور کرے اور تکبر کرنے کی جرأت نہ کرے، مگر آدمی ہے کہ کبھی اپنی ماہیت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا اور بات بات پر اتراتا رہتا ہے۔

آیاتِ الٰہی سے تکبر اور استہزاء

ہمارے اندر اور ہمارے باہر چاروں طرف ہزاروں لاکھوں آیاتِ الٰہی ہر وقت موجود رہتی ہیں، ہم میں سے اکثر تو ان آیات سے اعراض کرتے ہیں لیکن بعض شقاوت زدہ انسان بوجہ تکبر کے استہزاء کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان آیات پر ہنستے اور ٹھٹھے کرتے ہیں۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۔ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئًا اِتَّخَذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (۴۵۔ ۷ تا ۹)

افسوس ہے ہر جھوٹ باندھنے والے گنہگار پر۔ سنتا ہے اللہ کی آیات جو پڑھی جاتی ہیں اس پر۔ پھر اصرار کرتا ہے (کفر پر) تکبّر کرتے ہوئے۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں، پس اس کو دردناک عذاب کی خبر دے اور جب ہماری آیات سے کچھ معلوم کرلیتا ہے تو اُس پر ٹھٹھا کرتا ہے، ایسے لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

باوجود آیات اللہ کے سُننے اور دیکھنے کے بعض آدمی محض تکبّر کی وجہ سے کفر پر اڑے رہتے ہیں۔ تکبر یہ کہ اِن آیات کا سُنانے والا ہماری ہی طرح کا آدمی ہے بلکہ ہم سے بھی کم حیثیت ہے۔ ہم اس کی بات کیوں مانیں، فی الواقعہ ایسے لوگ ہی دردناک اور رُسواکن عذاب کے مستوجب ہیں تقلید اور اعراض کی وجہ سے گمراہ ہونے والے لوگوں کو اتنا سخت عذاب نہ ہوگا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۴۵۔ ۳۰ و ۳۱)

پس جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انہیں ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا یہ کامیابی ہے ظاہر۔ اور وہ لوگ جو کافر ہوئے۔ (انہیں کہا جائے گا کہ) کیا تم پر میری آیات نہیں پڑھی جاتی تھیں۔ پھر تم نے تکبّر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔

یہ قیامت کے دن کا ذکر ہے۔ دوزخ میں داخل ہونے والے کافروں سے کہا جائے گا۔ کہ باوجود میری آیات سُننے کے تم لوگ اپنے تکبر کی وجہ سے مجرم بنے رہے، قرآنِ مجید کے ایسے تمام مقامات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دوزخ کی اکثریت مستکبرین کی ہوگی۔ تکبّر فی الواقعہ شیطانی کام ہے اور شیطان تکبّر کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رحمتِ خداوندی سے محروم ہوگیا۔ پس اگر انسان

آیات واحکامِ الٰہی کے مقابلے میں استکبار واستہزا کا مرتکب ہو تو اُسے بھی اپنا انجام معلوم ہونا چاہیے

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ — البتہ پھیر دوں گا میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو

یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ — جو تکبر کرتے ہیں زمین میں بغیر حق کے، اگر وہ سب

وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا — آیات بھی دیکھ لیں تو اس پر ایمان نہ لائیں گے

بِھَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ — اور اگر دیکھیں راہ بھلائی کی تو اس راہ کو اختیار نہ

لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا — کریں گے اور اگر دیکھیں راہ گمراہی کی تو اس راہ پر

سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا — چل پڑیں گے۔ یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ — ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل

کَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ۔ (۷-۱۴۶) — رہے

قرآنِ مجید کی اِس آیت میں نفسیاتِ انسانی کا ایک عجیب نکتہ بیان ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بدنصیب آدمی ایسے ہوتے ہیں جن پر کسی اچھی بات کا اثر نہیں ہوتا، بُری بات کو دور سے ہی دیکھ کر اسے قبول کر لیتے ہیں۔ نیکی کی طرف اُن کی طبیعت کبھی مایل نہیں ہوتی لیکن بدی کی طرف بے تحاشا چلے جاتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی سرشت میں ہی نیکی کی طرف سے نفرت اور بدی کی طرف رغبت ودیعت کی گئی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ نامُراد لوگ اپنی اِس روش پر مجبورِ محض ہیں اور اسی روش پر یہ پیدا کیے گئے ہیں گویا ایک گونہ انہیں اپنے اعمال و افعال کا ذمہ وار ہی نہیں سمجھا جاتا۔

سنسکرت کا ایک مقولہ ہے "پنگہ شمارگ چارسے۔ کپتھ وِہارسے تو جنگھالہ" یعنی بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں راہِ راست پر چلنا پڑے تو لنگڑے ہو جاتے ہیں اور غلط راستہ ہو تو اُن کی ٹانگیں لمبی ہو جاتی ہیں۔ یعنی بہت تیز چلنے لگ جاتے ہیں۔

آیتِ بالا میں انہی لوگوں کا ذکر ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ تمام تر آیاتِ الٰہی کو بھی دیکھ لیں تو بھی ایمان نہ لائیں گے۔ اگر انہیں سیدھے راستے پر چلنا پڑے تو چلنے سے انکار کر دیتے ہیں

لیکن اگر گمراہی کا راستہ دیکھ پائیں، تو فوراً اس پر چل پڑتے ہیں۔

اگرچہ شروع آیت میں کہا گیا ہے کہ "میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا" یعنی میں ان لوگوں میں یہ توفیق ہی نہ چھوڑوں گا کہ وہ میری نشانیوں سے فائدہ اُٹھائیں اور صحیح راستے پر چلیں۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان لوگوں کی گمراہی کا باعث خدا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی گمراہی کا اصلی باعث بڑی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے وہ باعث یہ ہے کہ

(۱) یہ لوگ آیاتِ الٰہی سے غفلت کرتے ہیں یعنی اعراض کرتے ہیں، اُن کو دیکھتے ہیں اور اُن پر توجہ نہیں کرتے۔ اور بعض صورتوں میں

(۲) بغیرحق کے تکبّر کرتے ہیں اور اس تکبّر کی وجہ سے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

(۳) اعراض اور تکبّر اُن کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور اس طرح آیاتِ الٰہی سے فائدہ اٹھانے کی طاقت اور توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ

(۴) یہ لوگ ہمیشہ غلط رستے پر چلتے رہتے ہیں۔ اور صراط المستقیم کو کبھی اختیار نہیں کرتے۔

اسباب و نتائج کا یہ تسلسل ایک قانونِ الٰہی ہے۔ چونکہ یہ نتائج قانونِ الٰہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اس لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نتائج خدا نے پیدا کیے ورنہ حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔

یہاں بھی آپ نے دیکھا کہ تکبّر کو بغیرحق کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ایسا ہی آیا ہے۔ اس مضمون میں اس کی کئی مثالیں آپ پڑھ چکے ہیں۔ تکبّر کے ساتھ بغیرحق کے تکرار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ، تکبّر کسی صورت میں جائز نہیں۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا	اور جب پڑھی جاتی ہیں اس پر ہماری آیات، تو وہ تکبّر کرتے ہوئے پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ گویا کہ اس نے

كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ	کچھ سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کانوں میں بوجھ
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ	ہے۔ پس خوش خبری دے اس کو دردناک
(۳۱ - ۷)	عذاب کی۔

مجادلہ بغیر علم | ایک اور مقام پر ہے

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ	جو لوگ جھگڑا کرتے ہیں اللہ کی آیات میں بغیر
اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِنْ	کسی ایسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو۔
فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ	سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان کے دل میں
بِبَالِغِيهِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ	تکبر ہے اور وہ اس تک پہونچنے والے نہیں
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ	پس خدا کی پناہ لے۔ وہ سننے والا اور دیکھنے
(۴۰ - ۵۶)	والا ہے۔

یہ آیت اُن لوگوں کے متعلق ہے جو بغیر علم اور دلیل کے آیات اللہ کے متعلق بحثیں کرتے ہیں۔ اور اُن کو جھٹلاتے ہیں۔ اُن کے اس طرزِ عمل کی وجہ اُن کا یہ تکبر ہے کہ اِن آیات کا سُنانے والا ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔ ہم اس کی پیروی کیوں کریں۔ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ ان کا یہ تکبر بے وجہ ہے۔ وہ کبھی آیات کے سُنانے والے (یعنی پیغمبر) کے مرتبے تک نہیں پہونچ سکتے۔

ہم بسا اوقات کئی باتوں کو جو ہم سُنتے ہیں یا پڑھتے ہیں۔ محض اس لیے رد کر دیتے ہیں کہ کہنے والا یا لکھنے والا ہم سے بڑا آدمی نہیں۔ یہ تکبر ہماری علمی ترقی کے راستے میں ہمیشہ سدِّ راہ بنا رہا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ	اور لوگوں میں کوئی آدمی ایسا ہوتا ہے جو اللہ
فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا	کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے بغیر علم کے بغیر
هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ	ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے موثر

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۲۲ - ۸ و ۹) لیتا ہے اپنے شانے کو تاکہ گمراہ کرے (لوگوں کو) خدا کی راہ سے

شانہ موڑ لینا تکبر کی نشانی ہے۔ کئی آدمی کوئی بات سُنتے ہیں تو مُنہ بنا کر شانہ موڑ لیتے ہیں اس سے بات کی اور بات کہنے والے کی تحقیر مراد ہوتی ہے۔

بعض آدمی خدا کی ذات میں بحث کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ ان کے پاس علم ہوتا ہے۔ نہ ہدایت نہ دلیل اور نہ کوئی کتابی سند۔ یہ لوگ بحث میں فریقِ ثانی کی اور اُس کی بات کی تحقیر کرتے ہیں اور بس۔ یہ تکبر نبی، ہادی اور مصلح کے مقابلے میں کیا جاتا ہے۔

توحید کا انکار بربناء استکبار مشرکین بُت پرستی محض اس لیے نہ چھوڑ سکے کہ انہوں نے پیغمبروں اور ہادیوں کی تحقیر کی یہ اُن کے تکبر کا نتیجہ تھا۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ	تحقیق ہم اسی طرح کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ
اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ	جب انہیں کہا جاتا تھا کہ سوائے اللہ کے اور
اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۔ وَيَقُوْلُوْنَ	کوئی معبود نہیں۔ تو وہ تکبر کرتے تھے اور کہتے تھے
اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ	کہ کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں
مَّجْنُوْنٍ ۔ (۳۷ - ۳۴ تا ۳۶)	کو چھوڑ دیں۔

نبی کی تحقیر کی اور اُسے شاعر اور مجنون کہا۔ یہ ان کا تکبر تھا۔ اگر وہ متکبر نہ ہوتے تو نبی کی بات پر غور کرتے۔ اور ایمان لے آتے۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ تمام ہادی، مجدد اور مصلح بھی اسی سلوک کا شکار ہوتے رہے۔ علمی دنیا میں دیکھیے مختلف علوم و فنون کے کتنے محقق اُن معارف وحقایق کے لیے جنہیں دنیا آج سچ مانتی ہے۔ متکبر انسان کے ہاتھوں اذیتیں اٹھا اٹھا کر مرے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ	معبود تمہارا، معبود ہے اکیلا۔ پس جو لوگ آخرت
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ	پر ایمان نہیں لاتے اُن کے دل منکر ہیں۔
مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۔	اور وہ تکبر کرنے والے ہیں۔ یقیناً اللہ جانتا ہے

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا	جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں. تحقیق اللہ
يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ	دوست نہیں رکھتا تکبر کرنے والوں کو. اور جب
الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ	انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ کیا ہے جو تمہارے
مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ	پروردگار نے اتارا تو کہتے ہیں کہ یہ کہانیاں
الْاَوَّلِيْنَ ۔ (۱۶-۲۲ تا ۲۴)	ہیں اگلے لوگوں کی۔

جو لوگ توحید کو اور آخرت کو نہیں مانتے اُن کے دل اس لیے منکر ہیں کہ وہ متکبر ہیں اسی لیے اللہ مستکبرین کو پسند نہیں کرتا۔ یہ لوگ تکبر کی وجہ سے انبیا علیہم السلام کو شاعر اور مجنون اور ساحر وغیرہ کے لقب دیتے ہیں۔ اور تکبر ہی کی وجہ سے خدا کی کتاب کو اساطیر الاولین کہہ کر پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

استکبار و استہزا باعثِ سلبِ قویٰ

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے مستکبرین کے قوائے فکریہ و عقلیہ تکبر پر اصرار کرنے کی وجہ سے سلب ہو جاتے ہیں اور اسی لیے اپنے علم اور عقل سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ	اور قدرت دی ہم نے ان کو اس چیز میں جس میں
فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا	تمہیں قدرت نہ دی۔ اور دیے ہم نے انہیں کان
وَّاَفْـِٕدَةً فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ	اور آنکھیں اور دل (دماغ) لیکن ان کے کانوں
وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ	آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا کیونکہ
مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ	وہ جھگڑتے تھے آیات اللہ میں اور گھیر لیا انہیں
اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ	اس چیز نے جس کے ساتھ وہ تمسخر کرتے تھے۔
يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔ (۴۶-۲۶)	

یہ قوم عاد کا ذکر ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے تم سے زیادہ دولت و ثروت اور طاقت عطا کی تھی، انہیں کان دیے آنکھیں دیں اور عقل دی۔ لیکن ان لوگوں کو نہ ان کے کانوں نے فائدہ دیا۔

نہ آنکھوں نے اور نہ قوائے عقلی وفکری نے۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کے مقابلے میں اپنی دولت وثروت کی بنا پر تکبر کیا اور جن چیزوں سے وہ انہیں ڈرلتے تھے اُن پر تمسخر کیا اور آیات اللہ پر غور کرنے کی بجائے انہوں نے ان سے انکار کیا اور اُن کے متعلق جھگڑتے رہے لیکن آخر کار انہیں عذابِ الٰہی نے آگھیرا۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ	کیا نہیں سیر کی انہوں نے زمین میں، تاکہ دیکھیں
فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ	کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ وہ ان سے
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْآ اَشَدَّ	قوت میں زیادہ تھے۔ اُنہوں نے زمین کو پھاڑا
مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَ	اور اُسے آباد کیا۔ زیادہ اُس سے جتنا انہوں نے
عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ	آباد کیا۔ اور آئے اُن کے پاس پیغمبر نشانیاں لے
جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	کر۔ یہ بات نہ تھی کہ اللہ اُن پر ظلم کرے بلکہ وہ اپنی
فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ	جانوں پر خود ظلم کرتے تھے۔ پھر بُرا کرنے والوں کا
كَانُوْآ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔	انجام بُرا ہوا۔ وجہ یہ کہ وہ آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے
ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا	تھے اور اُن کے ساتھ ٹھٹھا کرتے تھے۔
السُّوْآٰى اَنْ كَذَّبُوْا	
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا	
يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔ (۳۰ - ۹ و ۱۰)	

ان آیات میں چند در چند نکات بیان ہوئے جو قابلِ غور ہیں۔

(۱) اولم یسیروا۔ دنیا کی سیر ضروری ہے۔ کیونکہ تکمیلِ ایمان کے لیے اور وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے جو تعلیم سیر سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی اُستاد سے نہیں مل سکتی لیکن آنکھیں بند کرکے سیر کرنا بے سُود ہے۔

(۲) کانوا اشد منہم۔ گزشتہ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہے۔ جو

از دیاد ایمان کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

(۳) فماکان۔ یہ اصل اصول ہے کہ انسان کے عقاید و اعمال کی ذمہ واری تمام تر خود اُس پر ہے۔ خدا کسی آدمی کو نہ بالجبر مومن بناتا ہے اور نہ کافر نہ اچھا بناتا ہے اور نہ بُرا۔ اس لیے کہا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ بندے اپنی جان پر خود ظلم کرتے ہیں، جیسا کہ آپ پڑھ چکے۔ اپنی جان پر ظلم کرنے کے یہی تین ذریعے ہیں۔ پہلا تقلیدِ آباو اکابر وغیرہ۔ دوسرا اعراض، اور تیسرا استکبار و استہزاء۔

(۴) اِن لوگوں کے پاس پیغمبر بھی آئے اور آیاتِ بیّنات کے ساتھ آئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ کافر رہے اور بُرے کام کرتے رہے۔ وجہ یہی کہ انہوں نے تکبر کی وجہ سے آیات اللہ کی تکذیب کی اور ان کی ہنسی اڑاتے رہے۔ تکبر پر اصرار کرتے کرتے اُن کی قوائی فکریہ جن کے ذریعے وہ آیات اللہ سے فائدہ اٹھا سکتے تھے بالکل فنا ہو گئیں۔

معجزہ طلبی تکبر ہے | کفار عموماً پیغمبروں سے طرح طرح کے معجزے طلب کرتے رہے۔ آیاتِ ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ طلبی بھی تکبر کی وجہ سے تھی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ	اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی ایسے پیغمبر نہیں بھیجے
الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ	جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے
الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ	نہ ہوں اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کیلئے
وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً	آزمایش بنایا کہ کیا تم صبر کرتے ہو اور تیرا رب
اَتَصْبِرُوْنَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا	دیکھنے والا ہے۔ جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں
وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا	رکھتے تھے انہوں نے کہا کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ
لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ	اتارے گئے یا ہم دیکھ لیں اپنے رب کو۔ تحقیق
نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ	لوگوں نے اپنے دلوں میں تکبر کیا اور سرکشی کی بڑی
وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (۲۵-۲۰-۲۱)	سرکشی

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ شخص ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ایسا آدمی خدا کا رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم کیوں اس کی پیروی کریں اور کیوں اس کی باتوں پر یقین کریں۔ یہ ان لوگوں کا تکبر تھا، کہ اپنے آپ کو پیغمبر کا ہم پایہ خیال کیا۔ یہ پیغمبر کے مقابلے میں تکبر تھا۔ ان لوگوں نے خدا کے مقابلے میں بھی تکبر کیا اور اپنی پسند کی نشانیوں کا خدا سے مطالبہ کیا۔ کہ یا خود خدا ہمارے سامنے آئے یا کم از کم اپنے فرشتے ہمارے پاس بھیجے۔ کیونکہ ہم اپنی طرح کے ایک آدمی پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کی ان باتوں کو استکبار کہا اور بدترین قسم کی سرکشی۔ اگر یہ لوگ متکبر نہ ہوتے اور پیغمبر کی باتوں پر غور اور تدبر کرتے تو ضرور ایمان لے آتے۔ کسی آدمی کی بات پر محض اس لیے غور نہ کرنا کہ یہ بھی ہماری طرح کا آدمی ہے، ہم سے طاقت میں زیادہ نہیں، ہم سے علم میں زیادہ نہیں۔ ہم سے دولت میں زیادہ نہیں۔ یقیناً تکبر ہے۔ اسی تکبر سے بے شمار آدمی گمراہ ہوئے اور بے شمار آدمی اپنے علم میں اضافہ کرنے سے محروم رہے۔

تکبر باعثِ ازدیادِ گناہ

بعض بدبخت آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر تکبر کی وجہ سے نصیحت کا الٹا اثر ہوتا ہے صرف یہ نہیں کہ وہ تکبر کی وجہ سے نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہوتے بلکہ جس چیز سے انہیں ناصح منع کرتا ہے اس کا اور زیادہ ارتکاب کرتے ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ	اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ ڈر اللہ سے۔ تو
أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ	اس کو عزت گناہ پر لگا دیتی ہے۔ پس کافی ہے
فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ	اس کے لیے دوزخ۔ اور یہ البتہ برا بچھونا
الْمِهَادُ ۔ (۲-۲۰۶)	ہے۔

عزت سے مراد ہے اپنی عزت پر تکبر۔ کسی کے منع کرنے پر جو ضد چڑھ جاتی ہے اور آدمی کہتا ہے کہ یہ کون ہے مجھے منع کرنے والا۔ اگر یہ نہ کہتا تو شاید میں یہ کام چھوڑ بھی دیتا۔ اب اس کو دکھانے

کے سینے میں پہلے سے بھی زیادہ یہ کام کر دں گا۔ یہ ہے عزت کا موجب اثم بن جانا۔

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے میں (حسبِ استعداد) جہاں تک فائدہ اٹھاسکا۔ کفرو جحود کے یہی تین اسباب نظر آئے۔ یعنی

(۱) تقلیدِ آباد اکابر وغیرہ۔

(۲) اعراض۔

(۳) اِستکبار و استہزا۔

ایبٹ آباد ۱۲ پہلی ۴۷ میر ولی اللہ

بچوں کی تعلیم و تربیت
اسلامی تعلیمات اور نفسیات کی روشنی میں

سعید احمد

(۲)

ایک عام مغالطہ | اس سلسلہ میں ایک عام مغالطہ یہ ہے کہ لوگ بچپن کے زمانہ کو بے فکری اور محض کھلنے پینے کے دن سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں بچہ کی ہر ادا، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اور اُس کا ہر فعل خواہ وہ قابلِ تحسین ہو یا لائقِ مذمت، نظر انداز کر دینے کے قابل ہے اور اس لائق ہے کہ اُس پر توجہ نہ کی جائے۔ اس خیال کی بنا پر ان لوگوں کو بچہ کے حرکات و سکنات کی نگرانی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر اور سنِ شعور کو پہونچ کر خود اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے لگے گا اور بچپن میں خواہ کیسا ہی رہا ہو بہر حال وہ بڑا ہو کر اپنی حالت کو خود ٹھیک کرے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ خیال ایک شدید مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نفسیات کی روشنی میں دماغ اور اُس کے تاثرات کی کیفیت کو سمجھ لیا جائے۔ عصرِ حاضر کے علوم و فنون میں علم النفس کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس علم کی وجہ سے انسانی دماغ اُس کے محرکات اور ہیجانات اور میل و عواطف اور زندگی پر اُن کے اثرات سے متعلق جو کامیاب اور ٹھوس تحقیقات ہوئی ہیں وہ زندگی کو کامیاب بنانے کی راہ میں بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں اور یورپ اُن سے بڑا فائدہ اٹھا بھی رہا ہے۔

علمائے نفسیات دماغ کو برف کی اُس چٹان سے تشبیہ دیتے ہیں جو کسی سمندر کی سطح پر تیر رہی ہو۔ اس چٹان کا صرف دسواں حصہ نظر آتا ہے۔ باقی نو حصّے پانی کے نیچے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ دور کشتی اور جہاز والے ان نو حصوں کو نظر انداز کر دیں گے تو اُن کا انجام بجز ہلاکت و بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

علاوہ بریں دماغ کو ایک اُس جزیرہ سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کسی سمندر کے وسط میں اُبھر آیا ہو۔ ہم اُس میں درخت دیکھتے ہیں، پہاڑ کی سبزہ پوش چوٹیاں دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ جزیرہ کی کل کائنات یہی ہے۔ حالانکہ بظاہر جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ اُس کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو سمندر کی موجوں کے دامن میں مستور ہے۔

جو مناظر ہم دیکھتے ہیں، جو آوازیں ہم سُنتے ہیں اور جو خوشبوئیں اور مختلف ذائقے جن کا ہم اپنی قوتِ شامہ اور قوتِ ذائقہ کے ذریعہ ادراک کرتے ہیں، اسی طرح وہ اندرونی اور باطنی کیفیات و احساسات جو کبھی ہم کو مسرور کر دیتے ہیں اور کبھی مغموم۔ وہ خیالات و جذبات جو ہماری شعوری طاقتوں میں ہیجان اور حرکت کا باعث ہوتے ہیں۔ ان سب کا تعلق ہمارے شعوری دماغ سے ہے جس کو ہر عاقل بالغ جانتا ہے۔ لیکن دماغ کے شعوری حصّہ کے علاوہ ایک بڑا حصّہ غیر شعوری بھی ہے جس کو ہر شخص نہیں جانتا۔ مگر اُس کے اکثر اعمال و افعال، اس کی پسند اور ناپسند اور اُس کے دوسرے امیال و عواطف اکثر و بیشتر اُس کے غیر شعوری دماغ کے تاثرات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ جدید علم النفس اس غیر شعوری دماغ پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ اس طرزِ فکر کے علمائے نفسیات میں ڈاکٹر فرائڈ (Sigmund Freud.) کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔

اس کے دو ہم عصر اڈلر (Adler.) اور ینگ (Jung) اگرچہ اعمالِ انسانی کے بنیادی محرک کے بارہ میں اُس سے شدید اختلاف رکھتے ہیں اور فرائڈ سے بالکل ہی الگ ایک نئے نظریے کے حامل ہیں۔ تاہم جہاں تک غیر شعوری دماغ کی اصل حقیقت اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کا تعلق ہے تینوں ایک ہیں اور اسی وجہ سے ان کو گہری نفسیات

والے (Depth Psycologists) کہا جاتا ہے۔

غیر شعوری دماغ کیا ہے؟

یہ غیر شعوری دماغ ہے کیا؟ مختصر لفظوں میں اس کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ نتیجہ ہوتا ہے ذاتی اور نسلی تجربات کا تفصیل یہ ہے کہ ہم کو اپنی زندگی میں مختلف اور متضاد حوادث اور واقعات سے سابقہ پڑتا ہے اور اس سابقہ کی وجہ سے ہمارے ذہن و دماغ پر مختلف قسم کی کیفیتیں اور صورتیں طاری ہوتی ہیں جن سے کبھی مسرت حاصل ہوتی ہے اور کبھی غم۔ کبھی خوف اور ڈر پیدا ہوتا ہے اور کبھی امید اور حوصلہ کبھی کسی چیز کو پسند کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے اور کبھی ہم دل میں اُس سے نفرت اور کبیدگی محسوس کرتے ہیں۔ جب یہ واقعہ گذر جاتا ہے تو عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ کے باعث جو کیفیت یا جو تاثر پیدا ہوا تھا وہ بھی گذر گیا اور ختم ہوگیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

روزمرہ کے مشاہدات اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ مختلف تجربات سے انسانی ذہن و دماغ پر جو کیفیات پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک کیفیت تو وہ ہے جس کا تعلق دماغ کے شعوری حصہ سے ہے۔ یعنی وہ شخص اُس کیفیت کا شعور رکھتا ہے۔ اسے اُس کا ادراک حاصل ہے اور وہ کیفیت اُس کی قوتِ حافظہ یا حسِ مشترک کے خزانہ میں پہونچ کر محفوظ ہوگئی ہے اور دوسری قسم کیفیت کی وہ ہے جس کا شعور خود صاحبِ کیفیت کو نہیں ہوتا وہ یہ سمجھتا ہے کہ واقعہ کی وجہ سے جو تاثر اُس پر پیدا ہوا تھا۔ واقعہ کے ساتھ وہ بھی ختم ہوگیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تاثر ختم نہیں ہوتا آخر لمحہ حیات تک باقی رہتا ہے۔ اور زندگی کے مختلف شئون و احوال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ایک دو نہیں بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

کچھ دن ہوئے میرے ایک فاضل دوست نے جو خود نفسیات کے فاضل اور ڈاکٹر ہیں اور جو گذشتہ جنگ میں مختلف مقاماتِ جنگ پر رہ آئے ہیں بتایا کہ جب کبھی انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں آگ لگ گئی ہے تو انہیں بڑا خوف محسوس ہوتا تھا، اس پر وہ خود حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ آتش زدگی سے بھی زیادہ ہولناک اور سنگین واقعات ہو جاتے تھے مگر انہیں کوئی تاثر نہیں

ہوتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ انہوں نے خود تحلیلِ نفسی (Psycoanalysis) کیا تو معلوم ہوا کہ بچپن میں ایک دفعہ اُن کے مکان کے پڑوس میں ایک سینما ہاؤس میں زبردست آگ لگ گئی تھی اور اس کی وجہ سے تمام گھر والوں کو سخت پریشانی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا

زمانۂ حال کے ایک فاضلِ نفسیات پروفیسر میتھو (A.V.Matthew) لکھتے ہیں "جو کچھ ہم نے کیا ہے یا جو کچھ زمانۂ ماضی میں ہم پر گذرا ہے ہم اُسے یاد نہیں رکھتے۔ لیکن بہرحال ہم جو کچھ بھی ہیں وہ نتیجہ ہے ہمارے تمام گذشتہ تجربات کا۔ بسا اوقات ہم اپنے پچھلے تجربات کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی انہیں ہم کو یاد بھی دلاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ ہم اُن کو یاد ہی نہیں کرتے بلکہ ہم پوری قوت سے اُن کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہیں پیش نہیں آیا۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ یہی وہ فراموش کردہ تجربات ہیں جنھوں نے ہم کو آج وہ بنایا ہے جو ہم نظر آتے ہیں اور یہی وہ بھلائے ہوئے تجربات ہیں جو ہمارے اپنے ذاتی غیر شعوری دماغ کی تشکیل کرتے ہیں"[1]

یہ بھلائے ہوئے تجربات علمائے نفسیات کی خاص اصطلاح میں دو قسم کے ہوتے ہیں جن میں سے ایک کو وہ (Repressed thoughts) کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو (Suppressed thoughts)۔ اردو میں ان دونوں کا ترجمہ دبائے ہوئے یا روکے ہوئے خیالات ہوگا۔ لیکن اصطلاحاً ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جن خیالات کو ہم خود بخود نظر انداز کر دیتے ہیں اور اُن کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتے وہ (Repressed thoughts) کہلاتے ہیں اور اس کے برعکس جن خیالات کو ہم بھلانے اور فراموش کر دینے کی کوشش کرتے ہیں اُن کو (Suppresed thoughts) کہا جاتا ہے۔ گویا پہلی قسم میں مکمل بے شعوری ہوتی ہے اور دوسری قسم میں بے شعوری کے ساتھ کچھ نہ کچھ شعور بھی ضرور ہوتا ہے۔

---

[1] The Chaild and his upbringing ch.I

یہ دبے ہوئے یا روکے ہوئے خیالات ہر انسان کے غیر شعوری ذہن کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں، سب کے سب اس قابل نہیں ہوتے کہ ایک صاحبِ شعور و فہم انسان اُن کا برملا اظہار کر سکے۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر خیالات و محسوسات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ تنہائی میں بھی اُن کا تصور کرکے شرما جاتا ہے۔ لیکن بہرحال یہ محسوسات و تجربات زندگی میں مختلف شکلوں اور صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ فرائڈ۔ اڈلر اور ینگ کے نزدیک ان کا سب سے زیادہ مظاہرہ خواب میں ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ان ہی کو اَضغاثُ اَحلام یعنی خواب ہائے پریشان کہا گیا ہے۔

تحلیلِ نفسی کا عمل کرنے والے اصحاب جب کسی مریض کے غیر شعوری ذہن کا پتہ چلانا چاہتے ہیں تو مریض کے خوابوں کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ خواب کے علاوہ بیداری کے عالم میں بھی ایک ماہر نفسیات کو غیر شعوری ذہن کے بہت کچھ مظاہر نظر آ سکتے ہیں۔

عقدۂ دماغی اس سلسلہ میں ایک لفظ (Complex) ہے جو عام طور پر کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں ہم اس کا ترجمہ دماغی اُلجھاؤ۔ یا کشمکشِ ذہنی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے مُراد واضح نہیں ہوتی۔ ایچ۔ سی۔ ملر نے اپنی مشہور کتاب نفسیاتِ جدید اور دین" (The New Psycology.) کے جس باب میں غیر شعوری اور دماغی ساخت پر بحث کی ہے۔ دماغی اُلجھن (Complex) کی تشریح ایک مثال کے ذریعہ اس طرح کی ہے کہ فرض کرو ایک خیال جس کو مثلاً ہم اکیس (x) کہہ سکتے ہیں کسی سبب سے دماغ کے شعوری حصہ کے لئے درد انگیز اور تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا خیال ہے کہ جب کبھی اس کا گذر ہمارے دماغ میں ہوتا ہے تو ہم کو کچھ نہ کچھ درد و کرب کا احساس ضرور ہوتا ہے اب یہ خیال دوسرے اسی قسم کے خیالات کی طرح، چند اور تخیلات کے مجموعہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ خیال درد انگیز ہے اس لیے ہم اس کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس خیال کے ساتھ جو دوسرے خیالات مربوط اور وابستہ تھے وہ بھی کچلے جاتے ہیں اور اب

وہ دماغ کے شعوری حصہ سے منتقل ہو کر غیر شعوری حصہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس طرح خیالات کا یہ پورا مجموعہ ایک عام ناخوش گوار ربط و وابستگی کا مرقع بن کر رہ جاتا ہے۔ پس جب تک ان خیالات کا تعلق دماغ کے شعوری حصہ سے رہتا ہے ان کو خیالات (Ideas یا Sentiments کہتے ہیں اور جب یہ ایک عمل ذہنی کے ماتحت شعوری حصہ سے منتقل ہو کر غیر شعوری حصہ میں آتے ہیں تو اب خیالات کا یہ مجموعہ Complex کہلاتا ہے۔ جس کو "دماغی وہم" یا "ذہنی اُلجھن" سے آپ اردو میں تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ "دماغی وہم" بظاہر بہت معمولی سی اور ناقابلِ اعتنا شے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اعمال و عواطف کی تشکیل و تعمیر میں اور عادات و اطوار کے ہموار و استوار کرنے میں اس کا بہت بڑا دخل ہے۔

آپ نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ کسی خاص رنگ یا شکل و صورت سے خواہ وہ بذاتِ خود کتنی ہی بے ضرر اور معمولی ہو۔ غیر معمولی طور پر خوف کھاتے یا نفرت کرتے ہونگے آپ منطقی اور عقلی دلائل کے ذریعہ لاکھ سمجھائیے کہ اس چیز سے ڈرنا یا نفرت کرنا نہایت نامعقول بات ہے۔ وہ خود بھی اقرار کریں گے کہ ہاں دلیل تو ہمارے پاس بھی نہیں۔ لیکن آخر میں کہیں گے یہی کہ "معلوم نہیں کیوں! اس رنگ یا اس چیز سے ڈر بہت ہی لگتا ہے یا ہمیں اس سے شدید نفرت ہے" یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ڈر یا نفرت کی وجہ معلوم نہیں ہے۔ لیکن ایک تحلیلِ نفسی کا ماہر دماغ کے غیر شعوری حصہ کا مطالعہ کرکے بتائے گا کہ یہ لوگ کس قسم کے وہم (Complex) کا شکار ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو ایک حقیر سی چیز سے خوف لگتا ہے یا وہ اس سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

یہ دماغی اُلجھاؤ عجیب و غریب چیز ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی کرشمہ سازیاں انتہائی حیرت انگیز ہیں۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶-۱۹۳۹) نے جب پہلے پہل غیر شعوری ذہن اور اس کی عجب کاریوں کا انکشاف و اعلان کیا تو عام دستور کے مطابق لوگوں نے اُس کا مذاق اڑایا اور اُس کے نظریہ کے

ساتھ تمسخر کیا۔ لیکن اُس نے ان لوگوں کی ذرہ پروانہ کی۔ چالیس سال تک برابر وہ اپنے تجربات ومشاہدات سے لوگوں کو آگاہ کرتا رہا۔ آخر کار جہاں تک فرائڈ کے بنیادی نظریہ کا تعلق ہے دنیا نے اُس کی صداقت کو تسلیم کرلیا۔ اور آج حال یہ ہے کہ جدید نفسیاتی مباحث کی ساری بنیاد ہی اُس پر قائم ہے[1]۔

کومپٹن مکنزی Compton Makenzie نے اپنی کتاب (Rich Relatives) میں جنسی رجحانات سے متعلق دماغی اُلجھاؤ کی بعض بڑی دلچسپ مثالیں نقل کی ہیں جن کو پڑھ کر ہمارے آج کل کے بعض نوجوان اگر یہ کہہ بیٹھیں کہ "ارے دل یہ تو تیری داستاں معلوم ہوتی ہے"۔ تو کچھ عجب نہیں۔ جب کوئی شخص پاگل ہو کر اول فول بکنا شروع کردیتا ہے یا خواب میں سوتے سوتے بڑبڑانے لگتا ہے یا تیز بخار کے عالم میں اسے ہذیان شروع ہوجاتا ہے تو اس وقت اُس کا غیر شعوری ذہن اپنے بند خزانہ کا منہ کھول دیتا ہے اور وہ ایسی اَن کہی اور "اَن بوجھی" باتوں کا اظہار کرجاتا ہے جن کو اگر آپ بعد میں اُسے یاد بھی دلائیں تو وہ ہرگز اُن کا اقبال واقرار نہیں کرے گا۔

تین سال کی بات ہے۔ میرا ایک عزیز کالج کی چھٹیوں میں شدید گرمی کے موسم میں دہلی آیا اور میرے گھر آکر مقیم ہوا۔ بدقسمتی سے چند روز بعد وہ پاگل ہوگیا۔ اُسے انگریزی بولنے کا بہت شوق تھا عالم جنون میں وہ گھنٹوں انگریزی میں بولتا رہتا تھا۔ اور اس طرح اُس نے اپنے بچپن سے لے کر نوجوانی تک کے ایسے ایسے رنگین ودلچسپ واقعات وتاثرات بیان کردیے کہ اگر میں چاہتا تو اُن کی مدد سے اُس کا ایک افسانۂ حیات مرتب کرسکتا تھا۔ بہت کچھ علاج معالجہ کے بعد وہ اچھا ہوگیا تو میں نے اُس کو زمانۂ جنون کی کہی ہوئی بعض باتیں یاد دلائیں۔ جن پر اُسے شرم تو بہت آئی۔ مگر وہ اُن کا اقرار نہ کرسکا اور مجھے یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ بھائی! آپ جانتے ہیں ایک

---

[1] Depth Sycology and Education by Prof: A.V. Matthew Page 5.

پاگل آدمی کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ہو سکتا ہے؟

میں یہ جانتا ہوں کہ اُس نے گفتار کرنے میں کسی تصنع سے کام نہیں لیا واقعی جو باتیں اُس کی زبان سے نکلیں وہ اُس کی قوتِ حافظہ میں موجود نہ تھیں مگر ساتھ ہی مجھکو اس کا یقین ہے کہ اُس نے جو کچھ کہا وہ ایک زمانہ سے خود اُس کے اپنے تجربات اور تاثرات تھے جن کو اُس کے دماغ کے غیر شعوری حصّہ نے عقل و ہوش کے پہرہ داروں کی آنکھیں بند دیکھ کر زبانِ جنون سے بیساختہ ادا کر دیا تھا۔

ماحول کے اثرات | یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ معلوم کرنا چاہیے کہ علمائے نفسیات کی تشریح کے مطابق یہ غیر شعوری ذہن ایک بڑی حد تک بچپن میں بلکہ پانچ سال کی عمر میں ہی تشکیل پا جاتا ہے[1]۔

ایک ننھا مُنا سا بچہ اس قابل نہیں ہوتا کہ زبان سے اپنے دل کی بات کہہ سکے۔ اُسے جب کوئی چیز مانگنی ہوتی ہے تو وہ ملتجیانہ نگاہوں سے ماں باپ کو دیکھنے لگتا ہے اور اگر ماں باپ کو اِس پر بھی توجہ نہیں ہوتی تو وہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ اسے کھانے پینے اور بول و براز کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ اس کارگاہِ ہست و بود کے عام رسم و رواج سے بالکل بیگانہ ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ یہاں سردی سے کیوں کر حفاظت کی جاتی ہے اور گرمی کی اذیت کو کس طرح دور کیا جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں اور رسوم و آداب سے مکمل طور پر بے گانہ اور اجنبی محض ہونے کے باوجود وہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اُس کے اثرات قبول کرنے کی اُس میں بڑی صلاحیت اور پوری استعداد ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ اپنے ماحول میں دیکھتا، سُنتا اور محسوس کرتا ہے اُس کے نقوش و تاثرات سب اُس کے دماغ کے غیر شعوری حصّہ کے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہوتے رہتے ہیں اور پھر یہ تاثرات اُس کے تمام اعضا اور قویٰ پر اثر انداز ہو کر اُس کی آئندہ عملی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ تیار کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بچہ بڑا ہو کر وہی

---

[1] Psycology and Principles Education. P. 91.

زبان بولتا ہے جو اُس کے گھر میں بولی جاتی ہے اور اسی لب ولہجہ سے بولتا ہے جس لب ولہجہ سے گھر کے لوگ بولتے ہیں۔ اُس کے معتقدات اُس کے طور وطریق، اُس کے کھانے پینے کے آداب سب وہی ہوتے ہیں، جن کو وہ اپنے ماحول میں دیکھتا اور محسوس کرتا رہا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ بچوں میں نقل کرنے کی عادت بہت ہوتی ہے۔ یہ عادت کیوں ہوتی ہے؟ محض اُس تاثر کی وجہ سے جو انہیں اپنے ماحول سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں حال ہی کا ایک واقعہ ذیل دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"گذشتہ موسم سرما میں صحرائے شام سے ایک انسانی بچہ پکڑا گیا جس کو اس اعتبار سے ہرن کا بچہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُس کی پرورش صحرا کے ہرنوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک عورت نے اُس کو اچھی طرح پہچان کر کہا کہ "یہ میرا بچہ ہے" اُس نے بیان کیا کہ "ایک مرتبہ میں دمشق اور بغداد کے درمیان صحرا کو اونٹ کے ذریعہ عبور کر رہی تھی کہ بچہ گم ہوگیا۔ میں نے اُس کی تلاش میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن ناکام رہی" بچہ آج کل ہسپتال میں مشہور معالجوں کے سپرد ہے وہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اُس کی بربریت ختم ہو اور وہ انسانوں میں رہ کر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھ جائے۔

ہرنوں میں پرورش پانے کی وجہ سے ایک انسانی بچہ کے امیال وعواطف کتنے بدل گئے ہیں؟ اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ اسی اطلاع میں مذکور ہے: "یہ بچہ اب بھی گھاس کھا کر خوش ہوتا اور ہرنوں کی ہی طرح حرکت کرتا ہے اور اُن ہی کی طرح بولتا بھی ہے۔ تاہم کچھ نہ ملنے پر بادلِ ناخواستہ کچا گوشت یا دوسری سبزیاں کھا لیتا ہے۔ کسی پکی ہوئی چیز پر منہ نہیں ڈالتا۔ کبھی کبھی آدمیوں کی طرح بولنے کی بھی کوشش کرتا ہے مگر زبان صحیح لب ولہجہ پیدا نہیں کرسکتی۔

گرفتاری کے بعد سے یہ بچہ زیادہ موٹا ہونے لگا ہے اور وزن بقدر ستر پونڈ بڑھ گیا ہے تین مرتبہ وہ ہسپتال سے نکل بھاگا اور بمشکل ہاتھ آیا۔ ایک بار دو موٹر گاڑیوں نے اُس کا تعاقب

گیا۔ اس کی رفتار تیس میل فی گھنٹہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی دوڑ سکتا ہے۔ بہرحال کوشش کی جارہی ہے کہ اس کو کسی طرح انسان بنالیا جائے۔
(آج کل۔ مورخہ یکم دسمبر ۴۶ء)

اس خبر سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ماحول بچہ کے بنانے یا بگاڑنے میں کتنا دخل رکھتا ہے۔
قدیم علمائے اخلاق میں ایک گروہ تھا، جو اخلاق کو ناقابلِ تغیر و تبدل بتاتا تھا۔ فلاسفۂ یونان میں جالینوس نے دو مختلف نظریوں کے درمیان اعتدال کی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی تو اتنا لکھ سکا کہ دنیا میں بعض لوگ بالطبع اہلِ خیر ہیں اور بعض بالطبع اہلِ شر اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں خیر و شر دونوں کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن فلسفۂ اخلاق کا طالب علم جانتا ہے کہ یہ مسلک نہایت کمزور ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ قدیم فلاسفۂ یونان جو ارسطاطالیس کی ہم نوائی کرتے تھے کہتے تھے کہ تعلیم و تادیب کے ذریعہ اشرار بھی اخیار ہوسکتے ہیں۔

جدید فلاسفۂ مغرب کا ایک گروہ جو نظریۂ کردار کا حامل ہے (Behaveouriot) وہ بھی اسی کا قائل ہے کہ کردار پیدا کیا جاتا ہے اور کسی سبب کا مسبب ہوتا ہے۔ وہ محض اتفاقی نہیں ہوتا[1]۔

اِس بنا پر ایک بچہ کی تعلیم و تربیت کے لیے سب سے مقدم یہ بات ہے کہ جس ماحول میں وہ پرورش پا رہا ہو اُسے درست رکھا جائے اور ہرگز یہ خیال نہ کیا جائے کہ اگر بچہ طبعاً شریر ہے تو ایک اچھا ماحول اُسے کیوں کر بہتر کرسکے گا۔ اس سلسلہ میں یہ لطیفہ دلچسپی سے سُنا جائے گا کہ نفسیات کی ایک کتاب (The Problem Child) کے مصنف (A. S. Neil) نے کتاب کو مکمل کرلینے کے بعد جب اُس کے پروف پڑھنے شروع کیے تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی کتاب میں بچوں کی مشکلات پر بحث کی ہے۔ لیکن مشکل

---
[1] Depth Psycology and Education ch. I

کوئی بچہ کی تو ہوتی ہی نہیں۔ جو کچھ بھی دشواری ہوتی ہے وہ ماں باپ کی ہوتی ہے کہ وہ اسے کس ماحول میں تربیت دیتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے غلط کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ "پانچ سال بعد" The Problem Parent کے نام سے اُس نے ایک اور کتاب تصنیف کی۔

خود قرآن مجید کی تصریحات و نصوص سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان میں نیک اور بد ہونے کی طبعی استعداد موجود ہوتی ہے اور اُس کا کیرکٹر یا کردار ماحول کے سانچہ میں ڈھلتا ہے۔ ارشاد ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس)	اللہ نے نفسِ انسانی میں فجور اور تقویٰ دونوں کا الہام کر دیا ہے۔

ماحول کی اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ انسان تو انسان غیر ذوی العقول پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت ذیل میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا (اعراف)	اور پاک زمین اپنے رب کے حکم سے سبزیاں اگاتی ہے اور خراب زمین میں نکمّی چیز کے علاوہ کچھ اور نہیں اُگتا۔

علاوہ بریں ایک صحیح حدیث سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے کہ بچہ کے بنانے یا بگاڑنے میں اُس کے ماحول کو کس قدر دخل ہوتا ہے۔ حدیث یہ ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من مولود إلا يولد على الفطرة فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو۔ پھر اُس کے ماں باپ اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی کرتے ہیں یا مجوسی۔

(المشکوٰۃ۔ باب الایمان بالقدر)

حدیث کے ان لفظوں کو پیشِ نظر رکھ کر اب ذرا مشہور عالمِ نفسیات ینگ کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ فرمائیے۔

"بچہ کی نفسیاتی زندگی کا بہت ہی تھوڑا حصہ آزاد ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے بہت کچھ براہِ راست والدین سے ہی حاصل شدہ ہوتی ہے۔"[1]

ایک حدیث میں ہے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ایک بچہ کے جنازہ پر تشریف لیجانے لگے تو حضرت عائشہؓ بولیں "اے رسول اللہ! یہ بچہ تو جنت کی چڑیا ہوگا کیوں کہ اس نے تو کوئی گناہ کیا ہی نہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" اور اس کے سوا کیا! اللہ نے جنت کے اہل پیدا کیے ہیں اور وہ اپنے آبا کے اصلاب سے ہی جنت کے اہل پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے دوزخ کے اہل پیدا کیے ہیں اور وہ صلبِ پدر سے ہی دوزخی پیدا ہوتے ہیں۔ مرٰاہ مسلم۔ مرقات شرح مشکوٰۃ میں اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی بچہ کے ایمان وکفر کے متعلق جزم ویقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ان دونوں میں وہ اپنے والدین کے ہی تابع ہوتا ہے۔

اہلِ علم بے خبر نہ ہونگے کہ یہ حدیث اور اسی مضمون کی بعض اور احادیث متکلمین ومحدثینِ اسلام کے درمیان ایک عظیم نزاع کا باعث ہوئی ہیں اور اس مسئلہ پر کہ ایک بچہ کافر اگر مر جائے تو وہ جنت میں جائے گا یا دوزخ میں ایک عرصہ تک معرکہ آرائی رہی ہے۔ حالانکہ بات بہت معمولی سی تھی۔ حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اگر کوئی بچہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا اور بلوغ سے پہلے ہی مر گیا تو وہ جنت میں جائے گا اور اس کے برخلاف کافر کا بچہ دوزخ میں بھیجا جائیگا۔ کیونکہ جنت اور دوزخ کا استحقاق احکام شرعیہ سے مکلّف ہونے کے بعد ہوتا ہے اور ایک بچہ جب ابھی مکلّف ہی نہیں ہے تو اُس کی نسبت استحقاقِ جنت وجہنم کا کوئی سوال ہی کیوں کر ہوسکتا ہے۔

---

[1] Analytical Psycology and Education Lecture II

اصل چیز یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس ارشادِ گرامی میں صرف اسی ایک حقیقت
کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ بچے کے مسلم یا کافر ہونے میں ایک بڑا دخل اس کا بھی ہے کہ اُس کے
ماں باپ کیسے ہیں۔ وہ جس قسم کے ماں باپ کی گود میں پرورش پائے گا آئندہ چل کر ویسا ہی
ہوگا۔ اس سے ہرگز کوئی بحث نہیں کہ اس وقت اُس کا حکم کیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ینگ نے بھی اپنے ایک لکچر میں اسی حقیقت کو اس طرح بیان
کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے "جس طرح ایک بچہ جب اپنی ماں کے رحم میں ہوتا ہے تو اُس وقت
وہ خود عملاً کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی ماں کے جسم کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے اور اُس کی حالت تمام تر ماں
کی حالت پر ہی موقوف ہوتی ہے۔ اسی طرح بچپن کے اوائل میں ایک بچہ کی نفسیاتی زندگی
(Psyche) بہت بڑی حد تک مادری نفسیاتی زندگی پر ہی موقوف ہوتی ہے اور پھر
جلد ہی چوں کہ اس فضا کے پیدا کرنے میں باپ بھی ماں کا شریک ہوتا ہے اس بنا پر بچہ کی نفسیاتی
زندگی ماں اور باپ دونوں کی نفسیاتی زندگی کا جز ہو جاتی ہے[۱]۔

غور کیجیے حدیث میں اور ینگ کے بیان میں صرف معنوی مشابہت ہی نہیں
طرزِ تعبیر بھی قریب قریب یکساں ہے۔ اسی وجہ سے ینگ کے ایک شارح نے ینگ
کے ان الفاظ کو الہامیانہ (Intuitive) اور شاعرانہ (Poetic)
کہا ہے[۲]۔

(باقی آئندہ)

---

[۱] Analytical Psycology and Education Lecture I
[۲] Depth Psycology and Education. P. 26.

حقائق الاسلام حصہ اول۔ از جناب مولوی حافظ محمد سرور صاحب کوہاٹی۔ تقطیع خورد ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ کتابت وطباعت متوسط۔ قیمت عہ پتہ دفتر جماعت اسلامیہ نزد محلہ جمعہ خاں شہر کوہاٹ۔ صوبۂ سرحد۔

لائق مصنف نے مسلمانوں کی عام زبوں حالی اور اُن کے عملی واخلاقی انحطاط سے متاثر ہوکر انہیں صحیح معنی میں مسلمان بنانے کی غرض سے چار حصوں میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہے جس کا پہلا حصہ ہمیں بغرض تبصرہ موصول ہوا ہے۔ اس کتاب کے تمام مباحث کا لبِّ لباب اور مدارِ بحث یہ امر ہے کہ اصل اسلام اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ کا نام ہے۔ اگر یہ چیز معدوم ہے تو خواہ کوئی شخص زبان سے اپنے آپ کو کیسا ہی مسلمان کہے وہ مسلمان نہیں ہو۔

جہاں تک اعمال واخلاق کی اہمیت وضرورت کا تعلق ہے کوئی مسلمان اُس سے انکار نہیں کر سکتا انبیائے کرام کی بعثت اور اُن کی تعلیم وارشاد کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ وہ لوگوں میں اتباع ہوی کے بجائے حکم خداوندی کے امتثال وتعمیل کا جذبہ پیدا کریں اور دراصل یہی امتثال وتعمیل اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ کا دوسرا نام ہو۔ لیکن اس میں غلو کرکے یہ کہنا مسلک صحیح کے خلاف ہو کہ "ایمان اور عمل ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ اس بنا پر اگر عمل ہے تو ایمان بھی ہے اور اگر عمل نہیں ہو تو ایمان بھی نہیں ہے" (ص ۱۴۱) مصنف نے ایک آدھ جگہ نہیں بلکہ بار بار اور بڑے زور کے ساتھ اپنے اس خیال کو دہرایا ہے کہ "قیامت میں جس چیز کو تولا جائے گا وہ کوئی اسلامی عقیدہ نہیں ہوگا بلکہ اعمال واخلاق ہوں گے"۔ (ص ۳۶) جیسا کہ اربابِ علم کو معلوم ہو یہ مسلک خوارج کا ہو کہ اُن کے نزدیک فقدانِ عمل سے فقدانِ ایمان لازم آتا ہے۔ احادیث سے قطع نظر قرآن مجید کی بہت سی آیات ہیں جن میں فقط ایمان

کا ذکر ہے اور عمل کا نہیں۔ اُن سے خوارج کے اس عقیدہ کی قطعی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ایمان اور عمل جس طرح لغۃً ایک نہیں ہیں شرعی اصطلاح کے مطابق بھی دونوں بعینہ ایک نہیں۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور عمل کا جوارح سے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ بغیر عمل کے ایمان بہت ہی مضمحل اور کمزور ہو جاتا ہے اور اس بنا پر بدعملی کے لیے قرآن میں جو وعیدیں مذکور ہیں وہ بھی قیامت میں اُس پر مرتب ہونگی لیکن بایں ہمہ یہ سمجھنا کہ عمل کے بغیر ایمان مطلقاً پایا ہی نہیں جاتا قرآنِ مجید کے نصوص صریحہ کے بالکل خلاف ہے ورنہ پھر منافق، فاسق اور فاجر وغیرہ یہ سب الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں اور دنیا میں صرف دو ہی طبقات رہ جاتے ہیں ایک مومن اور دوسرا کافر اپنے اس بنیادی خیال کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں مصنف نے علمائے سلف اور احادیث کے ساتھ اُن کے اعتنا و اہتمام پر بھی بہت لے دے کی ہے اور اس کو ہی مسلمانوں کے انحطاط کا سبب بتایا ہے، حالانکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کا اصل باعث احادیث کے ساتھ اعتناء و اہتمام اور ایمان و عمل کے درمیان تفریق نہیں بلکہ عملاً قرآنی تعلیمات سے روگردانی اور انحراف ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں بتائی جا سکتی اور کسی امام کا کوئی ایسا قول پیش نہیں کیا جا سکتا جس سے ایک بدعمل انسان کو اپنی بدعملی کیلیے کوئی سہارا مل سکے۔ رہیں بہانہ جو طبیعتیں تو وہ جس طرح احادیث اور ائمہ کے اقوال کا سہارا لے سکتی ہیں قرآن کی آیات کو بھی اپنے حق میں توڑ موڑ سکتی ہیں اور ایمان و عمل کے ایک ہونے کے بعد بھی بدعملی کر سکتی ہیں۔ بہر حال مصنف نے جس جذبہ سے یہ کتاب لکھی ہے وہ قابل قدر اور لائقِ تحسین ہے اور اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جن سے مسلمان عبرت و بصیرت اور پند و موعظت حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا محمد علیؒ کے یورپ کے سفر مرتبہ، پروفیسر محمد سرور تقطیع خورد ضخامت ۲۰۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت عہ/ ۔ پتہ ادارہ ادبیات نو لاہور۔

مولانا محمد علی مرحوم اُن اکابر قوم میں سے تھے جن کے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک سطر اُن کی موت کے بعد قومی سرمایہ کی حیثیت سے محفوظ رکھی جاتی ہے۔ مولانا نے یورپ کا سفر چھ مرتبہ کیا تھا، اس کتاب میں ان سفروں سے متعلق خود مولانا کے خطوط اور بعض تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔

مولانا کی تحریر کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہت پر قلم تھے اور جو بات لکھتے تھے بے لاگ ہو کر لکھتے تھے

چنانچہ ان خطوط میں وہ کہیں جہاز کے ساتھیوں کا تعارف عجیب انداز میں کرا رہے ہیں کبھی وہ مصر میں وہاں کے ارباب سیاست سے ملتے ہیں تو اسلامی اخوت اور عالم اسلام کے حالات پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ یورپ میں کبھی وہ برطانوی مدبرین کے سامنے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کے معاملات رکھتے ہیں اور پھر اُن کی طرف سے سرد مہری اور بے اعتنائی دیکھتے ہیں تو اس پر سخت رنجیدہ ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں یورپ کی عیاشی و فحاشی پر طیش آتا ہے اور کبھی وہ بچوں کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ کفرزار یورپ میں ہونے کے باوجود نماز کا اور حلال و حرام کا برابر خیال رہتا ہے۔ پھر اپنی بیماری اور اُس کے اشتداد کی داستان سُنانے لگتے ہیں تو ایک ایک بات تفصیل سے لکھتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ ان خطوط اور تحریروں سے مصر اور ہندوستان کے سیاسی حالات، یورپ کی معاشرت، برطانوی مدبرین وارباب اقتدار کی خودسری وغیرہ کے علاوہ خود مولانا کے اخلاق وعادات، اسلامیت، جذبۂ عمل و ایثار۔ ظرافت و شوخی طبع ہمدردی بنی نوع انسان اور شگفتہ مزاجی و وسیع المشربی سے متعلق بہت اچھی اور مستند معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

ان میں سے بعض سفروں کے متعلق "علی گڈھ منتھلی" اور "کامریڈ" کی جلدوں میں خود مولانا کے قلم کے لکھے ہوئے جو حالات بکھرے پڑے ہیں اگر کوئی صاحب اُن کو بھی شائع کر دیں تو بڑا کام ہو۔ بہرحال زیرِ تبصرہ کتاب موجودہ ناتمام حالت میں بھی بہت دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

سنہ۴۲ء۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں قیمت ہے مجلد ۱۲

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ

سنہ۴۳ء۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ درفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطہ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپئے مجلد سات روپئے۔

خلافتِ بنی امیہ:۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات ہے مجلد ۱۲

سنہ۴۴ء۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، انداز بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ

سنہ۴۵ء۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد ہے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت ہے مجلد ہے

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ہے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No.L. 4305

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) محسنِ خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا:۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرولباغ سے شائع کیا

فروری ۱۹۴۳ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین و معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت:۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جن میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت سے مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام:۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد سے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت سے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہر

۱۹۳۹ء:۔ نبی عربی صلعم:۔ تاریخِ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن:۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد سے

غلامانِ اسلام:۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد سے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق:۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ مجلد سے

۱۹۴۰ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت صہ مجلد سے

بین الاقوامی سیاسی معلومات:۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحیِ الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد سے

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

برہان

جلد ہیژدہم　　　شمارہ (۲)

فروری ۱۹۴۷ء مطابق ربیع الاوّل ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

۱	نظرات	سعید احمد	۶۶
۲	قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے۔	جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی	۶۹
۳	حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ	پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے۔	۸۱
۴	بچوں کی تعلیم و تربیت	سعید احمد	۱۱۳
۵	ادبیات۔		
	ایشیا	جناب روشؔ صدیقی	۱۲۳
۶	تبصرے	م۔ ح	۱۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

تاریخ میں ایشیا کو یورپ پر ہمیشہ سرداری اور فوقیت رہی ہے بڑی بڑی تہذیبوں اور تمدنوں کے چشمے یہیں پھوٹے علوم و فنون کے چمن اسی کی سرزمین پر کھلے۔ مذاہب عالم کی داغ بیل یہیں پڑی انبیاء کرام کی ولادت و بعثت کا گہوارہ ہونے کا شرف اسی خطۂ ارضی کو حاصل ہوا۔ نطقِ اعرابی اور ذہنِ ہندی اسی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے سکے تھے جنھوں نے تہذیب و ثقافت کے بازار میں بڑا نام پایا عظیم الشان سلطنتوں اور حکومتوں کی بنیاد یہیں پڑی۔ آسمانی کتابوں کا مہبط یہی سرزمین تھی۔ یورپ نے مذہب اور خدا کی معرفت کا سبق اسی کی درس گاہ میں پڑھا علم کی روشنی اسی کے چراغ سے لی۔ تہذیب و تمدن کی دولت و نعمت اُس کو اسی کے خزانہ سے ملی۔ جہادِ زندگی میں جن آلات و اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب اسے ایشیا کے کارخانہ سے ہی دستیاب ہوئے۔ لیکن یورپ نے ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی ایک مستقل انفرادیت قائم کرلی اور دوسری جانب اقوامِ ایشیا شمشیر و سناں کو خیرباد کہہ کر "طاؤس ورباب" میں مشغول ہو گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کو علوم و فنون، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور سیاسی طاقت ہر اعتبار سے دنیا پر اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو گیا۔ اور ایشیا اپنے حریف پنجہ شکن کی تاب مقاومت نہ لا کر اُس کا محکوم بن گیا۔

لیکن چونکہ یورپ کا تصورِ زندگی نسلی اور قومی تھا جس میں انسانیت عامہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لیے اُس نے ایشیا کو محکوم بنا کر اُسے لوٹنا کھسوٹنا اور ہر اعتبار سے تباہ کرنا شروع کر دیا ایشیائی اقوام ایک عرصہ تک "شیرینیِ افرنگ" پر اس درجہ فریفتہ رہیں کہ انھوں نے چنگیزیِ افرنگ کو بھی برداشت کرلیا اور کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ آخر کار پہلی جنگ عظیم نے اُن کی آنکھ کھولی اور اُن کو یہ محسوس ہوا کہ اُن کی تاریخ ماضی کیا ہے اور اب وہ کیا ہو کر رہ گئی ہیں یہ احساس برابر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جگر کا ناسور بن کر پھوٹ پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ ہر جگہ اضطراب

دبے چینی دیکھ رہے ہیں۔

مصر کے لوگ اس کا تہیہ کر چکے ہیں کہ مصر اور سوڈان دونوں کو ایک کر کے برطانوی افواج کو وہاں سے نکال کر رہیں گے۔ فلسطین کا عرب عہد و پیمان کر چکا ہے کہ وہ اپنے ملک کو غیروں کے اثرات سے یک سر پاک و صاف کر دیگا۔ شرق اردن اور ٹرکی میں رازدارانہ گفتگو ہو چکی ہے۔ انڈونیشیا نے آزادی حاصل کر ہی لی۔ انڈوچائنا فرانسیسی تغلب و استبداد کی زنجیروں کو پاش پاش کر دینے پر تلا ہوا ہے۔ ہندستان اور برما دونوں آزادی کے دروازہ پر دستک دے رہے ہیں اور اب کوئی دن جاتا ہے جب کہ علی بابا چالیس چور کا یہ طلسمی دروازہ "سم سم" کھل کر رہے گا۔

اس سلسلہ میں یہ ضروری تھا کہ ایشیائی اقوام ایک دوسرے سے قریب ہوں اور اُن میں اپنی مشکلات کے یکساں ہونے کے باوجود جو بعد و افتراق پیدا ہو گیا تھا اسے دور کیا جائے۔ خوشی کی بات ہو کہ اس راہ میں بھی ہندستان نے ہی سب سے پہلے قدم اٹھایا اور تمام ایشیائی ملکوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ کانفرنس اگلے مہینہ ہندستان کے دارالسلطنت نئی دہلی میں بڑے اہتمام و انتظام کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اخبارات میں اب تک جو اطلاعات چھپی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کانفرنس میں افغانستان، ایران، عراق، فلسطین و شام، افریقہ، مصر، ٹرکی، چین، انڈونیشیا وغیرہ ہر ایشیائی ملک کے نمائندے شریک ہونے ہندستان آ رہے ہیں اور ان سب نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا ہی ہمارے نزدیک یہ کانفرنس جس طرح سیاسی اعتبار سے بڑی اہم ہو ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت غیر معمولی ہو۔ سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ اب ایشیا پر یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں رہی ہو کہ مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب نے اُس کو اپنے مخصوص کلچر اور ثقافت و تہذیب سے بہت دور کر کے لسے معاشرتی اور روحانی اعتبار سے کس درجہ تباہ حال کر دیا ہو۔ ایشیا کے مختلف گوشوں میں اس وقت جو تحریکیں چل رہی ہیں اگر اُن کا عمیق نظر سے جائزہ لیا جائے تو بآسانی اس تہذیبی شعور و احساس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اقوامِ ایشیا میں جیسا کہ اربابِ خبر و نظر پر مخفی نہیں ہو مسلمانوں کو خاص امتیاز حاصل ہو وہ اگرچہ گذشتہ دو سو برس سے سیاسی انحطاط و تنزل کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن اُن کی تہذیبی اور ثقافتی یادگاریں آج بھی تاریخ

کے اوراق میں تابندہ و درخشاں ہیں۔ اُن کا نظامِ زندگی بہمہ جہت کامل و مکمل ہے اور اس میں بدرجۂ اتم ایک بین الاقوامی نظامِ حیات بننے کی صلاحیت ہے۔ رنگ و نسل کا فرق، اقتصادی غارت گری، انسانی حقوق کا غصب و نہب غرض وہ تمام مصائب و آلام جن سے آج دنیا کی تمام کمزور قومیں دوچار ہیں اور جن کا کامیاب حل تلاش کرنے کے لیے بے چین و مضطرب ہیں۔ اسلام میں ان سب کا اطمینان بخش حل پہلے سے موجود ہے اس بنا پر جی چاہتا ہے کہ اس ایشیاٹک کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی سب سے زیادہ نمایاں ہو اور وہ عہدِ ماضی کی طرح پھر ایک مرتبہ بقیہ اقوامِ ایشیا اور اُس کے ذریعہ سے تمام عالم کو راست بازی اور حقانیت کی روشنی دکھا سکیں۔ اس کانفرنس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو عموماً اور علمائے کرام کو خصوصاً یہ کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کے اسلامی نقطۂ نظر کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیبی اور کلچرل وحدت قائم کریں جو دنیا کی موجودہ تباہ حال قوموں کے لیے سرچشمۂ آبِ حیات ثابت ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اسلامی ممالک کے نمائندے باہم متفق و متحد ہو کر شرکائے کانفرنس کو اپنے اصولِ زندگی اور نظامِ حیات سے قولاً و عملاً متاثر کر سکیں۔ بہرحال اسلامی ممالک سے روابط پیدا کرنے اور اس طرح اتحادِ اسلامی کی طرح ڈالنے کے لیے مسلمانانِ ہند کے واسطے یہ بہت اچھا موقع ہے اور ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

[illegible]

گذشتہ ماہ کا المناک سانحہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم ترین استاذ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کی وفات ہے۔ مولانا مرحوم کئی ماہ سے علالت کے امتداد و اشتداد کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ بالآخر ۱۰ صفر المظفر کو ہمیشہ کے لیے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے

مرحوم حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحبؒ کے مخصوص ہم سبقوں میں تھے اور بزرگوں کی خوبیوں اور خصوصیتوں کے جامع، بڑے باوضع، بڑے با اخلاق، بڑے سادہ مزاج اور دارالعلوم کے اساتذہ میں بعض اوصاف کے لحاظ سے بے عدیل و بے مثیل۔ پیرانہ سالی اور غیر معمولی نقاہت کے باوجود جب درس دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کوئی تازہ دم اور بلند آواز مدرس پورے شوق و انہماک کے ساتھ طلبہ سے مصروفِ تخاطب ہے۔ مولانا کا طرزِ تعلیم عام فہم بھی تھا اور دل پذیر بھی۔ پڑھاتے پڑھاتے بہت سی کتابوں کے حافظ ہو گئے تھے۔ اُن کے تلامذہ میں آج بڑے بڑے مدرس بھی ہیں اور باکمال مصنف و انشا پرداز بھی۔ ندوۃ المصنفین کے تقریباً تمام بڑے بڑے رفقاء کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کے مراتب بلند فرمائے۔ ہمیں اس حادثۂ عظیم میں مولانا مرحوم کے اکلوتے صاحبزادے مولوی عبدالاحد صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سے دلی ہمدردی ہے اور ہم اُن کے شریکِ غم ہیں، امید ہے مولوی صاحب

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

ازجناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۶)

احسن الحدیث آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس کتاب کے اوصاف وخصائص اور امتیازات وہ ہوں جن کا ذکر سطور بالا میں تفصیل سے ہوچکا ہے تو اُس سے بہتر دوسرا کوئی کلام یا دوسری کوئی بات کیسے ہوسکتی ہے؟

کیونکہ اگر یہ صحیح ہے کہ کسی کلام کی عظمت وجلالت متکلم کی شخصی عظمت وجلال سے وابستہ ہوتی ہے اور ہر ایک ظرف سے وہی چھلکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے تو پھر تم ہی فیصلہ کرو کہ کلام الٰہی کا مقام کیا ہونا چاہیے اور جس کتاب اور کلام کی نسبت ذاتِ خداوندی سے ہو اُس کو کس منقبت سے یاد کرنا چاہیے۔

وہ جب دورِ ماضی کے واقعات بیان کرتا اور اُن کے ذریعہ موعظت وعبرت کے درس دیتا ہے، وہ جب اوامر ونواہی سے متعلق خطاب کرتا ہے اور قبول وعدم قبول، وعدو وعید کو سناتا ہے، وہ جب کتبِ سماویہ کی تصدیق اور مہیمن بن کر اُن کے نسخ وتحریف کا اعلان کرتا ہے، وہ جب اپنے اعجاز کو پیش کرکے پیروانِ مذاہب وملل کو چیلنج کرتا ہے، وہ جب غوامض وسرائر سے پردہ اٹھا کر حقائق کی روشنی میں ماضی اور مستقبل کے درمیان رشتۂ اتحاد کو واضح اور ظاہر کرتا ہے تو چشم بصیرت افروز اور قلبِ عبرت آموز ایک لمحہ کے لیے بھی یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرسکتے کہ لاریب قرآن "احسن الحدیث اور بہتر بات" ہے اور اس کے امتیازات وخصوصیات کا مقابلہ دنیا کی باتیں، حکمتیں، احکام ومواعظ تو کیا کرسکتیں کتبِ سماویہ

یں سے بھی کوئی کتاب اور کوئی صحیفہ اس کے برابر نہیں رکھا جا سکتا۔

وہ احسن الحدیث ہے اس لیے کہ کوئی بات اپنی ادا اور تعبیر میں اُس کے حُسنِ اعجاز کو نہیں پہونچتی، اس لیے کہ کوئی کلام اُس کے غیر متبدل نظم و معانی کے علو اور بلندی کو نہیں پہونچتا اس لیے کہ کوئی کتاب اُس کی موعظت و عبرت آموز نصیحت کے معیار کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اس لیے کہ صحیفۂ غیب و شہود کے فیصلے اُس سے بہتر نہیں اور اُس کی ہمسری کرنے سے عاجز و درماندہ ہیں۔ اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ آفتابِ درخشاں کی طرح منور ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ۔

مثانی | قرآنِ عزیز یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ میری امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ میں "مثانی" ہوں" مَثنیٰ" لغت میں "دو۔ دو" کا مفہوم ادا کرتا ہے گویا کوئی بات اگر مکرر کہی جائے یا کوئی کلام اگر دہرایا جائے تو اُس پر "مثنّیٰ" بالتشدید کا اطلاق ہوا کرتا ہے اور قریب قریب اسی مفہوم کو "مثنیٰ" بالتخفیف ادا کرتا ہے اور اعادہ و تکرار کا مطلب لیا جاتا ہے۔ پس قرآنِ عزیز اس لیے مثانی ہے کہ اُس کے اکثر و بیشتر احکام اور مواعظ و قصص، عبرت و نصیحت اور دل نشینی و دل پذیری کی خاطر مکرر اور بار بار دہرائے گئے ہیں اور علم النفس کے ماہرین کو اعتراف ہے کہ پند و نصیحت کے مضامین کو دہرانا اور اُن کا بار بار اعادہ کرنا مقصدِ موعظت و بصیرت کے لیے نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری ہے۔

اور اگر یہ معنی لیے جائیں کہ اس کتاب میں خدائے برتر کی ثناء و منقبت کا پہلو تمام کتبِ سماویہ پر فائق و افضل ہے نیز اس کی بلاغت و فصاحت کا اعجاز گویا متکلم کی رفعتِ قدر و جلالتِ شان کی ثنا میں رطب اللسان ہے تو بھی قرآن اس مفہوم کے پیشِ نظر بلاشبہ "مثانی" ہے اور اس صورت میں اس کو "مثنیہ" بمعنی "ثناء" کی جمع تسلیم کرنا ہوگا۔

غرض ادا، و تعبیر ہو یا بندشِ نظم و الفاظ، مفاہیم و مطالب ہوں یا معانی و مقاصد ہر حیثیت سے قرآنِ حکیم "مثانی" ہے اور یہی اس کے اعجازِ کلام کے متعدد دلائل و براہین میں سے

روشن برہان ہے، اس لیے کہ جب وہ کسی واقعۂ ماضی پر عبرت و بصیرت کے لیے روشنی ڈالتا ہے یا جب وہ کسی امر و نہی کا اعلان کرتا ہے یا معاش و معاد کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ سناتا ہے تو باوجود اس امر کے کہ ایک ہی واقعہ، ایک ہی حکم، ایک ہی مثال اور ایک ہی فیصلہ ہوتا ہے تاہم وہ اُن کو معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ اس طرح مختلف طریقوں سے بیان کرتا ہے کہ ہر ایک مقام اپنی جگہ مستقل اور ضروری نظر آتا ہے اور کسی ایک جگہ کے متعلق بھی بے محل اور غیر مستحسن ہونے کا تو ذکر ہی کیا ہے غیر ضروری کہنے کی جسارت نہیں کی جا سکتی اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جس نہج اور جس اسلوب سے اس کا ایک جگہ ذکر ہوا ہے وہی اس کے لیے موزوں سے موزوں تر تھا اور اُس کی تکرار زیادہ سے زیادہ حلاوت و شیرینی کا باعث ہوتی ہے نہ کہ ملال و دل تنگی کا اور قندِ مکرر کا اس سے بہتر نمونہ دنیا آج تک پیش نہیں کر سکی پس اگر اس لحاظ سے بھی اس کو "مثانی" کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی سماوی کتاب کی تلاوت کیجیے الفاظِ کتاب کو ایک سے زیادہ مرتبہ تلاوت کرنے کے بعد اُس کے مسلسل پڑھتے رہنے کا ذوق پیدا نہیں ہوتا اگر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ معتقدانہ عشق و محبت کے پیشِ نظر اُس کے مطالب و مفاہیم کے لحاظ سے ہو سکتا ہے لیکن قرآنِ عزیز کا نظم الفاظ اپنے اندر وہ جاذبیت رکھتا ہے کہ ایک ناسمجھ بچہ اور عربی زبان سے ایک ناواقف شخص بھی جب اُس کو تلاوت کرتا ہے تو اُس کے ذوقِ تلاوت کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ بار بار خمار آلود انسان کی طرح پڑھتا اور حظِ وافر حاصل کرتا ہے کیا اچھا کہا ہے کسی حکیم و دانا نے قرآن کے متعلق یہ جملہ کہ "دنیا میں ایسی نثر جس کی ادا کا شیریں سے شیریں نظم بھی مقابلہ نہ کر سکتی ہو قرآن ہے۔"

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ	اللہ نے اتاری بہتر بات، کتاب آپس
كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ	میں ملتی، دہرائی ہوئی۔ بال کھڑے ہوتے ہیں
مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ	اُس سے جلد پر اُن لوگوں کے جو ڈرتے
رَبَّهُمْ (زمر)	ہیں اپنے رب سے۔

بعض علماء اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ چونکہ قرآنِ عزیز میں سورۂ فاتحہ بھی شامل ہے اور اس کا جزء ہے اور وہ بار بار نماز میں دہرائی جاتی ہے اس لیے قرآن کو بھی "مثانی" کہا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ — اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں

الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (حجر) — وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا۔

بشیر و نذیر | قرآنِ حکیم جب کہ الہامی کتاب اور کلام الٰہی ہے اور وہ کائنات کی رشد و ہدایت کے لیے نسخۂ کیمیا اور اکسیرِ اعظم ہے تو رشد و ہدایت کا فطری تقاضہ ہے کہ وہ "بشیر" بھی ہو اور "نذیر" بھی۔ کیونکہ کوئی ہدایت، ہدایت نہیں ہو سکتی جب تک وہ احکام الٰہی کے امتثال پر بشارت نہ سناتی ہو اور منہیات کی جانب رغبت پر عذابِ الٰہی سے نہ ڈراتی ہو دراصل مذہب ہی ایسی پونجی ہے جو انسان کا اُس کے خالق و مالک کے ساتھ صحیح ارتباط پیدا کرتا اور آقائے حقیقی کا بندوں کے ساتھ حقیقی تعلق قائم رکھتا ہو۔ وہی انسان کو نیک کرداری پر اجر کی بشارت دے کر نیک بناتا اور بدکرداری پر خوف و عذاب کی نذارت سنا کر بدی سے باز رکھتا ہے۔ وہی یہ بتلاتا ہے کہ یہاں ہر عمل کسی نتیجہ کے ساتھ مربوط ہے اور ہر ایک کردار اپنے ثمرہ اور نتیجہ سے منسلک ہے۔ یہاں پاداشِ عمل کے قانون سے غافل ہو جانا ہلاکت اور اس کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی کی منزلیں طے کرنا عقل و نطانت ہے۔ اس لیے نیکی اور بدی ایسے شجر ہیں جن کے پھل ایک دوسرے سے متضاد ہی وجود پذیر ہو سکتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ نیکی کے شجر پر بدی کا پھل اور بدی کے درخت پر نیکی کے پھول اُگ آئیں۔ اگر آگ کا کام گرمی پہونچانا ہے اور پانی کی ڈیوٹی خنکی کا فائدہ دینا تو بدی کے ذریعہ باغِ جناں کی توقع کرنی اور نیکی کے بیج سے نارِ جہنم کے پودے کا انتظار کرنا اہلِ خرد کا کام نہیں ہے۔

یہی وہ حقائق ہیں جن کے ذکر کا نام بشارت و نذارت ہے اور ان حقائق کے پیش کرنے والے کو "بشیر" و "نذیر" کہتے ہیں چنانچہ یہ خدمت انبیاء و رسل کی زبانِ وحی ترجمان بھی

ادا کرتی رہی ہے اور وہ کتب سماویہ بھی جو خدا کی ہدایت و رشد اور دعوتِ حق کے لیے نازل ہوتی ہیں۔

پس قرآن کہتا ہے کہ جس طرح مجھ سے پہلے خدا کی کتابیں بشیر و نذیر بن کر آئی ہیں اسی طرح میں بھی بشیر و نذیر ہوں، فرق صرف اسی قدر ہے کہ مجھ سے قبل کتبِ سماویہ کا نزول خاص خاص ملکوں اور قوموں تک ... رہا ہے اور میں قانونِ کامل، پیغامِ مکمل بن کر رہتی دنیا تک تمام کائناتِ انسانی کے لیے نازل ہوا ہوں اور میرا یہ امتیاز تمام صفاتِ عالیہ کے اندر جاری و ساری ہے اور میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اسود و احمر اور ابیض و اصفر سب ہی کے لیے بشیر و نذیر ہوں۔

میں یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ اعمال اور جزاءِ اعمال کے درمیان گو عقلی اور فطری رشتۂ لازم و ملزوم قائم ہے تاہم یہ رشتہ علت و معلول کا رشتہ نہیں ہے کہ اندھی فطرت اور بے شعور قدرت کے ہاتھوں قائم ہے اور ان کے مرتب و ناظم کے ارادہ و اختیار کو اس بارہ میں قطعاً کوئی دخل نہیں بلکہ مرتب و ناظم کہنا ہی غلط ٹھہرے اس کے برعکس مذہب اور دین کا پیغامِ حق اس شہادتِ کبریٰ کا بھی اعلان کرتا ہے کہ یہاں عمل اور پاداشِ عمل کا معاملہ گو قانونِ قدرت کے زیرِ اثر کارفرما ہے تاہم یہ قانونِ فطرت اور نیچر پر متصرف قانون قدرت اس برتر ہستی کے یدِ قدرت کی گرفت میں ہے جو بے قید قدرت کے ساتھ ساتھ ارادہ و اختیار بے چون و بے چگون کی بھی مالک ہے اس لیے اس درگاہ میں درِ توبہ بھی وا ہے اور ہر لمحہ یہ بشارت ٹوٹے ہوئے دلوں اور گناہ پر شرمندہ عاصیوں کے لیے مرہم کا کام دیتی ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے
عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا	اے میرے وہ بندو جو (گناہ کرکے)
مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ	اپنے نفسوں پر حد سے گذر گئے ہیں
يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا	خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝	بلاشبہ اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے
(زمر)	بلاشبہ وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے

اور نکوکار انسانوں کو ڈراتا ہوں کہ کہ کہیں نکوکاری پر نازاں اور مغرور نہ ہو جانا کہ ساری نیکی برباد ہو کر شعلۂ نار کا ذخیرہ نہ بن جائے۔

ھُوَ اَعْلَمُ بِکُمْ اِذْ اَنْشَاَکُمْ	وہ تم کو خوب جانتا ہے جب اُس نے
مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّۃٌ	تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب تم
فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ فَلَا تُزَکُّوْا	اپنی ماؤں کے پیٹوں میں چھپے تھے
اَنْفُسَکُمْ ھُوَ اَعْلَمُ	تو اپنے آپ کو پاک نہ کہو، وہ خوب
بِمَنِ اتَّقٰی ۝ ۳۳/۳۵	جانتا ہے جو متقی ہے۔

اور ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی واضح کرتا ہوں کہ ثواب و عقاب کا یہ تعلق چونکہ نیک و بد اعمال کے ساتھ وابستہ ہے اس لیے یہ تعلق قانونِ فطرت کے پیشِ نظر صحیح اور درست ہے لیکن یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اعمال کا یہ تعلق اپنے ثمرات کے ساتھ حقیقی نہیں بلکہ صاحبِ ارادہ و اختیار ہستی کے قائم کر دینے پر ہے کہ اُس نے یوں ہی فیصلہ کیا ہے اور اس طرح قانون بنا دیا ہے لہٰذا جنت و جہنم اور ثواب و عقاب کا حقیقی تعلق اُس کے اپنے فضل و کرم سے وابستہ ہے اور جنت و جہنم اُس کی رضاء و عدمِ رضاء کا ثمرہ و علامت ہے معلول نہیں۔ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ پس یہی وہ حقیقت ہے قرآن عزیز جس کا اس طرح اظہار کرتا ہے

کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ	ایک کتاب ہے کہ جدا جدا کی گئی
قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ	ہیں اُس کی آیات قرآن ہے عربی
بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا	زبان کا سمجھ والوں کے لیے خوشخبری
	سنانے والا اور ڈرانے والا۔

مبارک | اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ جو کتاب ہدایت وسعادت کا پیام، فلاح ونجاح کی رہنما معاش ومعاد کی رہبر، پند وموعظت کا ذخیرہ، حکمت وحکم کا مخزن، قصص وامثال کا معدن، خطابتِ حق کا مبلغ، دعوتِ الی الحق کا مناد، نیکی وبدی کی بشیر ونذیر ہو اس سے زیادہ اور بہتر کون سی کتاب ہوسکتی ہے اور جب سرمدی اور ابدی نجات کا سوال درمیان میں آجائے تو قرآن کے ماسوا کس کو پیش کیا جاسکتا ہے پھر ایسی کتاب ہی اگر "مبارک" نہ کہلائے تو پھر اس موقر لقب اور معزز خطاب کا استحقاق کس کو پہونچ سکتا ہے؟ بلاشبہ قرآنِ حکیم مبارک کتاب ہے اور جب کہ اس کی نازل کرنے والی مقدس ہستی خود صاحبِ برکت وسعادت ہو "تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ" اور جس کا نزول مبارک رات میں ہوا ہو "إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ" تو پھر وہ کلام کیوں "مبارک" نہ ہو۔

هٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ	یہ کتاب ہے ہم نے اس کو اتارا
فَاتَّبِعُوهُ	ہے مبارک پس تم اس کی پیروی
(انعام)	کرو

منادی | ندا، پکار، صدا، اس آواز کا نام ہے جو غافلوں کو ہشیار، خوابیدہ کو بیدار، اور بے پرواہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ قرآن بھی اس مفہوم کے پیشِ نظر پکارنے والے کی پکار، صدائے خوش ہنگام اور ندائے ازخوابِ گراں خیز ہے وہ صوتِ ہادی ہے اور برقِ باطل سوز، وہ رعدِ حق ہے اور صدائے دل آویز، اس صدا نے دکھی دلوں کو تسکین دی، بہروں کو شنوا، اندھوں کو سوجاکھا اور گونگوں کو گویا بنادیا۔

یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی آواز بے شک صحرا میں ایک پکارنے والے کی پکار تھی مگر بنی اسرائیل کی بھٹکتی ہوئی بھیڑوں کے لیے، یسوع مسیح کی صدا یقیناً صدائے حق تھی مگر فریسیوں، صدوقیوں، اور اسرائیلیوں کے لیے۔ ندائے موسیٰ بلاشبہ صوتِ ہادی تھی لیکن فرعونیوں اور یہودیوں کے لیے لیکن قرآن کی ایک ہی رعد آسا اور برق مثال صدا نے

سارے عالم کو جگا دیا اور تمام کائنات میں اپنی صوتِ ہادی سے تہلکہ ڈال دیا اور ہر سمت اور ہر گوشہ میں اقدارِ عالم کو زیر وزبر کر دیا۔

نہیں وہ ڈھول کی آواز نہیں ہے کہ تہی دامن ہوا ور نہ وہ رعد کی کڑک ہے کہ شنوا کو بہرہ بنادے اور نہ وہ برقِ چشمک زن ہے کہ بصارت و بصیرت کو بے نور کر دے اور نہ وہ صحرا میں پکارنے والے کی صدا ہے کہ بے اثر ہو کر رہ جائے بلکہ وہ ندائے حق ہے، صوتِ ہدیٰ ہے، صدائے خدا ہے، اس لیے حق کی سربلندی، ہدایت کی سربراہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی آبیاری اُس کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں۔

کامرانی اُس کے دامن کو چومتی اور کامگاری اُس کے قدموں پر نثار ہوتی ہے اور "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" کا اعلان کر کے اپنے فداکاروں کے لیے معراجِ فلاح ونجاح کا تمغہ بخشتی اور تاجِ علو عطا کرتی ہے۔

یہ جو کچھ کہا گیا اور کہا جا رہا ہے لفظی صف آرائی اور تعبیری زیب و زینت و زیبائی نہیں ہے بلکہ ناقص اور درماندہ الفاظ وعبارت میں اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ مبالغہ تو کجا حقیقتِ ثابتہ کے رخِ روشن کی صحیح تصویر بھی نہیں حقیقت تو بلاشبہ اس سے بھی بلند و ارفع ہے۔

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا (آل عمران)	اے پروردگار! بلاشبہ ہم نے پکارنے والے کی پکار کو سنا جو ایمان کے لیے ہے۔ وہ یہ کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لے آئے۔

یہ صحیح ہے کہ "منادی" سے ذاتِ قدسی صفات (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی مراد ہے مگر اس کے باوجود قرآن کو "منادی" کہنا اشکال کا موجب نہیں ہے اس لیے کہ منادی کی

مدار برحق جب کہ "ایمان برب العٰلمین" ہے تو اس مدار کا مصداق جس طرح پیغمبرِ خدا کی شخصیت ہو سکتی ہے اُسی طرح وہ کتاب بھی اس کا مصداق بن سکتی ہے جس کو کلام الٰہی کہہ کر پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) امت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور جو اپنے اعجازِ بلاغت و فصاحت اور معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ راہِ ہدایت و سعادت کی جانب پکار پکار کر ہم گم کردگانِ راہ کو راہِ مستقیم سے روشناس کراتی ہے۔

علم پھر اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے تمام کاروبار اور ہر قسم کے معاملات و امور کا مدار دو حقیقتوں پر ہوتا ہے ایک علم اور دوسری عمل۔ اس لیے کہ اگر علم حاصل ہے مگر عمل مفقود تو وہ "علم" تعطل اور بے کاری کی نذر ہو جائے گا اور اگر عمل موجود ہے مگر "علم" سے محرومی ہے تو وہ عمل کبھی مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا بلکہ موجبِ نقصان و خسران بن جائے گا تو یوں سمجھیے کہ دنیا کے امور کی گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ ہوگا تو گاڑی کا چلنا معلوم؟ پس اسی طرح دینی امور اور روحانی معاملات بھی ان ہی دو حقیقتوں کے اشتراک سے وابستہ ہیں اور ان دونوں کی صحت و سقم پر روحانی اور دینی امور کے صحت و سقم کا دار و مدار ہے۔

تو اب یہ دعویٰ بے دلیل نہ ہوگا کہ روحانی سعادت اور سرمدی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے کائناتِ انسانی کے لیے مسطورہ بالا دونوں حقیقتوں کا خلاصہ اور عطر عطا کر دیا ہے اور ان ہی ہر دو حقیقتوں کا نام مذہب کی اصطلاح میں قرآن اور اسوۂ حسنہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ قرآن علم ہے اور اسوۂ حسنہ عمل اور ان ہی کا مجموعہ سعادتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی کے لیے کفیل ہے۔

اس حقیقت کا بیان ان الفاظ میں بھی کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو تصدیقِ نبوت و رسالت کے سلسلہ میں جو بھی معجزات عطا ہوئے وہ سب کے سب عملی تھے۔ مثلاً یدِ بیضا، عصاء موسیٰ

دمِ عیسیٰ، ناقۂ صالح (علیہم السلام) اور اسی طرح کے دوسرے معجزات عملی معجزات تھے اور اس بنا پر اُن انبیاء علیہم السلام کے بعد یا اُن کی زندگی ہی میں اپنا مقصد پورا کر کے ختم ہو گئے اور اگرچہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بہت سے عملی معجزات دیے گئے مگر ان سب کے برعکس آپؐ کو قرآن ایسا معجزہ عطا ہوا جو علمی ہے اور اسی وجہ سے وہ ابدی و سرمدی پیغام ہے جس کے ختم اور فنا ہو جانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

غرض وہ خدائے برتر کا معجز کلام کائناتِ جن و انس کی فلاحِ دارین کا مکمل نظام علوم و معارف کا گنجینہ، ایقان و اذعان کا خزینہ، حیاتِ سرمدی کا سرچشمہ اور نجاتِ ابدی کا ضامن ہے اور یہ صرف اس لیے کہ وہ "علم" ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (بقرہ)	اور اگر تم نے اُن کی خواہشوں کی پیروی کی بعد اس کے کہ تم کو پہنچ چکا "علم" تو بے شک تم بھی بے انصافوں میں ہو گئے۔
فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ (آلِ عمران)	پھر جو جھگڑا کرتے ہیں تم سے اس قصہ میں بعد اس کے کہ آ پہونچا تمہارے پاس "علم" (سچی خبر)
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ٥ (رعد)	اور اسی طرح ہم نے اتارا یہ کلام حکم عربی زبان اور اگر تم ان کی خواہش کے مطابق چلے بعد اس کے کہ تم کو "علم" پہونچ چکا تو کوئی نہیں تیرا حمایتی اور بچانے والا اللہ سے۔

عدل! لیکن کسی کتاب یا دستور کو اگر صرف یہی شرف حاصل ہو کہ وہ "علم" ہے تو مقصدِ رشد

وہدایت کے لیے یہ کافی نہیں ہے اور تشنۂ آبِ بقا کی سیرابی اور تسکین کا باعث نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ یہ بھی ثابت نہ ہو جائے کہ وہ "عدل" پر مبنی ہے اور جو علم و یقین اور اذعان و ایقان اُس نے ہم کو عطا کیا ہے اُس کا ہر ایک فیصلہ اُس کی ہر ایک ترغیب و ترہیب اُس کی ہر ایک تعلیم افراط و تفریط دونوں سے جدا سر تا سر "عدل" ہے۔

علماءِ لغت جب ظلم و عدل کے معنی بیان کرتے ہیں تو "وضع الشیٔ فی غیر محلہ۔ کسی شے کو اُس کے حقیقی مقام پر نہ رکھنا" کو ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور "وضع الشیٔ فی محلہ۔ ہر شے کو اُس کے حقیقی مقام پر جگہ دینا" عدل کہلاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اگر قرآن یہ نہ بھی کہتا کہ وہ "عدل" ہے تب بھی اس لیے عادل ہوتا کہ وہ خدائے حکیم و خبیر کا کلام ہے جو ظلم کے ہر ایک شائبہ سے وراء الوراء اور پاک ہے لیکن قرآن نے صرف اس عقلی استدلال ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس سے آگے صاف اور صریح الفاظ میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھا کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے، اور بلاشبہ وہ "عدل" بھی ہے۔

اور یہ تو بارہا کہا جا چکا ہے کہ ان جیسے مقامات پر قرآن اسم فاعل کے صیغے استعمال نہیں کرتا بلکہ صفت کے صیغہ کو ترجیح دیتا ہے اس لیے کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ وصف اُس کے اندر بدرجۂ تمام و کمال موجود ہے اور اس طرح موجود ہے کہ گویا موصوف اور صفت کے درمیان دوئی کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ اور اس مقام پر تو خصوصیت کے ساتھ اس لیے بھی اُس نے "عادل" کی جگہ "عدل" کے ساتھ تعبیر کیا کہ یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ قرآن اگر صرف عادل ہوتا اور عدل نہ ہوتا تو یہ کہنے کی گنجائش رہتی کہ کسی عادل اور منصف کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی بھی حالت اور کسی بھی وقت میں عدل کے خلاف نہیں کر سکتا یا نہیں کہہ سکتا کیونکہ بہت سے عادل گاہے نادانستہ ہی عدل کے خلاف کہہ گذرتے یا کر گذرتے ہیں۔ تاہم چونکہ اُن کے اندر یہ وصف اکثر و بیشتر موجود پایا جاتا ہے اس لیے اُس کو عادل ہونے سے خارج نہیں کیا جاتا۔

مگر قرآنِ حکیم چونکہ وہ عادل نہیں ہے کہ جس کا وصفِ عدل کبھی دانستہ یا نادانستہ اُس سے جدا ہو جاتا ہو بلکہ اُس کا ہر ایک نقرہ اور ہر ایک جملہ عدل ہی عدل ہے تو اس لیے ضروری ہوا کہ اُس کو "عادل" نہ کہا جائے بلکہ "عدل" کہا جائے تاکہ ہر ایک شخص بآسانی یہ سمجھ جائے کہ قرآن کے دائرہ میں عدل، قرآن ہے اور قرآن، عدل ہے گویا لازم و ملزوم میں انفکاک و جدائی ممکن ہے لیکن قرآن اور عدل کے درمیان مفارقت محال اور ناممکن ہے اسی لیے قرآنِ عزیز نے بڑی اہمیت مگر معجزانہ اختصار کے ساتھ اس حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ	اور تمہارے پروردگار کی بات
صِدْقًا وَّعَدْلًا (الانعام)	پوری سچی ہے اور انصاف کی

غرض جو بات یا جو حقیقت نقص و خام کاری سے پاک، افراط و تفریط سے بالاتر، بے محل و بے موقع ہونے سے بلند و بالا اور ہر حیثیت سے اعتدال و انصاف گیر ہو اُس کا نام "عدل" ہے اور یہی ہے وہ عدل جس کو اس آیت میں قرآنِ حکیم کی صفت ظاہر کیا گیا ہے اور یہی صفت اس کی دلیل ہے کہ قرآن ابدی پیغام اور سرمدی قانون ہے کیونکہ بقاءِ اصلح کے قانون کا تقاضا ہے کہ جب کوئی شے اپنی جگہ چھوڑ دے اور بے محل ہو جائے تو گویا اُس نے جگہ نہیں چھوڑی اور بے محل نہیں ہوئی بلکہ اُس نے اپنے فناء کے پیغام پر دستخط کر دیے اور وہی شے بقاء و دوام کا مقام حاصل کر سکتی ہے جو ہر حیثیت سے با محل، کامل، تام، صادق، اور عادل ہو۔ اور جس میں یہ تمام صفات یک جا جمع ہوں تو وہ صادق و عادل ہی نہیں ہے بلکہ "صدق" و "عدل" ہے اور بقاء و دوام اور حیاتِ مدام کی ہمدم و رفیق۔

(باقی آئندہ)

حضرت شاہ فخرالدین دہلویؒ

از

جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ۔ ایم ۔ اے

محمد شاہ کی دلی ہے ۔ زوال و انحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں ۔ قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے ۔ سکھ اور مرہٹے ہر طرف لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں ۔ نادر شاہ کا قتل عام اسی سرزمین پر ہو چکا ہے ۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہچکیاں لے رہا ہے اور دم توڑنا ہی چاہتا ہے جس دور کی ابتدا ایبک و التمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی وہ آج محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے ناؤ نوش میں ختم ہو رہا ہے ۔ فلسفہ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے ۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر (اقبال)

اس سیاسی بدامنی اور اخلاقی پستی کے زمانہ میں اللہ کے کچھ بندے درس و تدریس کے کام میں مشغول ہیں ، ہوا تیز و تند ہے لیکن وہ اپنا چراغ جلا رہے ہیں طوفان امنڈتا چلا آ رہا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے اور اپنے کام میں اسی طرح مشغول ہیں ۔ دہلی میں جس کا عالم بقول حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے یہ تھا ۔

بِهَا مَدَارِسُ لَوْ طَافَ لَبَصِيرُ بِهَا ۔۔۔ لَمْ تَقَعْ عَيْنُهُ اِلَّا عَلَى الصُّحُفِ

جس طرف نکل جائیے ، اس میں مدارس نظر آئیں گے ۔۔۔ اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگا ۔ (شاہ عبدالعزیزؒ)

دو مدرسے ایسے ہیں جو اس وقت دلی کی جان ہیں۔ ایک مدرسہ رحیمیہ[1] جس میں دربارِ ولی اللہی سج رہا ہے اور ایک زبردست انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ اور دوسرا اجمیری دروازہ کا مدرسہ جس میں دکن کا ایک نوعمر عالم کسی روحانی اشارے پر آ کر اقامت گزیں ہو گیا ہے۔ تقریباً نصف صدی قبل اس نوجوان کے والد کو دہلی کے ایک مشہور بزرگ نے دکن میں تبلیغ و اصلاح کے کام کے لیے بھیجا تھا۔ آج اُس کا یہ فرزند علم و عرفان کی شمع جلانے کے لیے دکن کو چھوڑ کر دلی چلا آیا ہے دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھچ کر اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا ہے وہ اسی کا ہو جاتا ہے جب حدیث کا درس دینا شروع کرتا ہے تو سننے والوں پر ع

فتادِ سامعہ در موجہ کوثر و تسنیم

کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

یہ شاہ فخر الدین صاحبؒ ہیں ان کے والد شاہ نظام الدین صاحبؒ اورنگ آبادی حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب دہلویؒ کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ تھے اور اُن ہی کے حکم کے مطابق وہ دکن چلے گئے تھے۔ اس مضمون میں ان ہی کے حالات سے بحث کرنی ہے

ولادت | شاہ فخر الدین صاحبؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۲۶ھ مطابق ۱۷۱۴ء کو بمقام اورنگ آباد ہوئی۔ جب حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کو اپنے عزیز مرید شاہ نظام الدینؒ کے تولد فرزند کی خبر پہونچی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ فخر الدین نام تجویز کیا[2] اور اپنا ملبوس خاص نومولود کے لیے

---

[1] یہ وہی مدرسہ ہے جس کی نسبت مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم لکھتے ہیں "اس مدرسہ میں چھوٹے چھوٹے مکان بن گئے ہیں، جہاں کسان وغیرہ غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ (شاہ ولی اللہؒ) کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھتے تھے۔ اب چونکہ یہ کل جائداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب کی ہے اس لیے اس گلی پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے" (تاریخ دار الحکومت دہلی۔ ج ۲ ص ۱۶۷) فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار (برہان) [2] مناقب فخریہ (قلمی) ص ۶۔ اس کتاب کا ذکر میں نے اکتوبر ۱۹۴۶ء کے برہان میں کیا تھا۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب قاضی جمیل احمد صاحب نظامی نیازی کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے ازراہ کرم اس کتاب کا نسخہ (باقی ص۴۳)

عنایت فرمایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس بچہ کے شاندار مستقبل کی بشارت دی۔ ایک مجلس میں خود شاہ فخرالدین صاحبؒ نے اس کا ذکر اس طرح فرمایا۔

"حضرت شیخ بعد تولد من رقعہ کہ برائے حضرت صاحب قبلہ نوشتہ بودند۔ چنانچہ تا حال آں رقعہ پیش ما است برائے من بسیار بشارات و الفاظ زیادہ تر از رتبہ من نوشتہ اند و بہ تصدیق لحظہ ایشاں حق تعالیٰ بر من رحمت کردہ است" [۱]

شاہ صاحبؒ نے اس مکتوب میں یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ لڑکا شاہ جہاں آباد میں ہدایت وارشاد کی شمع روشن کرے گا [۲]

شاہ فخرالدین صاحبؒ کے چار بھائی اور ایک بہن تھی۔ ایک بھائی حقیقی تھے باقی سب علاتی۔ بڑے اور حقیقی بھائی کا نام محمد اسمٰعیل تھا [۳] باقی تینوں بھائیوں کے نام غلام معین الدین غلام بہاء الدین، غلام کلیم اللہ تھے۔ بڑے بھائی خواجہ کامگار خاں [۴] کے مرید تھے۔ باقی تینوں بھائی شاہ فخرالدین صاحبؒ سے بیعت تھے [۵]

شاہ فخرالدین صاحبؒ کے بڑے بھائی بہت سادہ لوح اور نیک طینت انسان تھے۔ شاہ فخرالدین صاحبؒ فرمایا کرتے تھے۔

"برادر کلان من بسیار سادہ بود مرا بہ لفظ ملّا یاد کردند، بر ایں جہت کہ ایشاں اکثر بہ تماشا مشغول می شدند و بہ ایں ذوق داشتند من اکثر کم حاضر می شدم مرا ملّا می گفتند" [۶]

(بقیہ حاشیہ) مجھے عنایت فرمایا۔ اس مضمون کی تیاری میں اس کتاب سے بہت مدد ملی ہے۔ [۱] فخرالطالبین (قلمی) ص ۱۰۲ یہ حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کا ملفوظ ہے اور اُن کے ایک مرید سید نورالدین حسینی فخری نے مرتب کیا ہے میرے پیش نظر قلمی نسخہ کا سنہ کتابت ۳ ذیقعدہ ۱۲۳۰ھ ہے۔ [۲] مناقب فخریہ۔ ص ۸ [۳] شجرۃ الانوار مصنفہ رحیم بخش۔ میں اُن کا نام عمادالدین خاں لکھا ہے۔ اور محمد اسمٰعیل نام کو غلط بتایا ہے۔ [۴] یہ حضرت شاہ نظام الدین صاحبؒ کے مرید اور خلیفہ تھے انہوں نے اپنے پیر کے ملفوظات "احسن الشمائل" کے نام سے مرتب کیے ہیں۔ [۵] مناقب فخریہ۔ ص ۹۔ [۶] فخرالطالبین۔ ص ۱۰۰

شاہ فخرالدین صاحبؒ کو اپنے بہن بھائیوں سے بڑی محبت تھی اپنی بہن کو "اما" کہا کرتے تھے[1] بڑے بھائی کا جب انتقال ہوا تو نہایت رنجیدہ اور غمگین ہوئے۔[2]

سلسلۂ نسب اور لقب | حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے واسطہ سے حضرت صدیق اکبرؓ تک پہونچتا ہے۔ آپ نے اپنے سلسلۂ حدیث میں اپنے آپ کو "صدیقی" لکھا ہے۔[3] آپ کی والدہ جن کا نام سید بیگم تھا حضرت سید محمد گیسودرازؒ کے خاندان سے تھیں۔[4]

حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کا لقب "محب النبی" تھا۔[5] اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آپ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لقب سے مخاطب کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا۔[6]

تعلیم | شاہ فخرالدین صاحبؒ کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ اُن کے والد شاہ نظام الدینؒ خود بڑے ذی علم بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے اس بیٹے کی جس کے شاندار مستقبل کے متعلق حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ بشارت دے چکے تھے، تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ اور اس زمانہ کے نہایت ہی مشہور علماء سے اُن کی تکمیل تعلیم کرائی۔ حضرت شاہ نور محمد صاحبؒ نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ فخرالدین صاحب نے نہایت ہی بلند پایہ بزرگوں سے تحصیل علوم کیا تھا۔[7]

---

[1] فخرالطالبین۔ ص ۱۰۷ (قلمی) [2] ایضاً ص ۶۰ (قلمی) [3] تکملہ سیر الاولیاء، از گل محمد احمد پوری۔ ص ۴۹۔ مناقب فخریہ ص ۵۔ [4] شجرۃ الانوار، از رحیم بخش (قلمی) یہ چشتیہ سلسلہ کی مکمل تاریخ ہے اور کئی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مصنف حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کا مرید ہے۔ میرے پیش نظر جو نسخہ ہے اس کا سنہ کتابت ۱۲۸۱ھ ہے۔ اس کتاب کے لیے میں اپنے محترم بزرگ جناب مولوی حکیم عبدالرب صاحب نظامی خلف حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ کا ممنون احسان ہوں کہ اُن کی عنایت سے مجھے اس کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔

[5] تکملہ سیر الاولیاء۔ مناقب فخریہ ص ۴

[6] تکملہ سیر الاولیاء۔ [7] ایضاً ص ۱۰۶

آپ نے فصوص الحکم، صدرا، شمس بازغہ، وغیرہ کتابیں میاں محمد جان سے پڑھی تھیں میاں محمد جان بڑے جید عالم تھے۔ اُن کو حضرت محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف پر بہت عبور تھا۔ اور اُن کے فلسفہ کے پورے ماہر استاد تھے [۱] انہوں نے شاہ فخر الدین صاحب میں بھی امام اکبر کے فلسفہ کا درک پیدا کر دیا۔ ایک زمانہ میں شاہ فخر الدین صاحبؒ نے ابن عربیؒ کے فلسفہ وحدت وجود کی تشریح میں ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ امام اکبر کے باریک نکات کو عوام خاطر خواہ طریقہ پر نہ سمجھ سکیں گے اور پھر شارع کو بدنام کرنا شروع کر دیں گے، اپنے ارادہ سے باز رہے۔ [۲]

علاوہ ازیں شاہ فخر الدین صاحبؒ نے کتاب ہدایہ اپنے عہد کے دوسرے عظیم المرتبت بزرگ اور عالم حضرت مولوی عبد الحکیم صاحب سے پڑھی تھی۔ مولانا عبد الحکیم صاحبؒ اپنے زمانہ کے مشہور فقیہ تھے۔ ان کا توکل اور علمی تبحر دونوں مشہور تھے۔ تکملہ میں لکھا ہے۔

"بزرگے خوب عالم بود ...... در علم فقہ تمام مہارت داشت وہم توکل بدرجہ اتم بود" [۳]

اُن کے زہد و توکل کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات پاجامہ تک اُن کے پاس نہ ہوتا تھا اور ایک "نیمہ" میں گذر اوقات کرتے تھے۔ ایسے بزرگوں کی صحبت سے ظاہر ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب کو کس درجہ استغنا اور توکل کا سبق ملا ہوگا۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ نظام الدین صاحبؒ سے بھی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔ شرح وقایہ، مشارق الانوار، اور نفحات الانس اُن ہی سے پڑھیں ان تمام درسی کتابوں کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے دیگر علوم و فنون سے بھی واقفیت حاصل کی۔ طب اور تیر اندازی کے متعلق کتابیں پڑھیں۔ فنون سپاہ گری میں انہوں نے کافی مہارت حاصل کر لی۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے:-

---

[۱] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۰۶ [۲] فخر الطالبین ص ۷، [۳] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۰۶-۱۰۷

"ذات پاک کہ جامع جمیع علوم و فنون اند دریں فن (سپاہ گری) ہم مہارتے تمام داشتند" [1]

بیعت | آپ کے والد ماجد آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور آپ کی اصلاحِ باطن کی جانب خاص توجہ فرماتے تھے۔ چنانچہ بچپن ہی میں آپ کو اپنا مرید کرلیا تھا[2] شاہ نظام الدین صاحبؒ کے انتقال کے وقت شاہ فخر الدین صاحبؒ کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ باپ نے قاضی کریم الدین کے ذریعہ سے (کہ نسبت خویشی بہ آں جناب داشت۔ ص ۱۰) اپنے عزیز بیٹے کو قریب بلایا اور دیر تک اپنے سینۂ مبارک سے جو آئینہ سے بھی کہیں زیادہ بہتر تھا چپکا رکھ کر اپنی تمام باطنی نعمتیں بیٹے کے سینہ میں منتقل کردیں اور اُس کے بعد آپ کی روح پرفتوح عالم قدس کی طرف پرواز کرگئی۔[3]

شاہ فخر الدین صاحب نے ابھی تکمیل علوم نہیں کی تھی۔ باپ کے مرنے کے تین سال بعد تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔[4]

لشکر میں ملازمت | تعلیم سے فراغت پانے کے بعد، باپ کے سجادہ پر بیٹھنے کے بجائے آپ نے لشکر میں ملازمت کرلی۔ لیکن درویشی فطرت کا تقاضا تھا۔ اس لیے اس کو کسی طرح نہ ٹال سکتے تھے۔ اگر دن تیغ و سنان کی جھنکار دں میں گذرتا تھا تو رات رکوع و سجود میں۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب تمام تمام رات خیمہ میں عبادت کرتے رہتے تھے۔[5] آپ کو اس زمانہ میں اخفائے حال کی سخت فکر رہتی تھی آپ انتہائی سخت ریاضت اور محنت کرتے تھے لیکن کسی کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی جو لوگ آپ کی ظاہری حالت کو دیکھتے تھے وہ کبھی اس بات کا گمان بھی نہیں کرسکتے تھے کہ یہ شخص اس قدر روحانی مراتب طے کرچکا ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ آخری زمانہ میں اپنی سابقہ ریاضتوں کے متعلق فرمایا۔

"من در ایام سابقہ محنت در مشغولی ہم بسیار کردہ ام" [6]

---

[1] مناقب فخریہ ص ۲۱ [2] فخر الطالبین ص ۱۲ [3] مناقب فخریہ ص ۱۰ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۱۱ [6] فخر الطالبین ص ۱۲

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ آپ نے آٹھ سال تک رات دن مشقتیں اٹھائی تھیں۔[۱]
لشکر میں آپ نظام الدولہ بہادر ناصر جنگ اور ہمت یار خاں کے ساتھ رہتے تھے۔
مناقب فخریہ میں لکھا ہے :۔

"بہ صحبت نواب نظام الدولہ ناصر جنگ عم مغفور راقم عفی اللہ عنہ وہمت یار خاں غفر اللہ اوقات بسر بردند و فوج کشی ہا و شمشیر زنی ہا نمودند وصوم دائمی دراں حالات می داشتند" [۲]

لشکر میں گو آپ نے اپنے کمالات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ جب شہرت زیادہ ہوئی تو لشکر کو چھوڑ کر اورنگ آباد پہونچ گئے۔

اورنگ آباد میں قیام

اورنگ آباد پہونچ کر شاہ صاحب اپنے والد کے سجادہ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس زمانہ میں بھی آپ کا یہ اصول رہا کہ حتی المقدور اظہار حال سے گریز فرماتے اور اپنے روحانی کمالات کو پوشیدہ رکھتے۔ لیکن جس خانقاہ اور سجادہ سے آپ متعلق تھے وہاں اس کا اخفا کرنا آسان نہ تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو آپ کے کمالاتِ باطنی اور ریاضات شاقہ کا علم ہوا اور ساتھ ساتھ عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھنا شروع ہو گیا۔

"روز بروز شہرت در افزائش شد۔ آں حضرت دیدند کہ تمام ملک دکھن اشتہار شد۔ خواستند کہ بجائے دیگر عزم فرمایند وستر حال را بحال دارند" [۳]

لیکن اورنگ آباد چھوڑنا بھی اُن کے لیے آسان نہ تھا۔ جب وہاں سے روانگی کا ارادہ کرتے تو دل میں یہ خیال آتا کہ یہاں میرے والد اور مرشد کا مزار ہے۔ آخر کس طرح اس کو چھوڑ کر چلا جائں اس خیال کے بعد پھر ارادہ فسخ کر دیتے اسی کشمکش میں تھے کہ ایک رات کو آپ نے خواب میں اپنے والد شاہ نظام الدین صاحبؒ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا۔

شہ اقلیم فقرم بے خودی تخت روانستم نہ چوں فرہاد مزدورم نہ چوں مجنوں نمیدانم [۴]

---

[۱] فخر الطالبین ص ۱۱ [۲] مناقب فخریہ ص ۱۱ [۳] تکملہ سیر الاولیا ص ۱۰۹ [۴] ایضاً ص "

مولانا رومؒ کے اس شعر سے کچھ استقلال پیدا ہوا

بند بگسل باش آزاد اے پسر
چند باشی بند سیم و بند زر[۱]

ڈگمگاتے ہوئے ارادہ میں پختگی پیدا ہو گئی۔ آپ نے اورنگ آباد کو خیر باد کہنے کا تہیہ کر لیا۔

دہلی روانگی | ایک دن آپ اپنے دو ملازم قاسم اور حیات کے ساتھ اورنگ آباد سے پیادہ پا چل کھڑے ہوئے۔ یہ سنہ ۱۱۶۰ھ کا واقعہ[۲] ہے۔ اس سفر کا حال نظام الملک نے فخریۃ النظام میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے[۳]۔ دہلی میں ایک بڑھیا نے آپ کو اپنے یہاں ٹھیرایا یہاں مکان کے قریب ایک بت خانہ تھا۔ ہندو بھی آپ سے عقیدت مندی کا اظہار کرنے لگے[۴]۔ یہاں سے چلے تو قطب صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور وہاں کی مسجد میں معتکف ہو گئے[۵] پھر اپنے سلسلہ کے دیگر بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے حضرت شاہ کلیم اللہؒ صاحب کے مزار پر پہونچے۔ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کے فرزند نہایت محبت سے پیش آئے تین دن تک اُن کے مہمان رہے اس کے بعد کٹرہ پھلیل میں[۶] ایک حویلی کرایہ پر لے لی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے

"آں حضرت در کٹرہ پھلیل حویلی بہ کرایہ گرفتند و آں مکان بہ قدم ایں گلبن رعنا رشک افزائے گلزار شد و دراں محل شغل تدریس در پیش کردند"[۷]

یہاں بیعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ دور دور سے لوگ آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کا بیٹا اور شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کے سلسلہ کا بزرگ دہلی میں

---

[۱] مناقب فخریہ ص ۱۶ تکملہ سیر الاولیا ص ۱۰۹ فخر الطالبین ص ۱۲۱
[۲] "سنہ یک ہزار و یک صد و شش صد ہجری بود کہ آں حضرت بدولت اقبال داخل شاہ جہاں آباد شدہ بودند" [۳] مناقب فخریہ ص ۱۷، تکملہ سیر الاولیا ۱۰۹۔ "فخریۃ النظام" دستیاب نہ ہو سکی۔
[۴] مناقب فخریہ ص ۱۸ [۵] ایضاً ص ۲۰ [۶] شجرۃ الانوار میں اس کٹرہ کا نام بھولیل لکھا ہے۔
[۷] مناقب فخریہ ص ۲۰

غیر معروف نہیں رہ سکتا تھا۔ دہلی کے باشندے دونوں بزرگوں سے عقیدت وارادت رکھتے تھے۔ یہیں قیام کے زمانہ میں شیخ نور محمد صاحب مہاروی جنہوں نے اٹھارویں صدی میں سلسلہ چشتیہ کو پنجاب میں پروان چڑھایا، آپ کے حلقۂ مریدین میں شامل ہوئے[1] اُن کے علاوہ حافظ محمد قاسم جو بادشاہ شاہ عالم کے امام جماعت تھے اُن کے مرید ہوگئے[2]، مرزا حسین اکبر آبادی جو فنونِ سپاہ گری میں یگانہ روزگار تھے کھچ کر آپ کے قدموں میں آگئے اور مرید ہوگئے[3]

پاک پٹن کا سفر دہلی آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ شاہ فخر الدین صاحبؒ نے پاک پٹن کا سفر کیا۔ دکن سے روانگی کے وقت انہوں نے اجمیر شریف میں قیام کیا تھا۔ دہلی میں اپنے سلسلے کے سب بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہو چکے تھے۔ بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضری نہ ہوئی تھی۔ اس لیے پاک پٹن کا ارادہ کیا۔ پاک پٹن کا یہ سفر جس طرح سے پورا کیا وہ عقیدت وارادت کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے یہ تمام سفر پیادہ پا طے کیا اور ذوق وشوق کے اس عالم میں کہ پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں لیکن چلے جا رہے ہیں جب بالکل ہی مجبور ہو جاتے ہیں تو ٹھیرتے ہیں اور آبلوں پر مہندی لگاتے ہیں۔ ابھی پورا آرام نہیں ہوپاتا کہ پھر چل پڑتے ہیں۔

شاہ نور محمد صاحب اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھے۔ پاک پٹن سے کچھ دور ایک گاؤں میں رات کو دونوں ٹھیر گئے۔ صبح ہوئی تو شاہ نور محمد صاحب نے اپنے مرشد کو نہ پایا۔ تلاش کیا تو صرف نعلین مبارک پڑی ہوئی ملیں۔ بہت تشویش ہوئی آخر بڑی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ آپ پاک پٹن پہونچ چکے ہیں اور باباصاحبؒ کے احترام میں اپنی نعلین اس گاؤں میں چھوڑ گئے تھے۔[4]

پاک پٹن میں شیخ محمد یوسف صاحبؒ سجادہ نشین تھے انہوں نے نہایت محبت کا برتاؤ کیا۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ مزار کے قریب ایک حجرہ میں ٹھیر گئے اور مشغول ہوگئے۔ یہاں ہر شب کو ایک ہزار

---

[1] مناقب فخریہ ص ۲۰ [2] مناقب فخریہ ص ۲۱، شجرۃ الانوار [3] مناقب فخریہ ص ۲۱
[4] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۱۲ - ۱۱۱

رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے۔[1]

پاک پٹن سے جب واپسی ہوئی تو راستہ میں فرمانے لگے کہ دکن کی طرف سے دل میں کچھ تشویش سی پیدا ہو رہی ہے۔ چند ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ جن سے شاہ صاحبؒ کو روحانی تعلق تھا شہید کر دیے گئے۔[2]

دہلی کی واپسی پر شاہ صاحبؒ کچھ دن کٹرہ چھیلیل میں رہے اس کے بعد اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں تشریف لے گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔[3]

درس و تدریس شاہ فخر الدین صاحبؒ نے اجمیری دروازہ کے باہر کے مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اجمیری دروازہ کا یہ مدرسہ امیر غازی الدین خاں فیروز جنگ کا بنوایا ہوا تھا۔[4] اس مدرسہ میں بیٹھ کر آپ نے حقائق و معارف کے وہ دریا بہائے کہ بقول مصنف مناقب فخریہ:-

"......... سینہ ہائے کنوز حقائق و دلہائے معادن معارف گشت خفتگاں بیدار و بے ہوشاں ہوشیار گشتند و بے خبراں باخبر و بے اثراں با اثر گردیدند، دل مردگاں زندہ، دل زندگاں بسمل شدند، بازار عشق و محبتِ الٰہی گرم شد و دریائے ذوق و شوق موجہائے زد۔"[5]

آپ حدیث کا درس دیا کرتے تھے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا ذکر آپ کے درس کے سلسلہ میں متعدد جگہ آیا ہے[6] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاص طور سے احادیث کا بھی درس دیتے تھے۔ اس مدرسہ کا نظام کچھ اس طرح تھا کہ شاہ صاحبؒ جن لوگوں کو حدیث کا درس دیتے تھے وہ مدرسہ کے دوسرے طالب علموں کو معقول و منقول کی تعلیم دیتے تھے۔ سید احمد کے ذکر میں لکھا ہے۔

"خود صحیح مسلم در جناب اقدس تلمذ می کنند و در خدمت حدیث مشغول اند۔ و

---

[1] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۱۲۔ مناقب فخریہ ص ۲۴۔ ۲۳۔ [2] مناقب فخریہ ص ۲۵ [3] ایضاً
[4] ملاحظہ ہو "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" از مولوی ابوالحسنات ندوی ص ۲۸۔ ۲۷ [5] مناقب فخریہ ص ۲۷ [6] فخر الطالبین ص ۲۲۔ ۳۱۔ ۳۲ وغیرہ مولانا سید عبدالحی صاحب نے (باقی ص ۹۱)

"درس کتب معقول و منقول بہ شاگرداں می دہند و شب و روز مصروف بہ حکم مولانا در تعلیم و تعلم" [۱]

بعض خاص شاگردوں کو حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ ابتدائی کتابیں بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ میر بدیع الدین کو جو آپ کے بہت عزیز شاگرد اور مرید تھے آپ نے میزان سے لے کر صحیح بخاری تک پڑھائی تھی [۲] ایک مرتبہ آپ کتاب سفر السعادہ کا مطالعہ فرما رہے تھے اس کے بعض مقامات حاضرین کو بھی سناتے جاتے تھے۔ سناتے سناتے فرمانے لگے۔

"دریں ایام دل می خواہد کہ ایں کتاب را بہ شخصے از یاراں درس گویم۔ میر بدیع الدین خود بخاری می خوانند و سید احمد صحیح مسلم، بکر باید گفت" [۳]

آپ کے اس سوال پر مصنف مناقب فخریہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔

رمضان کے مہینہ میں علوم درسی کی تعلیم بند رہتی تھی۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا درس حدیث جاری رہتا تھا [۴] آخری دس دنوں میں یہ بھی موقوف ہو جاتا تھا کیونکہ شاہ صاحبؒ ان دنوں میں معتکف ہو جاتے تھے [۵]

شاہ فخر الدین صاحبؒ کے اس مدرسہ میں دور دور سے طلباء آتے تھے۔ اکثر مشہور مریدین آپ کے اس مدرسہ کے طلبا رہ چکے تھے۔ آپ کی تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر باطنی اصلاح کا رنگ غالب تھا سلوک کی تعلیم اس نصاب اور اس درس کا خاص حصہ تھی۔

حضرت شاہ عبد الرحمن صاحبؒ لکھنوی جب تحصیل علم کے لیے دہلی آئے تو سب سے پہلے شاہ فخر الدینؒ ہی کے مدرسہ میں پہونچے اور شاہ صاحب سے علوم ظاہر کی تحصیل کی درخواست کی شاہ صاحبؒ نے جواب دیا جمعیت خاطر کے ساتھ باقی کتابوں کو پڑھ لو علم حاصل ہو جائے گا

(بقیہ ص ۹۰) اس دور میں ہندوستان کا جو نصاب تعلیم متعین کیا ہے اس میں حدیث میں صرف مشکوٰۃ المصابیح کا نام ہے (الندوہ فروری ۱۹۰۹ء ص ۱۳) شاہ فخر الدین صاحب کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اور بخاری بھی بعض مدارس میں رائج تھیں۔ [۱] مناقب فخریہ ص ۳۲۔ [۲] فخر الطالبین ص ۳۱۔ [۳] ایضاً ص ۳۱ [۴] ایضاً ص ۴۸-۴۷ [۵] ایضاً ص ۴۸-۴۷

لیکن چونکہ یہاں سلوک اور علم باطن کے درس وتدریس پر زور زیادہ دیا جاتا تھا اگرچہ اس وقت مولانا کو علم ظاہر کی طرف رغبت زیادہ تھی اس لیے کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد وہ رام پور چلے گئے۔[۱]

جس زمانہ میں شاہ فخر الدین صاحبؒ اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں درس وتدریس میں مشغول تھے دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مدرسہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ کے مدرسہ میں تصوف کا رنگ غالب تھا اور سلوک وعلم باطن کی طرف زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ فتاوی عالمگیری کے مرتب (شاہ عبدالرحیمؒ) کے مدرسہ میں احسان وسلوک کے ساتھ ساتھ علم ظاہر پر خاص زور دیا جاتا تھا اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک زبردست انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

علمی ذوق شاہ فخر الدین صاحبؒ نے نہایت اعلیٰ علمی ذوق پایا تھا۔ بہت سا وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ کتابوں کا بے حد شوق تھا۔ حد یہ تھی کہ اگر قرض بھی ہاتھ آجاتی تھیں تو لے لیتے تھے۔ آپ کا ایک نہایت عمدہ کتب خانہ تھا۔ فخر الطالبین میں لکھا ہے۔

"مگر کتب ہا کہ حضرت صاحب بسیار دوست می دارند و اگر قرض ہم بدست آید خریدی فرمایند بفضل الٰہی اکنوں کتاب خانہ بسیار در سرکار است"[۲]

کوئی نہ کوئی کتاب آپ کے سامنے رہتی تھی۔ کبھی حدیث بیان فرماتے رہتے کبھی عوارف المعارف سناتے[۳] فوائد الفواد سے تو اس قدر عشق تھا کہ ہر وقت سینہ سے لگی رہتی تھی[۴]

اخلاق حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کا اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو جب تک اس کی مدد نہ کر لیتے چین نہ پڑتا۔ کسی شخص کو رنجیدہ یا ملول نہ ہونے دیتے تھے۔ ہر آنے والے کی دل جوئی کرتے تھے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ آپ کے پاس سے کوئی شخص رنجیدہ خاطر نہ جائے آپ کے

---

[۱] انوار الرحمٰن ص ۲۷ [۲] فخر الطالبین ص ۹۹ [۳] شجرۃ الانوار [۴] مناقب فخریہ ص ۳۳

اخلاق سے دشمن تک متاثر ہوتے تھے۔لوگ آپ کی جان لینے کی فکر میں جاتے لیکن جب آپ سے ملتے تو بقول مصنف مناقب فخریہ

اے برتر از سپہر و مہ و مہر جاہ تو
گردن کشاں مسخر تیر نگاہ تو[1]

آپ اپنے اخلاق سے لوگوں کو گرویدہ کرتے تھے۔ ایک افغانی آپ کی خانقاہ میں آیا اور آپ پر حملہ کیا۔ خدام نے ہاتھ پکڑ لیے۔ آپ نے فرمایا ہاتھ چھوڑ دو اور پھر اپنا سر مبارک زمین پر ڈال کر فرمایا "ما حاضریم ہرچہ بخاطر شماست بکنید"[2] وہ شخص اس وقت شرمندہ ہوکر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمیوں کو اور اپنے ساتھ لایا۔ اس کو دیکھتے ہی آپ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "صاحب بخیر و عافیت؟" ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ اخلاق کا وہ ہتھیار جو پہلی بار اچٹتا ہوا لگا تھا اپنا کام کر گیا اور ان لوگوں نے "سنگ ہائے حویلی" پر اپنے سر اور پیر کوٹ کوٹ کر معافی مانگی۔[3]

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحبؒ ہر بڑے چھوٹے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ علالت اور "امراض شدید" میں بھی آپ اسی طرح آنے والے کا استقبال کرتے۔[4] مصیبت میں ہر شخص کی دست گیری کے لیے تیار رہتے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بیٹے جب پریشانی میں مبتلا تھے تو آپ نے اپنی حویلی میں رکھا۔ لکھا ہے۔

"فرزندان شاہ ولی اللہ مغفور را در آنچہ متصدیان سلطانی از حویلی علیحدہ ساختہ حویلی را بہ ضبط آوردہ بودند آں حضرت بہ حویلی مبارک جا دادند و غم خواری فرمودند و حویلی مذکور را از جناب سلطان بہ ایشان دہانیدند و باعزاز و اکرام در آں جا رسانیدند"[5]

---

[1] مناقب فخریہ ص ۱۰ [2] و [3] ایضاً ص ۲۰ [4] ایضاً ص ۱۳ [5] ایضاً

لوگوں کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔ اگر کسی غریب کے یہاں کوئی تقریب یا غمی ہوتی تو کئی کئی بار تشریف لے جاتے اور اپنے مریدین و معتقدین کو ہدایت فرماتے کہ وہ وہاں جائیں تاکہ "خاطر او مطمئن شود و غم ازیں تفقدات کریمانہ برطرف گردد" [۱]

بیمار کی عیادت کرنی ہوتی تو یہی طریقہ اختیار فرماتے۔ خود کئی کئی بار جاتے اور اپنے مریدین کو ہدایت کرتے کہ وہ بار بار مزاج پرسی کے لیے جائیں [۲] ایک مرتبہ اکبرآباد کے ایک پرانے دوست مرزا غلام حسین علاج کی غرض سے دہلی آئے تو آپ نے اُن کی صدر رجہ نگرانی اور امداد کی ایک علیحدہ مکان سکونت کے لیے دیا۔ طبیب معالجہ کے لیے مقرر کیا اور کئی کئی بار خود ان کی مزاج پرسی کے لیے جاتے [۳]

جو لوگ روزانہ یا پابندی سے آنے والے تھے اُن کی غیر حاضری سے بہت پریشان ہوجاتے اور اُن کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے۔ دو روز پیرا خاکروب نہیں آیا تو بہت متفکر ہوئے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے تو فوراً اُسے دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ بہت محبت سے اس کا حال دریافت کیا۔ میر حسن حکیم کو علاج کے لیے مقرر کیا اور نقد انعام دینے کے بعد فرمایا:-

"میاں پیر محمد! شما کہ از دو روز نیامدید از فقیر کہ در پرسش احوال شما تاخیر واقع شد معاف خواہند فرمود" [۳]

اخلاق کی ان ہی بلندیوں کو دیکھ کر مناقب فخریہ کا مصنف بے اختیار پکار اُٹھتا ہے۔

بہ دہلی مظہر ماہ حجازی
تو گوئی نائب شاہ حجازی [۴]

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ دہلی کے ایک شخص نے اپنے زمانہ کے تین بڑے بزرگوں کے اخلاق کا امتحان کرنا چاہا۔ اس نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ فخر الدین صاحبؒ، اور مرزا مظہر جان جاناںؒ

---

[۱] فخر الطالبین ص ۴۲ [۲] ایضاً ۴۲ [۳] ایضاً ۴۲ [۴] مناقب فخریہ ص ۴۷۔ شجرۃ الانوار

کو مدعو کیا۔ تینوں بزرگ اس کے مکان پر پہونچ گئے۔ میزبان زنانے مکان میں کھانا لینے کے لیے گیا۔ کئی گھنٹہ بعد واپس آیا اور بیوی کی علالت کا عذر کر کر کچھ پیسے ان تینوں بزرگوں کو دیے۔ شاہ فخرالدین صاحبؒ نے یہ پیسے کھڑے ہو کر لیے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بیٹھ کر، مظہر جان جاناںؒ نے یہ کہہ کر کہ تم نے مجھ کو بڑی تکلیف پہونچائی۔

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخرالدین صاحبؒ نہایت صادق القول بزرگ تھے[1] وعدہ بہت کم کرتے تھے۔ لیکن جب کر لیتے تو "تا ایفائے آں بے قرار بودند"[2]

شیخی اور اظہار بزرگی سے آپ کو سخت تنفر تھا۔ جب کسی دعوت یا جلسہ میں تشریف لے جاتے تو لوگوں کو ساتھ چلنے کی اجازت نہ دیتے۔ اس سے نمائش ہوتی تھی اور یہ آپ کو پسند نہ تھی حکم تھا کہ لوگ علیحدہ علیحدہ منزل مقصود پر پہونچ جائیں۔[3]

کوئی آپ کی تعریف کرتا تو ناپسند فرماتے۔ کوئی مرید اگر ہاتھ باندھ کر یا گردن جھکا کر اداب تعظیم کا اظہار کرتا تو ناخوش ہوتے تھے[4] دعوتوں کو پسند نہیں فرماتے تھے لیکن کسی کی استدعا کو رد بھی نہ کرتے تھے اس لیے کہ "خوشی سائل را برخوشی خود مقدم دارند"[5]

جب کوئی شخص ملنے آتا تو نہایت بشاشت اور خنداں روئی کے ساتھ گفتگو فرماتے[6] اکثر "حضرت" یا "صاحب" سے خطاب کرتے تھے[7] جو شخص ملنے آتا اس سے اس کی فہم و ادراک کے مطابق گفتگو فرماتے۔

"گفتگوئے با ہر کس موافق اطوار و با عالم از علم و بہ سپاہی از سپاہ گری و با
ہوس از کیمیا"[8]

اسی خوبی کو بیان کرنے کے بعد مصنف مناقب فخریہ لکھتا ہے:۔

"یار ما چوں آب در ہر رنگ شامل می شود"[9]

---

[1] مناقب فخریہ ص ۳۴ [2] ایضاً ص ۳۳ [3] فخرالطالبین ص ۲۳۔ ۲۵ [4] مناقب فخریہ ص ۳۲
[5] فخرالطالبین ص ۲۳ [6] مناقب فخریہ ص ۲۳ [7]۔ [8] ص ۲۳۔ ۴۲۔ ۴۳۔ مناقب فخریہ

ایک مرتبہ آپ نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ میرے پاس لوگ مختلف خیال سے آتے ہیں بعض مجھ کو عالم جان کر آتے ہیں۔ بعض صوفی خیال کرتے ہیں۔ کچھ کیمیا گر سمجھتے ہیں۔ بعض میرے اخلاق کی وجہ سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ بعض اعمال کے لیے۔

"پس مرا ایں سلوک موافق اعتقاد ایشاں بہ ایشان است" [۱]

آپ تحکمانہ انداز میں یا قطعی طور پر کوئی بات نہ کہتے تھے۔ "چنیں باید کرد" کبھی آپ کی زبان سے نہ نکلتا بلکہ ہمیشہ یوں ہی فرماتے" وصلاح چنیں می نماید" [۲] کسی سے کوئی کام کرنے کو کہتے تو نہایت نرمی سے۔ لکھا ہے:۔

"بطور حکم ہرگز خطاب نہ فرمایند۔ بنوعی ارشاد می کنند کہ گویا شخصے محتاج در خدمت اغیار بعرض رساند" [۳]

اکثر ایسا ہوا کہ لوگ آپ کے کتب خانہ سے کتابیں چرا کرلے گئے۔ کوئی اجنبی شخص ان کو فروخت کرنے کے لیے بھی حضرت ہی کی خدمت میں آگیا تو کبھی آپ نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کتاب تمہیں کہاں سے ملی [۴] ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے کپڑے اور چاقو وغیرہ چرا کرلے گیا۔ چور کا پتہ چل گیا۔ لیکن آپ نے اس کے منہ پر قطعًا اس کا اظہار نہیں فرمایا [۵]۔ کشمیر کے صوبہ دار بلند خاں نے آپ کی خدمت میں اشرار روپیہ بطور نذر بھیجے۔ لانے والے نے صرف کرلیے۔ بلند خاں کو معلوم ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ صوبہ دار اس کو سزا دے آپ نے لکھ دیا۔ کہ اسی کی قسمت کے تھے اس سے کچھ نہ کہنا "قسمت او بود ہیچ نگوئید" [۶]

اخلاق کی یہ بلندیاں لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی تھیں اور اکثر اُن کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہوجاتا تھا۔

جب آپ دہلی تشریف لائے تھے تو ایک بڑھیا آپ کی خدمت کرنے لگی تھی جب

---

[۱] فخر الطالبین۔ ص ۱۴، [۲] مناقب فخریہ ص ۲۴ [۳] فخر الطالبین ص ۲۵ [۴] مناقب فخریہ ص ۲۶
[۵] ایضاً ص ۲۰ [۶] ایضاً

وہ مرنے کے قریب ہوئی تو اس نے اپنے بیٹے میر کلو کو آپ کے سپرد کیا۔ آپ نے اس کا بیحد خیال رکھا اور بیٹوں کی طرح اس کی پرورش کی۔ اور

"اور باوجود حرکات جوانانہ گاہے معاتب نشدند والیوم بکمال اعزاز است"[۱]

جس زمانہ میں شاہ صاحبؒ دہلی میں جلوہ افروز تھے وہ بڑی سیاسی بدامنی اور ہنگامے کا دور تھا۔ بڑے بڑے گھرانے تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ امیر غریب ہو گئے تھے۔ خاندان کا عزت و ناموس خاک میں مل رہا تھا۔ شاہ صاحبؒ کو ایسے گھرانوں کا خاص خیال تھا۔ اور اُن کی مدد فرمایا کرتے تھے۔ بھیک مانگنے والوں کو آپ زیادہ نہ دیتے بلکہ یہ فرما دیتے تھے کہ اگر میں ان کو نہ دوں گا تو کوئی دوسرا دیدے گا۔ دینا اُن کا ہے جو اپنی عزت اور ناموس کی وجہ سے بھیک نہیں مانگ سکتے اور فاقے کرتے ہیں۔[۲]

مریدوں کو آپ ہمیشہ یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص ہمیں بُرا کہے تو تم اُس سے مکابرہ نہ کرنا۔[۳]

آپ کی صحبت کے اثرات — شاہ فخر الدین صاحبؒ کی صحبت جادو کا اثر رکھتی تھی۔ جو آپ کی خانقاہ میں آجاتا تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا جس پر نظر پڑ جاتی وہ شکار ہو جاتا جرائم پیشہ لوگ پناہ تلاش کرنے خانقاہ میں آتے اور ولی بن کر نکلتے[۴] گردن کشاں، تکلیف پہونچانے کی نیت سے آتے اور حلقہ بگوش ہو جاتے۔ اُن کا سر پھوڑنے آتے خود اپنا سر پھوڑتے ہوئے جاتے جس طرف نظر اٹھ جاتی کام کر جاتی۔

این نگاہے است کہ سطح فلک درگذرد
پردۂ دل چہ بود پردۂ افلاک درد[۵]

ایک شخص ایذا دینے کی نیت سے آپ کے پاس آیا۔ لیکن یہاں آکر از خود رفتہ ہو گیا اور نعرہ لگانے لگا۔ "رہزن دل ہمین است"[۶] ایک قاتل اپنی جان بچانے کے لیے آپ کی خانقاہ میں

---

[۱] مناقب فخریہ ص ۔ ۸۴ [۲] فخر الطالبین ص ۵۵ [۳] ایضاً ۹۹ [۴] ایضاً ۶ [۵] مناقب فخریہ ۹۵ [۶] ایضاً ۵۰

آیا۔ چند ہی روز میں اس کا یہ حال ہو گیا کہ

"در ہر کہ نظر می کرد حالتش متغیر مے شد" [۱]

ایک مرتبہ دس افغانی آپ کو شہید کرنے کی نیت سے قطب صاحبؒ میں جمع ہوئے۔ لیکن جب نگاہیں ملیں تو عالم بدل گیا۔ مناقب فخریہ کے مصنف نے سچ لکھا ہے۔

نگاہت دشمناں را دوست کردہ — اثرہا در رگ و در پوست کردہ

کہ آرے خلیلے زبت خانہ — کنی آشنائے زبیگانہ [۲]

مناقب کا مصنف جب پہلی بار خود حاضر ہوا تھا تو ایسا محسوس کرنے لگا تھا۔

"گویا شرابے بود کہ در جام دل من ریختند و آتشے بود کہ در سینۂ من انداختند" [۳]

اتباع شریعت و سنت کی تلقین

جس وقت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے مسند ارشاد بچھائی تھی اس وقت بڑے بڑے بزرگ دہلی میں موجود تھے۔ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا ہے

"در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند" [۴]

لیکن کثیر تعداد ایسے صوفیوں کی تھی جو شریعت و سنت کو چھوڑ چکے تھے۔ اور اپنے نفس کو دھوکہ میں ڈال کر دوسروں کو گمراہ کر رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے ہدایت نامہ میں ایسے دھوکہ بازوں سے بچنے کی ہدایت کی تھی [۵] فخر الطالبین کا مصنف سید نور الدین فخری جو شاہ فخر الدین صاحبؒ کا مرید ہے لکھتا ہے

"بہر اہل اللہ ہر کس را کہ نصیب دست دہد قول و فعل او را قال اللہ و قال الرسول انگارد" [۶]

یہ بات نور الدین نے اس وقت لکھی ہے جب اس نے اپنے مرشد کو اس معیار پر پورا پایا۔ ملفوظات

---

[۱] مناقب فخریہ ص ۱۶ [۲] ایضاً ص ۵۰ [۳] ایضاً ۴۲-۴۳ [۴] ملفوظات شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ص ۱۰۷
[۵] ہدایت نامہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ [۶] فخر الطالبین ص ۲

میں جگہ جگہ اتباع سنت و شریعت کی تلقین ہے۔ خود شاہ صاحبؒ کا یہ عالم تھا کہ معمولی معمولی باتوں میں سنت کا خیال رہتا تھا۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے۔

"در امور جزوی و کلی اتباع سنت نبوی علیہ الصلوٰت والسلام و بہ بندگاں نیز درین امر تاکید اکید" [۱]

آپ کی وضع قطع، اعمال و افکار سب شریعت کے مطابق تھے۔ سید نور الدین کا بیان ہے:

"وضع و عمل ایشاں مطابق و تابع حدیث نبوی است صلی اللہ علیہ وسلم" [۲]

تقریر کرتے تو ہمیشہ شریعت کے مطابق۔ جامع ملفوظ کا بیان ہے۔

"تقریر خواجہ کہ عین شریعت واقع شد" [۳]

مسئلہ وحدت الوجود پر شاہ صاحبؒ کا ایمان تھا۔ لیکن اس کے متعلق بحث و مباحثہ اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ اس سے شریعت کے خلاف چند شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔[۴]

اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو بغیر سند کبھی نہ فرماتے۔[۵] نماز جماعت سے ادا کرتے اور اسی کی تلقین فرماتے "تقید جماعت بدرجہ اتم در خاطر مبارک است"۔ [۶]

معمولی معمولی باتوں میں اتباع سنت کا خیال رہتا تھا۔ برتن "مکان ضرور" اور وضو کے لیے علیحدہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے مریدین کو اس کی تلقین فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ہے وہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔[۷] ایک مرتبہ کھانے کے وقت بیٹھنے کے متعلق فرمانے لگے "میں جس طرح بیٹھا ہوں حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح بیٹھا کرتے تھے۔[۸] پھر لوگوں کو مسواک کی ہدایت فرمائی کہ اس پر حدیث شریف میں بہت اصرار کیا گیا ہے کہ جو شخص خواب سے بیدار ہو اُس کو مسواک کرنی چاہیے۔[۹] ایک مرتبہ

---

[۱] مناقب فخریہ ص ۴۰ نیز شجرۃ الانوار [۲] و [۳] فخر الطالبین ص ۱۳۲-۴ [۴] مناقب فخریہ ص ۴۴
[۵] فخر الطالبین ص ۱۴ [۶] ایضاً ۲۶ [۷] و [۸] و [۹] ایضاً ص ۱۰۰-۱۰۱-۱۰۱

خوشبو کے استعمال کی تلقین فرماتے ہوئے نہایت محبت آمیز لہجہ میں فرمایا "حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو بہت پسند تھی۔"[1]

ملفوظات وحالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے مریدوں کو اتباع سنت وشریعت پر مجبور کرتے تھے اور طرح طرح سے اس کے فوائد بیان کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنا قصہ بیان کرنے لگے کہ جنگ کے دوران میں بارود سے آنکھوں کو نقصان پہونچ گیا تھا اور ڈر تھا کہ بصارت بہت کم ہو جائے گی لیکن سرمہ کے استعمال سے بصارت میں زیادہ کمی نہیں ہوئی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ متابعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔[2]

ایک جگہ مریدوں کو ہدایت ہوتی ہے۔

"درودے کہ در حدیث شریف آمدہ ہموں را بخوانند بطرف چیز ہائے دیگر رجوع نہ کنند و بہ مذہب حنفی تعصب می کنند بطرف حدیث بسیار رجوع دارند"[3]

وفات سے کچھ پہلے کا ذکر ہے کہ ریش مبارک بڑھ گئی تھی۔ ملول ہو کر فرمانے لگے۔

"ایں ترک سنت از ما شد"[4]

فتنۂ سکھ اور شاہ صاحبؒ شاہ فخر الدین صاحبؒ کے زمانہ میں سکھوں کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہونچ گئی تھیں۔ دہلی کا ہر خاندان ہراساں اور پریشان تھا۔ بڑے بڑے خاندانوں کا عزت و ناموس خطرہ میں تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ صاحبؒ کے نام جو مکتوبات اس زمانہ میں لکھے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی پریشانی کس حد کو پہونچ گئی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

ایام بردٍ اتت فالقلب منجزع　　من قوم سکھ وان الخوف معقول

سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے　　سکھ قوم سے، اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے قتل وغارت گری کے یہ سب نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے

---

[1] و [2] و [3] فخر الطالبین ص ۱۰۰-۱۰۱ [3] ایضاً ص ۴۴ [4] شجرۃ الانوار

انسانی خون کی ارزانی دیکھ کر وہ خون کے آنسو روتے تھے۔ مسلمانوں کو ہراساں اور پریشاں دیکھ کر اُن کا دل تڑپنے لگتا تھا۔ اُن کو بادشاہ کی حالت پر غصہ آتا تھا کہ وہ ان فتنوں کے انسداد سے کیوں غافل ہے۔ آخر کو نہ رہا گیا اور ایک دن دربار میں بادشاہ سے کہہ اٹھے۔

"بہ تنبیہ آنہا (فرقہ سکھاں) باید پرداخت کہ فلاح دینی و دنیوی در ضمن آن است"[1]

بادشاہ کو ہدایت | چاروں طرف زوال و انحطاط، کشمکش و کشیدگی، ابتری و بربادی دیکھ کر شاہ صاحب مجبور ہو گئے کہ بادشاہ کو سمجھا دیں کہ امراء کے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے ملک ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اُسے نظام مملکت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ایک دن بادشاہ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"سلطان عصر تا بذات خود بہ امور ملک ستانی و ملک داری متوجہ نشود و اختیار محنت و مشقت نہ کند بند و بست بہ ہیچ وجہ صورت نمی گیرد"[2]

حکومت امیروں کے سپرد کرنے کے خطرناک نتائج سے اس طرح بادشاہ کو آگاہ کیا۔

"اگر امیرے مامور و مختار و نائب سلطنت نماید امرائے دیگر ناخوش می شوند و سر بہ طاعت او نمی نہند۔ و بے خبر بہ پے بردگی با سلطان می گردد۔ و رعب سلطان ہر کہ و مہ نمی ماند۔ و فوج بادشاہی کہ محتاج بہ آں امیر شد او را می شناسد و سر رشتۂ تعلق شاں از سلطان منقطع می گردد۔ و در دماغ امیر ہوائے انا ولا غیری می پیچد۔ و گاہ باشد کہ بر سر بغی می آرد۔ و در سلف اکثر ہم چنیں شدہ است"[3]

جس سیاسی بصیرت کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے بادشاہ کو خطرات سے آگاہ کیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی پیچیدگیوں اور زوال کے اصلی اسباب کو سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کو ہدایت فرماتے ہیں۔

پس اول مقدم این است کہ آں صاحب بذات خود مستعد محنت کشی و ملک گیری شوند[4]

---

[1] مناقب فخریہ ص ۳۶۔ تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۱۷ [2] و [3] ایضاً ص ۳۵-۳۶ [4] ایضاً ص ۱۱۷-۱۱۶

رشد وہدایت، اصلاح وتربیت کی جو آواز شاہ صاحبؒ نے بلند کی تھی وہ جھونپڑوں سے لے کر محلوں تک گونجی۔ اس کے اثرات کیا ہوئے۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ لیکن شاہ صاحب کی بے باکی اور جرأت کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا انہوں نے کلمۂ حق بلند کر کے اپنا فرض ادا کیا۔

شیعہ اور شاہ صاحبؒ | اس زمانہ میں شیعوں کا اقتدار ہندوستان میں نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ سادات بارہ اس وقت بادشاہ گر کا کام کر رہے تھے۔ ان کی سیاسی سازشوں نے اگر ایک طرف ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا تو دوسری طرف سنی علماء کے خلاف اُن کی کارروائیوں سے بڑے بڑے بزرگ تنگ آ گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفا" شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے "تحفہ اثنا عشریہ" شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے رسالہ رد روافض ان ہی ہنگاموں سے متاثر ہو کر لکھی تھیں۔

سنی علما پر بڑے بڑے مظالم کیے جا رہے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو دو مرتبہ چھپکلی کا ابٹن ملوا دیا گیا تھا۔ مظہر جانِ جاناںؒ کو شہید کیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح کی مختلف سازشوں نے پرامن زندگی کو ناممکن بنا دیا تھا۔

شاہ فخرالدین صاحبؒ گو ان ہنگاموں سے بہت دور تھے اور شیعوں کو مرید بھی کر لیتے تھے۔ لیکن وہ بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ایک واقعہ مناقب فخریہ میں اس طرح لکھا ہے کہ جن دنوں میں دشمنوں نے مرزا مظہر جان جاناںؒ کو شہید کیا میں ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا کہ ایک ایرانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک بڑے سنی عالم کو تو میں قتل کر چکا ہوں۔ لیکن ابھی جو سب سے بڑا سنی عالم ہے وہ باقی ہے۔ جلد ہی میں اُس کا کام تمام کر دیتا مگر کیا کروں اُس کے اردگرد مریدوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ میں اسے تنہا نہیں پاتا۔[1] اس کی اطلاع جب شاہ صاحبؒ کو دی گئی تو فرمادیا "حق تعالیٰ حافظ وناصر است"

[1] مناقب فخریہ ص ۵۵

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ باوجود اس قدر مخالفت کے ناامید نہ تھے اور شیعوں میں اپنا کام کرتے تھے۔ وہ انہیں مرید بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شاہ فخر الدین صاحبؒ سے کہ "بسیار محبت و بے تکلفی بود"۔ اس کی وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ اس طرح سے وہ تبرا سے باز آجاتے ہیں۔ "ازیں جہت از سب و تبرا باز می آیند"[1] اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ صاحبؒ نے اس طریقہ سے شیعوں پر بہت اثر ڈالا۔ ملفوظات شاہ فخر الدین صاحبؒ میں بعض ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جو شیعہ تھے لیکن آپ کی صحبت میں رہ کر سنی ہو گئے تھے۔ ایک شخص کے متعلق لکھا ہے۔

"پیش از ملاقات حضرت مولانا مذہب شیعہ داشت بغلظت تمام۔ الحال بفضل الٰہی تابع سنت است"[2]

امرا و سلاطین سے تعلقات

امرا و سلاطین سے تعلقات کے متعلق صدیوں پہلے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنے سلسلہ کے لوگوں کو ہدایت فرمائی تھی

لوارد تم بلوغ درجۃ الکبار فعلیکم بعدم الالتفات الی ابناء الملوک[3] "یعنی اگر تم بڑے اولیاء کے درجہ تک پہونچنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ بادشاہوں کی اولاد کی طرف توجہ نہ کرو۔

چشتیہ سلسلہ میں اس پر نہایت پابندی سے عمل کیا گیا۔ اور ہمیشہ بزرگوں کی یہ ہی کوشش رہی کہ امراء و سلاطین سے حتی المقدور بچا جائے اور ان کی مجلسوں سے گریز کیا جائے۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ بھی اس سلسلہ میں اپنے بزرگوں کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ امراء و سلاطین نے بارہا ان سے دیہات قبول کرنے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے قبول نہ فرمائی۔ فخر الطالبین کا مصنف لکھتا ہے۔

"از اغنیا ملاقات بکمال استغنا دارند"[4]

---

[1] ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ ص ۴۳-۵۷ [2] فخر الطالبین ص ۲۱ [3] سیر الاولیا۔ میر خورد ص ۶۸ [4] فخر الطالبین ص

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے ہرچند دیہات قبول کرنے کی درخواست کی لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

"ہرچند حضرت ظل سبحانی، امرائے مرید و معتقد تمنائے قبول دیہات نمودند قبول نہ فرمودند وارشاد کردند کہ اگر می خواہند کہ ما دریں شہر باشیم بار دیگر ایں حرف تمنائے بمیاں نیایند" [۱]

ایک دن بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قلعہ تشریف لے چلنے کی درخواست کی آپ تشریف لے گئے۔ وہاں مجبوراً آپ کو کھانا بھی کھانا پڑا۔ جب واپس آئے تو آپ نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ فوراً فقرا اور درویشوں کے مکانات پر تشریف لے گئے اور اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ [۲]

شاہ عالم بادشاہ کو آپ سے بے حد عقیدت تھی [۳] مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ آپ سے ملاقات کے لیے آیا کرتا تھا [۴]۔ عقیدت ومحبت کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحبؒ نے چند تبرکات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے غیاث گڈھ جانا چاہا تو بادشاہ نے نہ جانے دیا۔ ایک مرتبہ چلے گئے۔ جب واپسی کی خبر ملی تو شاہ عالم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے۔

"چوں حضرت ظل سبحانی شاہ عالم بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ خبر فرحت اثر آمدن حضرت مولانا صاحب شنیدند کمال سرور بخاطر گذرانید" [۵]

بادشاہ گل وشیرینی آپ کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا [۶] شاہی خاندان کو بھی آپ سے بے حد عقیدت وارادت تھی۔ شاہ عالم کی بہن خیر النسا بیگم آپ کی مرید تھیں [۷] نواب زینت محل والدہ شاہ عالم نے آپ کی خدمت میں ایک رتھ سواری نذر گذرانی تھی [۸]

---

[۱] مناقب فخریہ ص ۳۳ [۲] ایضاً ص ۳۵-۳۶ [۳] شجرۃ الانوار [۴] مناقب فخریہ ص ۳۳ [۵] شجرۃ الانوار [۶] فخر الطالبین ص ۱۰۹ [۷] شجرۃ الانوار

امرار و مشاہیر کی عقیدت کا بھی یہ حال تھا۔ فوج کے سینکڑوں سردار آپ کے مرید معتقد تھے۔ لکھا ہے "سرداران مغلیہ و ہندستان کہ ہمہ مریدان و مخلصان اند" [۱]

کشمیر تک سے صوبہ دار آپ کی خدمت میں نذر بھیجتے تھے [۲] لیکن آپ کی استغنا کا وہی عالم تھا۔ مجید الدولہ بہادر نے تین دن تک آپ کے لیے دعوت کا کھانا بھیجا۔ چوتھے دن حکم پہونچ گیا کہ دعوت صرف تین دن تک ہوسکتی ہے اور پھر کھانا نہ آنے دیا [۳]

نواب ضابطہ خاں مشہور سرداروں میں سے تھا۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے۔

"او در حسن اعتقاد مرید بود بے نظیر و در سعادت ازلی یکتائے روزگار بود" [۴]

شاہ صاحبؒ کا وہ نہایت مخلص مرید تھا اور بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ جب آپ غیاث گڈھ تشریف لے گئے تو اُس نے نہایت عقیدت و ارادت سے خیر مقدم کیا اور دیہات نذر گذرانے چاہے آپنے انکار کیا اُس نے اصرار کیا کہ مدرسہ کے درویشوں کے مصارف کے لیے قبول فرما لیجیے۔ پاؤں پر پڑ گیا۔ آپ نے پھر بھی قبول نہ کیا بلکہ یہ فرمایا کہ ان کی آمدنی حضرت خواجہ صاحبؒ اور سلطان المشائخ کی درگاہوں اور خادموں کے مصارف میں خرچ کی جائے۔ نیز شاہ جہاں آباد کے بعض مشائخ کو اس میں سے دے دیا جائے۔ [۵] شجرۃ الانوار کا مصنف لکھتا ہے

"سبحان اللہ زہے استغنا کہ مزاج مبارک بود یک جبہ برائے خود و یاران خود معین نفر مود" [۶]

ایک مرتبہ کسی نے بادشاہ کو ضابطہ خاں کی جانب سے بدظن کر دیا۔ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے بادشاہ کی ناراضگی کو دور کرایا [۷]

بہادر شاہ ظفر اور شاہ صاحبؒ

بہادر شاہ ظفر نے اپنے دیوان میں جگہ جگہ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ سے عقیدت و ارادت کا اظہار کیا ہے۔ ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کے

[۱] و [۲]، [۳]، [۴] ص ۴۰۔ ص ۳۸۔ ص ۴۳ ص ۴۱ [۵] مناقب فخریہ میں لکھا کہ ضابطہ خاں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بیٹوں کی مدد کرتا تھا۔ [۶] شجرۃ الانوار [۷] مناقب فخریہ ص ۴۳

سر پر دستارِ فضیلت بھی انہوں ہی نے باندھی تھی۔ ؎

کیوں نہ تو سر بفلک کھینچے کہ فخرالدیں نے دی ہے دستار ترے سر پہ کھینچ کے باندھ

ظفر نے حضرت شاہ صاحبؒ کو بچپن ہی میں دیکھا ہوگا اس لیے کہ شاہ صاحبؒ کا وصال ۱۱۹۹ھ میں ہوا تھا اور ظفر ۱۱۸۹ھ میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن عقیدت کا یہ عالم ہے کہ بار بار اس کا اظہار کرتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎ اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے کہ جو کچھ ہوں سو ہوں

لیکن اپنے فخرِ دیں کے کفش برداروں میں ہوں

؎ جو ہاتھ آئے ظفر خاکِ پائے فخرالدین تو میں رکھوں اسے آنکھوں کی توتیا کیلیے

؎ کوچہ فخرِ جہاں کی اے ظفر

خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے

؎ سچ تو ظفر یوں ہے کہ جز فخرِ دیں اور نہیں کوئی سہارا سب مجھے

؎ جو سمجھے کفشِ پائے فخرِ دیں کو تاجِ سر اپنا

پسند اُس کو ظفر کب افسرِ شاہانہ آتا ہے

؎ ظفر رکھتے نہیں مطلب جہاں کے نکتہ دانوں سے

ہمیں فخرِ جہاں کا ایک نکتہ سو برابر ہے[1]

اسلامی سوسائٹی کو درست کرنے کی کوششیں | شاہ صاحبؒ نے جس وقت مسندِ ارشاد بچھایا تھا اُس وقت اسلامیانِ ہند تنزل و انحطاط کی آخری حد پر پہونچ چکے تھے۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی۔ توہم پرستی میں ہر شخص گرفتار تھا۔ اعمال، تعویذ گنڈوں میں حد سے زیادہ اعتقاد تھا اور اس نے عمل کی طاقت کو سلب کر لیا تھا۔ زندگی جمود مرگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہر شخص ایک گونہ بے خودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔

مذہب سے ناواقفیت عام تھی۔ قرآن عربی میں تھا اس لیے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔

---

[1] اس موضوع پر ایک علیحدہ مضمون "بہادر شاہ ظفر اور شاہ فخرالدینؒ" میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

کتاب اللہ محض تبرک بن کر رہ گئی تھی مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ سورہ یٰسین کا فائدہ اور مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دم آسانی سے نکل جاتا ہے۔ یہ مذہب کی روح مردہ ہوجانے کی آخری اور حسرت ناک حد تھی۔ انہیں حالات کے پیشِ نظر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قرآنِ پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ ہر خاص و عام اس سے استفادہ حاصل کرسکے اور کتاب اللہ جو ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے صرف تبرک بن کر نہ رہ جائے۔

شاہ فخرالدین صاحبؒ بھی عوام کی اس ذہنیت کو دیکھ رہے تھے انہیں اس کا احساس تھا کہ مسلمان کس طرح تعلیمات اسلام سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں، چند رسوم کی پابندی کو وہ اسلام سمجھے بیٹھے ہیں صحیح تعلیم ان تک نہیں پہونچ رہی چنانچہ انہوں نے جمعہ کے خطبہ کو اردو میں پڑھنے کا مشورہ دیا۔

"پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی دریں مملکت خواندہ شود برائے چیزے کہ موضوع است حاصل می شود۔ الا برائے سائر الناس فائدہ ندارد کہ از زبان عربی واقف نیستند" [۱]

یہ سب باتیں اس لیے تھیں تاکہ عوام مذہب کی حقیقت و ماہیت کو سمجھ سکیں اور ان میں صحیح اسلامی روح پیدا ہوسکے۔

شاہ فخرالدین صاحبؒ کے زمانہ میں تعویذ گنڈوں کا بہت زور تھا۔ دنیادار صوفیوں نے اس کو اپنی روزی کا ذریعہ بنالیا تھا اور اس طرح مسلمانوں کے قوائے عمل کو شل کر رہے تھے شاہ فخرالدین صاحبؒ نے جب اس کے برے اثرات دیکھے تو لوگوں کو اعمال و وظائف بتانے سے گریز کرنے لگے۔ لکھا ہے

"آنحضرت را از خواستن اعمال نفرت کلی است" [۲]

جس کسی کو کچھ بتانا ہوتا تو خود مناسب موقع پر بتادیتے لیکن عام طور سے اعمال بتانے سے پرہیز کرتے۔ اگر مجبوراً کسی کو عمل بتانا پڑتا تو حدیث شریف سے بتاتے۔ لکھا ہے۔

---

[۱] فخر الطالبین ص ۷۴ [۲] مناقب فخریہ ص ۴۴

"اکثرے اعمال حضرت مولانا از حافظ جیو سند دارند و صحت حدیث شریف"

یہ حافظ جیو کون تھے۔ ان کے متعلق بھی سن لیجیے۔

"حافظ جیو شاگرد شیخ محمد طاہر خلف الرشید شیخ ابراہیم کردی بو دند و جامع فن حدیث" [۱]

آپ کی تلقین تھی کہ ہر شخص کو تابع رضائے خداوندی ہونا چاہیے [۲] سید نور الدین فخری نے آپ سے عمل پوچھا۔ فرمانے لگے میں پہلے ہی سے لوگوں کو عمل کم بتاتا تھا۔ فلاں شخص کو عمل بتانے کے بعد میں کسی کو نہیں بتاتا۔ اس نے عمل کا بے جا استعمال کیا۔ پھر فرمایا۔

"عمل شخصے را باید گفت کہ اگر کسے بسیار تصدیع دہد بلکہ بے حرمت کند تاہم از عمل در مقابلت نیاید و برخدا بگذارد" [۳]

شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا اور عوام کے خیالات کی اصلاح کی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاہ صاحب کے مرید ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کا ہر کام ہو جائے گا۔ آپ نے نہایت صاف طریقہ سے تنبیہ کی۔

"در کارخانہ خدائے مداخلت نکنیم۔ حق سبحانہ تعالیٰ ہر چہ خواستہ باشد بکند" [۴]

اس زمانہ میں لوگ مختلف طریقوں اور سلسلوں پر بیک وقت چلنے کی فکر کر رہے تھے اس طرح سے ہر سلسلہ کے روحانی نظام کی مرکزیت اور افادیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ آپ نے ان حالات کو دیکھ کر پھر ایک بار "یک در گیر و محکم گیر" کی آواز بلند کی۔ اور فرمایا۔

"کمال مرد ہمین است کہ در یک مذہب یا در یک طریق یا در یک

---

[۱] فخر الطالبین ص ۱۲۶ [۲] ایضاً ص ۱۲۷ [۳] ایضاً ص ،، [۴] ایضاً ص ۱۱۵

ر دستش در ہر چیزے کہ بباید داد او را بدہد و شئے دوم را در ان مخلوط نہ کند"[1]

نماز کی آپ کو خاص فکر رہتی تھی۔ "الصلوٰۃ عماد الدین" پر آپ کا ایمان تھا۔ مریدوں سے نماز کے متعلق پوچھتے تھے اور بچوں کو نماز سکھانے کی تاکید فرماتے تھے[2]

نظام سلسلہ اور تبلیغی مساعی حضرت شاہ صاحبؒ ہر شخص کو جو مرید ہونا چاہتا تھا اپنے سلسلہ میں داخل کر لیتے تھے[3] لیکن خلافت کے معاملہ میں آپ سختی برتتے تھے[4] ۱۱۹۹ھ میں آپ نے بیعت کرنے کی عام اجازت دیدی لیکن "بشرط اتباع سنت و عمل بر کتاب"[5]

تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کا وہی مسلک تھا جو حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ اور دیگر بزرگان سلسلہ چشت کا تھا۔ کہ ہندوؤں کو ذکر بتا دو اس انتظار میں نہ رہو کہ وہ پہلے مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا جائے اس لیے کہ "ذکر خود او را در ربقۂ اسلام خواہد کشید"[6]

اس زمانہ میں بہت سے ہندو خاموش طریقہ سے مسلمان ہوئے تھے بعض کا ذکر شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان صاف طور سے مخالفت کے ڈر میں نہیں کرتے تھے۔ اور یہ ڈر ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ شجرۃ الانوار میں ایک ہندو عورت کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کھلم کھلا مسلمان ہو گئی تھی اور اس کے بعد دہلی میں بلوہ ہو گیا۔ بدامنی یہاں تک پھیلی تھی کہ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے دہلی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب سے بہتر طریقہ یہی تھا کہ خاموش طریقہ سے اسلامی تعلیمات اور پیغام پھیلایا

---

[1] فخر الطالبین ص ۱۲ [2] ایضاً ص ۲۷-۲۶ [3] ایضاً ص ۵۹ [4] ایضاً ۸۲
[5] تکملہ سیر الاولیا ص ۱۲۱ [6] مکتوبات شاہ کلیم اللہ دہلویؒ

جائے۔ تاکہ کوئی عام مخالفت رونما نہ ہو۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظات میں بھی ایک ہندو اتم چند کا ذکر ہے وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا اظہار نہ کرتا تھا۔[۱] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام ان بزرگوں نے جو تبلیغ و اصلاح کے کام میں مصروف تھے اسی طرح سے اپنے کام کو انجام دیا۔

نورالدین فخری نے کئی ایسے ہندوؤں کا ذکر کیا ہے جو حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ لکھا ہے۔

"ہندوے آمد کہ از مدتے در طریقہ شامل شدہ است و نماز ہم باخفا می گذارد گویا از یاران است"[۲]

شاہ فخرالدین صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ اول مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا جائے۔

"مارا چناں معلوم است کہ از تعلیم نام خدائے عز و جل کوتاہی نباید کرد و در بند آں نباید شد کہ اول مسلم شود من بعد چیزے شغل کند۔ نام اثرہا است خود بطرف خدا خواہد کشید"[۳]

یہ وہی حکمت تھی جس کی تاکید شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے فرمائی تھی اور جس کی تاثیر اُن کے سلسلہ کے ہر بزرگ نے محسوس کی تھی اور اس پر عمل کیا تھا۔

وفات | حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ نے ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو وصال فرمایا[۴] آپ کی عمر اس وقت ۷۳ سال تھی۔ وصال سے ایک دن قبل زبان پر مثنوی کا یہ شعر تھا۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم
چشم بگذارم سراسر جاں شوم

---

[۱] ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ ص ۱۱۰ [۲] فخر الطالبین ص ۶۸ [۳] ایضاً ص ۶۹ [۴] شجرۃ الانوار

وصیت تھی کہ انتقال کے بعد جنازہ میڈھو خاں کے سپرد کر دیا جائے۔ میڈھو خاں آپ کے عزیز مرید تھے اور پہاڑ گنج میں رہتے تھے۔ حاجی محمد امین نے جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مرید تھے، آپ کو غسل دیا اور حضرت خواجہ قطب الدین صاحب میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔[1]

آپ کے مزار کے سرہانے یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اللّٰھم صل علیٰ محمد
و علیٰ آل محمد

بگذاشت فخر دیں چوں ہماں سرائے فانی — بر آستانہ جاوداں قطب جاودانی
سال وصال آں ماہ از غیب چوں بجستم — تاریخ گفت ہاتف خورشید دو جہانی
۱۱۹۹

من کلام سید الشعرا مقبول الٰہی ۱۲۱۸ھ

اولاد| حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کے ایک بیٹے تھے۔ اُن کا نام غلام قطب الدین تھا۔ وہ دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ صاحبؒ جب دہلی آئے تھے تو اُن کو اپنی بہن کے سپرد کر آئے تھے[2] شاہ فخر الدین صاحبؒ کے بعد غلام قطب الدین صاحبؒ ہی سجادہ نشین ہوئے۔ یہ بھی اپنے تقدس اور زہد کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ محمد اکبر شاہ اُن کا مرید تھا۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے۔

"حضرت ظل سبحانی محمد اکبر شاہ بادشاہ .... با اعتقاد تمام مرید آں فرزند رشید حضرت فخر صاحب گشتند و بعضے فرزندان و متعلقان خود را نیز مرید کنانیدند"

---

[1] شجرۃ الانوار ص۵۲ واقعات دار الحکومت دہلی۔ از مولوی بشیر الدین ج ۲ ص ۲۶۷

[2] ملفوظات شاہ عبد العزیز صاحبؒ

بہادر شاہ بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ غلام قطب الدین صاحب کا مرید تھا۔

شاہ غلام قطب الدین صاحبؒ کے بھی ایک بیٹے تھے۔ اُن کا نام میاں نصیر الدین تھا۔ اُن کو میاں کالے کہتے تھے۔ اُن کی حویلی گلی قاسم جان میں تھی جو اب احاطہ کالے صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ میاں کالے کے لڑکے میاں کمال الدین تھے۔ اُن کو اورنگ آباد بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں اُن کے لڑکے سیف الدین وغیرہ پیدا ہوئے۔ [1]

خلفاء ومریدین حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کے مرید نہایت کثیر تعداد میں تھے تکملہ سیر الاولیاء میں اُن کے تیس ۳۰ مشہور خلفاء ومریدین کے نام دیے ہیں۔ خاص طور سے آپ کے دو خلفاء بہت مشہور اور معروف ہیں۔ حضرت شاہ نور محمدؒ صاحب مہارویؒ۔ جنہوں نے پنجاب میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو فروغ دیا اور حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ جنہوں نے یو پی میں اس سلسلہ کو پروان چڑھایا آیندہ مضمون میں ان دونوں بزرگوں کے حالات بیان کیے جائیں گے۔

---

[1] میاں قطب الدین صاحبؒ کی اولاد کے یہ حالات سر سید راس مسعود کے ماموں نواب مصلح الدین صاحب نے خواجہ حسن نظامی صاحب سے بیان فرمائے تھے۔ (منادی ۱۲ر اگست ۱۹۳۶ء) خواجہ صاحب نے نواب صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ "اُن کی معلومات احوال قدیم کی نسبت ایسی ہے کہ دہلی میں کوئی شخص ان کی برابر پرانی باتوں کو نہیں جانتا۔"

بچوں کی تعلیم و تربیت
اسلامی تعلیمات اور نفسیات کی روشنی میں

سعید احمد

(۳)

بہر حال کوئی بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے نہ ولی پیدا ہوتا ہے اور نہ شیطان۔ اسلامی تعلیمات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور جدید نفسیات کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو فطرت سادہ لے کر آتا ہے۔ یہاں اُس کو جیسا ماحول ملتا ہے جیسی تعلیم اور تربیت ملتی ہے اُسی کے مطابق وہ ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ اور اُس کی یہ اثر پذیری اُس وقت سے ہی شروع ہوجاتی ہے جب کہ ہم اُس کو ایک جاندار کھلونا سمجھ کر اُس سے لطف اندوز ہوتے اور اُس کی باتوں سے خوش ہوتے ہیں اس بنا پر ہماری تعلیم و تربیت کا زمانہ بھی اسی وقت سے شروع ہونا چاہیے[۱]۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم (جلد سوم از صفحہ ۶۲ تا ۶۴) میں بچوں کی ادب آموزی اور

---

[۱] ایک حدیث جو عام طور پر مشہور ہے یہ ہے کہ "اگر تم پہاڑ کی نسبت سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اُس کی تصدیق کرلو لیکن اگر کسی کی نسبت یہ سنو کہ وہ اپنے خلق سے ہٹ گیا ہے تو اس کی تصدیق مت کرو" بالعموم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس حدیث میں اور حدیث ماسبق جس میں اس کا ذکر ہے کہ ماں باپ اولاد کو یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔ ان دونوں میں تعارض ہے۔ حالانکہ بات بالکل واضح اور صاف ہے۔ پہلی حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ بچہ کی فطرت بالکل سادہ ہوتی ہے۔ پھر ماحول سے وہ جو اثرات قبول کرتا ہے اُس کی طبیعت اُسی رنگ کو اختیار کرلیتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ماحول کا زائیدہ اور اُس کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ اور دوسری حدیث میں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ ایک شخص کسی خاص ماحول میں رہنے کے باعث جب کوئی اثر قبول کرتا ہے اور اس کی تکرار بار بار ہوتی ہے تو اب اُس کے نفس میں ایک (باقی برصفحہ ۱۱۲)

تربیت سے متعلق بڑی لطیف اور نکتہ ورانہ بحث کی ہے اس کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد ایک شخص جس نے جدید نفسیات کا بھی مطالعہ کیا ہو بآسانی یہ معلوم کرسکتا ہے کہ امام نے چند بلیغ فقروں میں ہی وہ سب کچھ کہدیا ہے جو آج ہمارے علمائے نفسیات کی برسوں کی تحقیقات اور دماغی کاوشوں کا ثمرہ ہے اور جس پر اُن کو بڑا ناز ہے امام کے ایک ایک فقرہ کا الگ الگ تجزیہ کرکے یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سا فقرہ نفسیات کے کس اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں آپ کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں۔ گذشتہ اوراق میں آپ جو کچھ پڑھ چکے ہیں اُن کی روشنی میں امام غزالیؒ کے یہ ارشادات پڑھ کر آپ خود اندازہ کرسکیں گے کہ امام نے چند فقروں میں ہی کیا کچھ کہدیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

اعلم ان الطریق فی ریاضۃ	یاد رکھو، بچوں کی تربیت وتعلیم میں اہتمام
الصبیان من اھم الامور	کرنا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ بچہ
والولد ھا والصبی امانۃ	اپنے ماں باپ کے پاس خدا کی ایک
عند والدیہ وقلبہ الطاھر	امانت ہے اور اُس کا پاک دل ایک
جوھرۃ نفیسۃ ساذجۃ خالیۃ	ایسے صاف وشفاف آئینہ کی مانند ہے

(بقیہ ص۱۱۳) کیفیت راسخہ پیدا ہوجاتی ہے۔ فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں ملکہ کہلاتی ہے پھر اسی ملکہ کو جس کے باعث نفس سے افعال کا صدور بآسانی اور بے سے کسی غور وفکر کے بغیر ہو" خلق" کہتے ہیں۔ اب غور کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ دونوں حدیثوں کا مطلب ایک دوسرے سے متعارض نہیں ہے۔ بلکہ پہلی حدیث میں جو بات کہی گئی ہے اُسی کا ایک پہلو دوسری حدیث میں بیان کردیا گیا ہے۔ اب رہا یہ اشکال کہ اس حدیث سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جب ایک انسان کا خلق اُس سے زائل ہوہی نہیں سکتا تو پھر پڑھنا پڑھانا۔ تعلیم وتلقین اور وعظ وارشاد سب بیکار ہوئے یعنی ایک خاص ماحول میں رہنے کے باعث اُس میں جو خلق پیدا ہوگیا ہے وہ ناقابل زوال ہے اور اب اس کے لیے کیسا ہی عمدہ اور بہتر ماحول پیدا کیا جائے اور اسے کیسی ہی تلقین رشد وہدایت کی جائے وہ سب بیکار رہے گا اور اُس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ملکہ جس کیفیت راسخہ فی النفس کو کہتے ہیں وہ اگرچہ بطی الزوال یعنی دیر میں زائل ہوسکنے والی کیفیت ہے لیکن اس کا زوال ناممکن نہیں ہے البتہ ہاں یہ ضروری ہے کہ مرض جس قدر زیادہ شدید ہو علاج بھی اسی قدر موثر، دیرپا اور طویل ہونا چاہیے۔ کسی غلط ماحول میں رہنے اور اعمال سیئہ کی (باقی برص۱۱۵)

عن كل نقش وصورة وهو
قابل لكل ما نقش ومائل
الى كل ما يمال به اليه فان
عُوِّدَ الخير وعُلِّمه نشأ عليه
وسعد فى الدنيا والآخرة
وشاركه فى ثوابه ابواه و
كل معلم له ومؤدب وان
عود الشر واهمل اهمال البهائم
شقى وهلك وكان الوزر
فى رقبة القيم عليه والوالى
له وقد قال الله عزوجل
يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا
اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا
ومهما كان الاب يصونه
عن نار الدنيا فبان يصونه
عن نار الآخرة اولىٰ

جو ہر نقش اور صورت سے خالی ہو اور
جس میں ہر نقش کو قبول کرنے اور جس
چیز کی طرف اس کو مائل کیا جائے اُس
کی طرف مائل ہونے کی پوری صلاحیت
ہو۔ چنانچہ بچہ کا حال بھی یہی ہے کہ اگر
اس کو بھلی اور اچھی باتوں کا عادی
بنایا جائے اور اُن کی تعلیم دی جائے
تو اُس کی نشو ونما انہیں چیزوں پر ہوگی
اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں نیک
بخت ہوگا اور اُس کے ثواب میں
اُس کے ماں باپ اور اُس کے تمام
معلم اور مودب سب شریک ہونگے
لیکن اگر بچہ کو بری باتوں کا خوگر بنایا
گیا اور جانوروں کی طرح اسے یوں
ہی چھوڑ دیا گیا تو بچہ بدبخت ہوگا اور
ہلاک ہو جائے گا اور اس کا وبال
بچہ کے سرپرست اور نگراں پر ہوگا۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے مومنو! تم اپنے
آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ۔

(بقیہ ص ۱۱۴) بار بار کی تکرار اور مزاولت کے باعث اگر کسی شخص میں کوئی برا خلق پیدا ہوگیا ہے تو ظاہر ہے کہ اُس کو
زائل کرنے کے لیے بڑی حذاقت کی بھی ضرورت ہے اور ثبات و استقلال کی بھی

توجب ادب آموزی کا تقاضا یہ ہے
کہ بچہ کو دنیا کی آگ سے بچایا جائے
تو اُس کو نارِ آخرت سے بچانا بدرجہ
اولیٰ تادیب کا لازمی فریضہ ہوگا۔

بچہ پر دودھ کے اثرات

علمائے نفسیات جب بچہ کی تربیت کے سلسلہ میں گھر کے ماحول اور دوسری چیزوں کا ذکر کرتے ہیں تو بچہ کے دودھ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور عام طور پر اُس کا ذکر بھی اڑا جاتے ہیں۔ لیکن امام غزالیؒ کی ژرف نگاہی اور دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ وہ بچہ کی شیرخوارگی کو بھی نظرانداز نہیں کرتے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

ینبغی ان یراقبہ من اول امرہ	بچہ کی بالکل شروع سے ہی نگرانی اور
فلا یستعمل فی حضانتہ	دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ اس بنا پر
وارضاعہ الا امرأۃ	بچہ کی تربیت اور اُس کو دودھ پلانے
صالحۃ متدینۃ تاکل	کے لیے ایک ایسی ہی عورت سے
الحلال فان اللبن الحاصل	کام لیا جائے جو نیک ہو۔ دیندار ہو
من الحرام لا برکۃ فیہ فاذا	اور حلال کھاتی ہو کیونکہ جو دودھ حرام
وقع علیہ نشو الصبی انعجنت	سے حاصل ہوتا ہے اُس میں برکت
طینتہ من الخبث فیمیل	نہیں ہوتی اور جب کسی بچہ کا نشوونما
طبعہ الی ما یناسب	ایسے دودھ سے ہوگا تو اُس کی طبیعت
الخبائث	کا خمیر ناپاکیوں سے تیار ہوگا اور
	اُس کی طبیعت انہیں کے مناسب
	چیزوں کی طرف مائل ہوگی۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ علمائے اسلام کے نزدیک دودھ پلانے والی عورت کا دینی اور

اخلاقی اعتبار سے نیک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ وہ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں روحانی او
اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ بچہ کی صحیح جسمانی نشو ونما اور اُس کے لیے مناسب اسباب
کی فراہمی پر بھی بڑا زور دیتے تھے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ "تندرست دماغ
ایک تندرست جسم میں ہی ہو سکتا ہے" اور کوئی قوم اس تنازع للبقاکی رزم گاہ میں اُسی
وقت بامراد اور کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ اُس کے بچے روحانی اور اخلاقی عظمتوں کے
ساتھ جسمانی اعتبار سے بھی سرفراز و بلند ہوں۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے بچہ کو دودھ پلانے کے
لیے ایک نیک عورت کی ضرورت کا جو اظہار کیا ہے۔ احیاء العلوم کے شارح علامہ سید
مرتضیٰ زبیدی اس کی شرح میں فرماتے ہیں

"اس دودھ پلانے والی عورت کی عمر پچیس ۲۵ اور پینتیس ۳۵ سال کے درمیان ہونی
چاہیے کیونکہ یہی عمر صحت و شباب کی عمر ہوتی ہے پھر اس کا رنگ بھی اچھا ہونا
چاہیے کیونکہ رنگ کا اچھا ہونا اعتدال مزاج کی دلیل ہوتا ہے۔ علاوہ بریں
اس عورت میں یہ اوصاف ہونے چاہییں کہ اُس کی جلد ملائم ہو۔ گردن مضبوط
ہو۔ سینہ چوڑا ہو نہ بہت فربہ ہو اور نہ بالکل دھان پان۔ پر گوشت ہو۔ مگر
چربی کا اُس پر غلبہ نہ ہو۔ اخلاقی اعتبار سے وہ پسندیدہ کردار رکھتی ہو۔ غم و غصہ
اور بزدلی وغیرہ اس قسم کے نفسانی انفعالات و تاثرات ردیہ کو جلد نہ قبول
کرتی ہو۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں مزاج کو فاسد کر دیتی ہیں" [۱]

یہاں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ امام غزالیؒ اور اُن کے شارح علامہ زبیدی نے یہ جو کچھ فرمایا
اُس میں وہ منفرد نہیں ہیں بلکہ خود احادیث نبوی میں اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حلیمہ سعدیہؓ سے جو بنو سعد کے قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں اور جو فصاحت
و بلاغت میں بڑا مشہور تھا، دودھ پیا تھا اور علی اختلاف الروایات آپ پانچ یا چھ برس کی عمر تک

---

[۱] اتحاف السادۃ المتقین ج ۷ ص ۳۶۳

یہاں رہے تھے۔ ایک روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں "میں تم سب سے زیادہ فصیح ہوں کیونکہ میں قریش سے ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے"[1] غور کیجیے اس حدیث میں اس بات کی طرف صاف اشارہ ہے کہ بچہ جس عورت کا دودھ پیتا ہے اُس پر اس عورت کی زبان و طرز گفتار تک کا اثر ہوتا ہے اور یہ اثر آخر عمر تک قائم رہتا ہے۔ اگرچہ بچہ اس عالم میں نہ ابھی پورے طور پر بول سکتا ہے نہ اپنا مافی الضمیر الفاظ کے ذریعہ کامل طریقہ پر ظاہر کر سکتا ہے اور نہ اس وقت الفاظ کا کافی ذخیرہ ہی اس کے دماغ میں محفوظ ہوتا ہے۔ اس حدیث کے علاوہ ایک روایت میں صاف طور پر کسی پاگل عورت سے بچہ کو دودھ پلوانے کی ممانعت بھی آئی ہے[1] اسی طرح کی ایک رواست حضرت عائشہؓ سے منقول ہے جس میں آپ فرماتی ہیں

"لاتسترضعوا الحمقاء فان | احمق عورت سے دودھ مت پلواؤ
اللبن یورث[2] | کیونکہ دودھ کے اثرات منتقل ہوتے ہیں

ماں باپ کے تعلقات کا اثر بچے پر شیر خوارگی کے بعد اب وہ منزل آتی ہے جس میں بچہ ایک خاص ماحول میں رہنے کے باعث گردوپیش کی اشیا سے اثرات قبول کرنے شروع کرتا ہے اور گویا اب اس کی آئندہ زندگی کے امیال و عواطف کی تشکیل اور اُس کی خاص صلاحیتوں کی تعمیر یا تخریب کی بنیاد پڑنے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس منزل میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ماحول کو درست اور صالح رکھا جائے۔ لیکن جس طرح ایک آراستہ کمرہ میں کسی ایک چیز مثلاً میز یا کرسی کی وضع اُس کمرہ کی دوسری اشیاء کی وضع کی نسبت سے ہی متعین ہوتی ہے اور اُس کمرہ کے آراستہ ہونے کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ وہاں کی ہر چیز اپنی اپنی موزوں اور مناسب جگہ پر رکھی ہوئی ہے اسی طرح ماحول کے درست ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ماحول جن جن چیزوں پر مشتمل ہے یعنی ماں باپ، بہن بھائی۔ گھر کے چھوٹے بڑے آدمی۔

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین۔ ج ۷ ص ۲۶۳ [2] الروض الانف للسہیلی ج ۱ ص ۱۰۹

وہ سب اپنے طور وطریق، بود وباش اور رفتار وگفتار میں ایسے اصول پر عامل ہوں جن کو محسوس کرکے اچھے اثرات قبول کیے جاسکیں. اگر کسی بچہ کے ماں باپ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں آئے دن اُن میں تخ تخ اور تھکا فضیحتی رہتی ہے. بیوی شوہر سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی اور شوہر بیوی کو نظر میں نہیں لاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میاں بیوی کی زندگی ہی اجیرن نہیں ہوگی بلکہ ننھے اور معصوم بچہ کی صحت بھی متاثر ہوگی اور اُس کا دماغی سکون و اطمینان نفسیاتی کشمکش کا شکار ہوجائے گا۔ اُس کو ماحول کے اس تکدر سے صدمہ ہونا ناگزیر ہے اگرچہ وہ نہ یہ کسی کو بتا سکتا ہے اور نہ خود جان سکتا ہے کہ اسے یہ دکھ کیوں ہورہا ہے۔

والدین کی باہمی تخ تخ تو بڑی بات ہے. علمائے نفسیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ماں باپ کے دل پر اگر غم اداسی۔ مایوسی وناکامی اور فکر وتشویش کی بھی کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے تو بچہ بھی اس سے متاثر ہوتا اور اُس کا دکھ اندرونی طور پر محسوس کرتا ہے بلکہ بچہ کو اس سے جو اذیت ہوتی ہے وہ ماں باپ کو بھی نہیں ہوتی اُس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ماں باپ کو اپنے رنج وغم اور فکر وتشویش کا سبب معلوم ہوتا ہے اور بچہ اس سے ناواقف ہوتا ہے اس بنا پر اُسے اندرونی طور پر ایک نامعلوم السبب سی الجھن اور خلش ہوتی ہے. اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بچہ جب اپنی موجودگی میں بھی ماں باپ کو متفکر غمگین اور اداس دیکھتا ہے تو غیر شعوری طور پر اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اُس کے ساتھ پوری دلچسپی نہیں لیتے اور انہیں اُس کے ساتھ غیر معمولی محبت نہیں ہے اس غیر شعوری احساس کے باعث بچہ میں ماں باپ کے متعلق یک گونہ احساس بیگانگت ومغائرت پیدا ہوجاتا ہے اور اگر ماں باپ کے رویہ میں تبدیلی پیدا نہ ہونے کے باعث اس احساس کو پرورش پانے کا موقع ملے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ میں نقل اثر (

) کے اصول کے مطابق آخرکار ایک طرح کا ضغطۂ دماغی پیدا ہوجاتا ہے جس کو علمائے نفسیات ( ) کہتے ہیں یا اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بچہ

تصادم ذہنی ( ) کا شکار ہو جاتا ہے اور اُس کی مثال علم النفس کی اُس ایک روایتی عورت کی سی ہو جاتی ہے جو بدقسمتی سے ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا تھی اور اسی عالم میں وہ ایک مرتبہ خودکشی کرنے کے خیال سے اپنے بالائی مکان کی کھڑکی ایک ہاتھ سے کھول رہی تھی تو ساتھ ہی اپنے دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت و قوت کے ساتھ کھڑکی کو بند رکھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

ایسے لڑاکا غم پسند یا تشویش پرور والدین کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی زندگی ہی برباد نہیں کرتے بلکہ چمن ہستی کے نوزائیدہ غنچوں میں بھی ایک ایسا گھن اور بس پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو مناسب اور موزوں طریقہ پر نشو و نما پانا نصیب نہیں ہوتا۔ ینگ ( ) نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اپنے لکچرز میں متعدد مثالیں دی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک خوردسال بچی جس کی عمر نو برس تھی بیمار ہو گئی۔ اسے بخار رہنے لگا بھوک غائب ہو گئی۔ اُس نے اسکول جانا ترک کر دیا۔ مہینوں اس بچی کا علاج معالجہ کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا اور نہ کسی ڈاکٹر کو بیماری کا سبب ہی معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ اصلی سبب یہ تھا کہ بچی کے والدین میں باہم نا اتفاقی تھی۔ اگرچہ وہ دونوں بچی سے یکساں محبت کرتے تھے اور اس بات کا خیال بھی رکھتے تھے کہ اُس کے سامنے اپنی باہمی ناراضمندی اور تعلقات کی ناخوش گواری کا اظہار نہ ہونے دیں۔ ماں شوہر سے طلاق لینا چاہتی تھی لیکن بچی کے خیال سے اس خواہش کا اظہار نہ کرتی تھی۔ آخر جب بچی کی حالت روز بروز گرتی ہی چلی گئی تو تحلیل نفسی کے ایک ماہر نے بچی کے والدین سے کہا کہ آپ دونوں کو یا تو اپنے تعلقات خوش گوار کر لینے چاہییں ورنہ پھر بہتر یہ ہے کہ باہمی تفریق اختیار کر لیجیے۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی تو بچی کی جان خطرہ ہے وہ اندرونی کشمکش اور خلش پنہانی کو برداشت نہ کر سکے گی اب ماں باپ نے تفریق اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ بچی پر اس کا اثر یہ ہوا کہ والدین کی نا اتفاقی اور تعلقات کی بدمزگی کے باعث وہ ہر وقت جس مبہم خوف و ہراس

دوچار رہتی تھی اب اُس کو اُس سے نجات مل گئی اور والدہ کی توقع کے برخلاف اُس کی صحت یکایک بہتر ہوگئی اور اُس نے اسکول جانا اور کھیلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔[1]

ڈاکٹر مسانی کا بیان ہے کہ اسمتھ کالج نیویارک کے چند گریجویٹوں نے جن میں ایک خاتون مس ہیلن وٹمر اور دوسرے طلبا شریک تھے ایک سو ستانوے بچوں کے حالات کی تحقیق کی جو بچوں کے دار الحفاظت ( ) میں داخل کیے گئے تھے خوب اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد یہ لوگ اس نتیجہ پر پہونچے کہ بچوں کی کامیابی یا ناکامیابی پر دوسری چیزوں مثلاً خاندان کی پوزیشن، والدین کی اقتصادی حالت آب وہوا، ذہانت، اسکول اور تعلیم وغیرہ کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ اُن کے والدین کے باہمی تعلقات کی خوش گواری یا ناخوش گواری کا ہوتا ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ جن بچوں کے والدین آپس میں میل ملاپ اور پیار و محبت سے رہتے تھے وہ جسمانی اور دماغی اعتبار سے زیادہ تندرست اور کامیاب تھے۔

اسی طرح ایک اور محقق مسٹر ہالی (Hall) نے ایک مرتبہ ایک ہزار بچوں میں سے سو بچوں کا انتخاب کیا۔ جن میں سے پچاس بچے ایسے تھے جن کے ماں باپ کے باہمی تعلقات بڑے خوش گوار تھے اور اُن کے برخلاف پچاس بچے ایسے تھے جن کے والدین نااتفاقی اور بدمزگی کی زندگی بسر کرتے تھے ان سب بچوں کے حالات اور اُن کے امراض وشکایات کا ایک عرصہ تک عمیق نظر سے مطالعہ کرنے اور اُن کے اسباب کا سراغ لگانے کے بعد مسٹر ہال اس نتیجہ پر پہونچے کہ جن بچوں کے والدین باہمی اتحاد و اتفاق سے نہیں رہتے تھے ان میں ۹۸ فی صدی بچے بعض امراض کا شکار تھے۔

فارسی کا ایک مصرع مشہور ہے " افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را " یہ مصرع دوسرے ارباب انجمن کے حق میں درست ہو یا نہ ہو لیکن علمائے نفسیات اور خصوصاً فرائڈ

[1] ایضاً

اور ینگ کے نزدیک یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ والدین اپنی ازدواجی زندگی میں ناشاد و نامراد ہوکر اپنی انجمن ہستی کی رونق کو جسے عرف عام میں بچے کہتے ہیں ضرور بے آب و مکدر کر دیتے ہیں۔

جو بچے ایسے ناخوش گوار ماحول میں پرورش پاتے ہیں اُن کی صرف صحت ہی ناقص نہیں ہوتی بلکہ دماغی اور نفسیاتی تاثرات کے باعث اُن میں مختلف قسم کے جرائم یا کم از کم اخلاق سے گری ہوئی متعدد عاتوں کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے عام طور پر چڑچڑے مزاج کے ہوتے ہیں۔ بات بات پر ماں باپ سے، بہن بھائیوں سے اور آس پاس کے ہم عمروں سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یا ایسے بچے چپ چپ اور خاموش رہتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر ایک گونہ افسردگی یا حیرانی کی کیفیات طاری رہتی ہیں۔ کسی کام کو دلجمعی یا حاضر حواسی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ اُن کی فطرت غم پسند اور ان کی طبیعت رنج طلب بن جاتی ہے۔ وہ والدین سے اتنی محبت نہیں کرتے جتنا کہ اُن سے ڈرتے ہیں اور بچپن میں اس ڈر کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جوان ہو کر اُن کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہندوستانی گھرانوں میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ شادی کے بعد لڑکے کے تعلقات اپنے والدین سے خوش گوار نہیں رہتے۔ اس قسم کے واقعات میں غریب بہو خواہ مخواہ بدنام ہوتی ہے کہ اُس نے آکر بیٹے کو والدین سے الگ کر دیا۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ بیٹے میں والدین سے جدا ہو جانے کا رجحان پہلے سے موجود تھا۔ مگر وہ اس کے اظہار کی جرات نہیں کرتا کرتا تھا اب بہو نے آکر صرف یہ کیا ہے کہ اُسی رجحان کو تیز اور شدید کر کے اُس کے اظہار کی جرأت بھی پیدا کر دی ہے۔

(باقی آئندہ)

ادبیات
ایشیا

کلیم ایشیا،
ابوالکلام آزاد کے نام

جناب روشن صدیقی

مسند آرائے بہار بے خزاں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا
زندگی کی نکہتوں کا رازداں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا

صبح نو ہے عالم مشرق میں سرگرم ظہور — ناشکیب و ناصبور
گام زن ہیں وادیوں میں کاروانِ رنگ و نور — جنتِ نزدیک و دور
بڑھ رہا ہے خود قدم بوسی کو منزل کا غرور — مرحبا! عزمِ غیور
خود مرادِ کارواں، خود کارواں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا

زینتِ آغوش بیداری ہیں، آزادی کے خواب — بے نقاب و بے حجاب
ہر قدامت اک تغیر، ہر سکوں اک انقلاب — گام گار و کام یاب

منتشر، پامال، اوراقِ کتابِ احتساب خود سوال و خود جواب
زندگی میکش ہے، اور پیرِ مغاں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا

۳

دانشِ مغرب نے سمجھا جس کو نقشِ بے ثبات گردِ راہِ حادثات
آج ہے وہ ایشیا، نورِ ضمیرِ کائنات چہرہ افروزِ حیات
جس کے پرتو سے درخشاں ہے جبینِ ممکنات ہاں وہی خضرِ نجات
فکرِ انساں کی بلندی کا نشاں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا

۴

ایشیا کوہِ گراں ہے گر وہیں باطل پسند کیا غمِ سود و گزند
ایشیا کو چھو نہیں سکتی حوادث کی کمند اے ندیمِ دردمند
ایشیا ہے زندگی کی عظمتوں سے ارجمند برتر از پست و بلند
خود زمیں ہے اور خود ہی آسماں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا

۵

ایشیا منت گزارِ دانشِ حاضر نہیں اے نگاہِ نکتہ چیں
ایشیا ہے جلوہ گاہِ علم و عرفان و یقیں روشنی کی سرزمیں
ایشیا ہے خاکِ پائے رحمۃ للعالمیں مکتبِ روح الامیں
خود مشیت نازفرما ہے، جہاں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا

۶

ایشیا ہے الفتِ یزداں کا لافانی پیام فطرتِ انساں کے نام
ایشیا میں عام ہے قدرت کا فیضانِ تمام بے گمان و لاکلام
فرض ہے انسانیت پر ایشیا کا احترام ایشیا تجھ پر سلام
عالمِ انسانیت کا پاسباں ہے ایشیا
جاوداں ہے ایشیا
مسند آرائے بہارِ بے خزاں ہے ایشیا
زندگی کی نکہتوں کا رازداں ہے ایشیا

تبصرے

محمد بن عبدالوہاب از مولانا مسعود عالم ندوی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۲۷۔ طباعت وکتابت بہتر۔ قیمت ۱۲ ؏ پتہ :۔ دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام پر ایک عام انحطاط طاری تھا۔ اصل اسلامی تعلیمات کی روح یکسر مفقود ہو چکی تھی۔ ہر جگہ بدعات و رسوم واہیہ کا رواج تھا اور انہیں کو اسلام سمجھا جاتا تھا۔ سرزمین نجد کا علاقہ بھی اس عام وبا سے محفوظ نہ تھا۔ اسی زمانہ میں نجد میں شیخ محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملک میں توحیدِ خالص کی ترویج و اشاعت اور بدعات و رسوم کا قلع قمع کر دینے کا عزم بالجزم کر کے اپنی زندگی ہی اس کے لیے وقف کر دی۔ چنانچہ اس راہ میں انہوں نے قلم اور تلوار دونوں سے کام لیا اور سخت ترین دشواریوں اور مصیبتوں کے باوجود وہ اپنا کام عزم و استقلال سے کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آلِ سعود کا حکمراں خاندان شیخ محمد بن عبدالوہاب اور اُن کی تحریک کا پشت و پناہ بن گیا اور اس بنا پر یہ دعوت نجد اور اُس کے اطراف و اکناف میں بڑی شدت سے پھیل گئی اس میں شبہ نہیں کہ شیخ کی تحریک خالص اصلاحی اور مذہبی تھی لیکن خود شیخ اور پھر اُن کے اتباع سے چند ایسی بے اعتدالیاں ہوئیں جنہوں نے اس تحریک اور اُس کے بانی سے متعلق نجد کے علاوہ دنیائے اسلام کے دوسرے گوشوں میں بیزاری پیدا کر دی یہ بیزاری اتنی شدید تھی کہ اُس نے اصلی تحریک و دعوت کی بنیادی اچھائیوں پر بھی پردہ ڈال دیا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ حرمین شریفین کے علما اور اشراف مخالف ہو گئے اور آل سعود میں اور اُن میں متعدد رزم آرائیاں ہوئیں اور آخر کار مصری حکومت بھی میدان میں آئی اور ان سب نے آل سعود کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ آل سعود کے سیاسی اقتدار کے ختم ہوتے ہی یہ تحریک بھی ماند پڑ گئی۔ لائق مصنف نے

انہیں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے حالات وسوانح اُن کی دعوت اور اُس کے اثرات ونتائج پر بڑی تحقیق اور برسوں کی محنت شاقہ کے بعد عربی اور انگریزی کے موجودہ مآخذ کی روشنی میں یہ کتاب لکھی ہے اردو میں اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے لیکن افسوس ہے کہ خود مصنف سے متعدد مقامات پر علمی تسامح بھی ہوا ہے مثلاً (ص ۱۷۳ - ۱۷۴ پر) وہ لکھتے ہیں "محمد بن اسماعیل الامیر یمنی بت پرستوں اور قبر پرستوں کے درمیان بالکل فرق نہیں کرتے۔ شوکانی نے ان کا رجوع نقل کیا ہے اور عباد قبور پر اس تشدد کی سخت مخالفت کی ہے" عجیب بات یہ ہے کہ مصنف نے اس عبارت کے لیے الدر النضید ص ۵۳ - ۴۰ کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اسی کتاب کے صفحہ ۴۹ تا ۵۰ پر یہ صاف لکھا ہوا ہے کہ امیر اسماعیل یمانی قبر پرستوں کی تکفیر نہیں کرتے اور اُن میں اور بت پرستوں میں تفریق کرتے تھے اُن کے نزدیک قبر پرستی صرف کفر عملی تھا۔ لیکن قاضی شوکانی نے (الدر النضید ص ۵۳) پر اس مسلک کی سخت تردید کی ہے اور وہ قبر پرستی کو عملی واعتقادی دونوں قسم کا کفر مانتے ہیں۔ جناب مصنف نے الدر النضید کے بیان کے بالکل برعکس لکھا ہے۔ علاوہ بریں "صیانۃ الانسان" نامی کتاب کو مصنف نے عام روایت کے مطابق مولانا محمد بشیر سہسوانی کی تالیف بتایا ہے (ص ۲۱۳ - ۲۱۰) حالانکہ صحیح یہ ہے کہ اس کے مصنف عبداللہ بن عبدالرحمن السندی ہیں چنانچہ اس کے جواب میں جو کتاب "القول المجدی" لکھی گئی تھی اُس کے پورے نام سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے ان علمی مسامحات کے علاوہ مصنف نے تصوف۔ اور "ہندی اسلام" اور اس سلسلہ کے زعما پر جو جا وبیجا طنز کیا ہے اُس سے کتاب کا علمی وقار مجروح ہو گیا ہے اور آخر میں ہمیں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ لائق مصنف نے صفحہ ۸۰ پر حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی رائے شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے متعلق نقل کر کے اُس پر جو استعجاب ظاہر کیا ہے وہ بھی ان کے جوش ناروا کی دلیل ہے کیونکہ شیخ کا ایک بلند پایہ مصلح ہونا مسلّم لیکن کتاب التوحید کے مصنف کی نسبت حضرت الاستاذ ایسے حبر نحریر کی رائے علمی اور فنی حیثیت سے وہی ہو سکتی تھی جو انہوں نے ظاہر کی۔

وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم از مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی۔ تقطیع خورد ضخامت ۴۸ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں۔ پتہ۔ کتب خانہ انعامیہ دریبہ کلاں دہلی۔

یہ کتاب دراصل اُن تقریروں کا مجموعہ ہے جو فاضل مصنف نے سیرت النبیؐ کے متعدد جلسوں میں کی تھیں

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تقریروں کا اصل موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کے آغاز سے کر وفات تک کے تمام حالات کا بیان تھا لیکن تقریروں اور خصوصاً مواعظ میں یہ ہوتا ہی ہے کہ اشی باشی یذکر کے مطابق نفس موضوع کے علاوہ اور مختلف چیزیں بھی سلسلہ کلام میں مذکور ہو جاتی ہیں چنانچہ ان تقریروں میں بھی اصلی موضوع کے علاوہ اور بہت سے مسائل مثلاً حضرت عیسیٰ کا بچپن میں ہی نبی ہونا، عالم آخرت میں اعمال کی شکل، انکار حدیث، موت کا فلسفہ، دنیا کی تباہ شدہ قومیں، موجودہ تہذیب کی منزل مقصود وغیرہ زیر بحث آگئے ہیں۔ بہرحال روایات مستند اور زبان موثر ہے اس کے مطالعہ سے سیرت نبوی کے مختلف گوشوں اور اسلامی عقائد و اعمال کے متعدد پہلوؤں کی نسبت صحیح معلومات حاصل ہوں گی۔

شیطان | مترجمہ حکیم حبیب اشعر صاحب دہلوی۔ تقطیع خورد ضخامت ۴۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ:۔ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو دہلی۔

جبران خلیل جبران عربی زبان کا مشہور اور صاحب طرز ادیب ہے، اس کی بعض کتابوں کے اردو تراجم لاہور اور دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے اردو خواں طبقہ کے لیے یہ نام نامانوس نہ ہونا چاہیے۔ یہ کتاب موصوف کے ہی دس دلچسپ اور پر لطف افسانوں کا مجموعہ ہے۔ حکیم اشعر صاحب جبران کے کامیاب اردو مترجم کی حیثیت سے اب مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے اس تازہ ادبی کارنامہ میں بھی اُن کے ترجمہ کی خصوصیات یعنی زور بیان، شگفتہ زبان اور اصل کا سا کیف و اثر یہ سب موجود ہیں۔ امید ہے افسانوی ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے "شیطان" "ریحانہ" اور "خاکستر" یہ تین افسانے زبان کے علاوہ ٹکنک کے لحاظ سے بھی خاصے بلند ہیں۔

نثر ریاض خیرآبادی | مرتبہ عقیل احمد صاحب جعفری۔ تقطیع خورد ضخامت ۲۱۵ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت ۶؍ پتہ:۔ نفیس اکیڈمی حیدرآباد۔ دکن۔

حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم جس طرح اردو کے صاحب طرز اور ماہر فن شاعر تھے نثر میں بھی اپنا ایک خاص انداز رکھتے تھے۔ محاورہ بندی، شوخ نگاری، نزاکت خیال اور شستگی بیان اُن کے شعر کی خصوصیات ہیں۔ نثر میں بھی اُن کا یہ رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہ کتاب مرحوم کے مختلف چھوٹے چھوٹے مضامین اور خطوط کا مجموعہ ہے جن میں بعض پرائیویٹ حالات بھی ہیں اور ادبی نکات و تنقیدات بھی۔ اس کا مطالعہ ادبی لحاظ سے مفید بھی ہوگا اور دلچسپ بھی۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ
اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ
پیش کیا گیا ہے قیمت ؎ مجلد للعہ
خلافتِ راشدہ۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں
عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات
صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں
قیمت ؎ مجلد ؎
مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ
سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن
پر بے مثل کتاب ؎ مجلد للعہ
سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ
ورفتہ ترجمہ قیمت عہ
اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ
کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے
تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت
چھ روپئے مجلد سات روپئے۔
خلافتِ بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے
بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ؎ مجلد ؎

سنہ ۱۹۴۴ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت
جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، انداز
بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی
قیمت للعہ مجلد صہ
قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ
مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔
قیمت ؎ مجلد للعہ
سنہ ۱۹۴۵ء قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت
کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین
اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت
مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور
اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح
کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد سے
قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ
کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ؎
انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب
صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ؎

Registered No. L. 4305

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسن خاص:- جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا:- نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرولباغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین، معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت: مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ہے مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام: اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت: اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہر

۱۹۳۹ء نبی عربی صلعم: تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن جدید ایڈیشن: جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد ہے

غلامانِ اسلام: پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق: علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ مجلد ہے

۱۹۴۰ء قصص القرآن حصہ اول: جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت صہ مجلد ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات: یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحی الٰہی: مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد ہے

تاریخ انقلاب روس: ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

برہان

جلد سیزدہم شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۴۷ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۶۶ء

فہرست مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد	۱۳۰
۲۔ قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے	جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی	۱۳۵
۳۔ عدم تشدد اور حفاظتِ خود اختیاری	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد	۱۶۳
۴۔ خطبۂ جمعہ کی زبان	جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۱۸۶
۵۔ ادبیات:۔		
فردوسِ خیال۔	جناب ماہر القادری صاحب	۱۹۰
نوائے سروش	"	"
۶۔ تبصرے	م۔ ح	۱۹۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پچھلے دنوں لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں مختلف ... مدارس عربیہ اور متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ عربی نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں پہلے مولانا نے ایک تقریر کی اور اس کے بعد دوسرے حضرات نے اپنے اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا۔ باہمی گلہ و شکوہ اور بعض جزئی چیزوں میں اختلاف کے بعد سب نے بنیادی طور پر اصلاحِ نصاب اور اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ایک کمیٹی بنا دی گئی جو اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے ایک مکمل نقشہ تیار کرے گی۔

راقم الحروف نے ۱۹۴۸ء کے ماہِ اگست میں دارالعلوم دیوبند کی ایک انجمن نادیۃ الاتحاد کے سالانہ جلسہ میں ایک طویل خطبۂ صدارت پڑھا تھا جس میں نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی ضرورت اور اس کے طریقوں پر مدلل اور مفصل گفتگو کی گئی تھی اور اس سلسلہ میں چند مفید تجاویز بھی پیش کی گئی تھیں یہ خطبہ اسی وقت انجمن کی طرف سے متوسط سائز کے ۳۲ صفحات پر چھاپ کر شائع کر دیا گیا تھا۔ ملک کے متعدد وقیع اخبارات و رسائل نے کلاً یا جزاً اس کو اپنے کالموں میں جگہ دیکر اور اس پر تائیدی شذرے لکھکر اور ان کے علاوہ ہندوستان کے متعدد اربابِ علم اور یونیورسٹیوں کے بعض مشہور اساتذۂ عربی نے شخصی طور پر خطوط تحریر فرما کر خاکسار کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ جو حضرات اس خطبہ کے اولین مخاطب تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان معروضات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی بلکہ کسی نے کھلم کھلا اور کسی نے ارشاد زیرِ لب کے انداز میں "تجدد" اور "تنور" کا ملزم قرار دیا۔ بہرحال خوشی کی بات ہے جو باتیں پہلے ایک فقیرِ بینوا کی زبان سے ناشنیدنی تھیں وہ اب ان حضرات کے لئے بھی قابلِ غور ہو گئی ہیں جو ان کو سرے سے سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور اگر

ارباب اخلاص کی جدوجہد اسی طرح جاری رہی تو امید ہے ہمارا یہ پرانا خواب ایک دن ضرور سچ ثابت ہوکر رہیگا۔

واقعہ یہ ہے کہ درسِ نظامی تین قسم کے علوم وفنون پر مشتمل ہے (۱) علومِ دینیہ۔ جیسے تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ۔ (۲) علومِ آلیہ یعنی وہ علوم جس سے علومِ دینیہ کے فہم وتفہیم میں مدد لینا ناگزیر ہے جیسے صرف ونحو۔ ادب۔ معانی وبیان۔ فن بلاغت وبدیع۔ (۳) علوم عقلیہ، ان سے مراد وہ علوم ہیں جو نہ خود دین ہیں اور نہ جن سے علومِ دینیہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی حیثیت صرف یہ ہے کہ یہ علوم عصریہ تھے۔ علماءِ اسلام نے شروع شروع میں ان علوم کے پڑھنے پڑھانے کی مخالفت کی لیکن جب دیکھا کہ یہ اربابِ باطل کا ہتھیار بن گئے ہیں تو انھوں نے خود ان علوم کو پڑھا اور ان پر تنقید کرکے مسائلِ دین کے مقابلہ میں ان کی اثر آفرینی ختم کردی چنانچہ امام غزالیؒ کی تہافۃ الفلاسفہ پھر علامہ ابنِ رشد المتوفی ۵۹۵ھ کی تہافت الفلاسفۃ جس میں علامہ نے اگرچہ امام غزالیؒ سے متعدد مقامات پر اختلاف کیا ہے لیکن بہرحال خود بھی امام کی غرض وغایت کی تکمیل ہے اور اس کے بعد خواجہ زادہ (م ۸۹۳ھ) کی تہافت الفلاسفۃ جو انھوں نے سلطان محمدؒ فاتح قسطنطنیہ کے ایما سے لکھی تھی، یہ اور ان کے علاوہ حافظ ابنِ تیمیہؒ کی "الردعلی المنطقین" اور امام رازیؒ کی شرح اشارات یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان علوم میں منطق اور فلسفہ شامل ہیں جن کو ہمارے قدیم نصابِ تعلیم میں نمایاں امتیاز حاصل رہا ہے اور اب بھی مدارسِ عربیہ کے طلبا کے کئی قیمتی سال انھیں کے نذر ہوجاتے ہیں۔ ان علوم کے علاوہ مدارس میں ہیئت اور تاریخ کی بھی دو تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اول الذکر کا مقصد محض ایک عصری فن کا جاننا اور تاریخ کا مقصد اپنے اسلاف کے کاموں اور کارناموں سے واقف ہونا تھا ہمارا درسِ نظامی جو ملا نظام الدین سہالی المتوفی ۱۱۶۸ھ کی طرف منسوب ہے۔ بس انھیں مقاصد کو سامنے رکھکر بنایا گیا تھا اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس زمانہ میں جو عمدہ سے عمدہ اور مفید کتابیں دستیاب ہوسکتی تھیں ان کو درس کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ درسِ نظامی کی اس ہیئتِ ترکیبی سے اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ علمائے کرام کے نزدیک "دینی تعلیم" کی اسپرٹ کیا تھی یعنی وہ صرف دین کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ

ان کے نزدیک عالم بننے کے لئے علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ کا مطالعہ اوران سے واقف ہونا بھی لازمی تھا۔

اب ان مقاصدِ تعلیم کو سامنے رکھکر درسِ نظامی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اُس کی موجودہ ہیئت دینی اور عصری علوم دونوں کی تعلیم کے لحاظ سے سراسر ناقص اور مقاصد کے لئے غیر مفید ہے اور غیر افادیت کی وجہ جس طرح نصابِ تعلیم ہے اس نصاب کا طریقۂ تعلیم بھی بڑی حد تک اس کا سبب ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں جیسا کہ آجکل یونیورسٹیوں کی اعلیٰ کلاسوں میں ہوتا ہے طریقۂ تعلیم املا تھا۔ استاد کسی مسئلہ پر فنی حیثیت سے کلام کرتا تھا اور تلامذہ اس کو قلمبند کرتے جاتے تھے اس طرح تعلیم کسی خاص ایک کتاب کی نہیں بلکہ فن کی ہوتی تھی اور طلبا کو استاذ کے لکچروں کے ذریعہ فنی بصیرت و مہارت پیدا ہوجاتی تھی لیکن آج کل ہوتا یہ ہے کہ استاد کی تمامتر توجہ کتاب کی عبارتی پیچیدگیوں اور مصنف کے مافی الضمیر کی تشریح و تفصیل پر مرکوز رہتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم نحو میں کافیہ اور شرح جامی پڑھتا ہے مگر اسے نحو نہیں آتی منطق میں سلّم اور ملا حسن پڑھتا ہے مگر منطق سے کورا ہی رہتا ہے۔ اصولِ فقہ میں اصول الشاشی اور نورالانوار کا درس لیتا ہے لیکن جیسا کہ اصولِ فقہ کے ایک طالب علم سے توقع کرنی چاہیئے وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وقت کا کوئی اہم مسئلہ سامنے آجائے تو وہ اصولِ احکام کی روشنی میں کوئی حکم مستنبط کرسکے۔ قس علیٰ ذلک۔ راقم الحروف اور اکثر رفقائے ندوۃ المصنفین نے حدیث اور منطق و فلسفہ کا درس علی الترتیب حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور مولانا رسول خاں صاحب مدظلہما سے لیا ہے۔ ان میں ہر ایک بزرگ اپنے اپنے فن کا امام تھا۔ اگرچہ کتاب ان کے سامنے بھی ہوتی تھی لیکن ان حضرات کا طریقۂ درس املاہی تھا۔ کسی مسئلہ پر تقریر کے وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مسئلہ سے متعلق فنی طور پر جتنی معلومات ہوسکتی ہیں وہ سب ان حضرات کے دماغ میں موجود ہیں وہ مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے اور اس سے متعلق اکابر ائمۂ فن کی آرار اور اُن کے دلائل بیان کرنے کے بعد خود سب پر محاکمہ اور تبصرہ کرتے اور اخیر میں اپنی ایک قطعی رائے دلائل و براہین کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ لیکن یہ طریقہ صرف انھیں حضرات کے ساتھ مخصوص تھا اب وہ بات کہاں!

بہرحال سب سے مقدم اور اہم چیز یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے۔ اس میں شک نہیں املا کے طریقہ پر درس دینے کا اہل ہر ایک مدرس نہیں ہو سکتا اور جو صاحبِ فن ہو گا وہ معمولی تنخواہ پر دست یاب نہیں ہو سکتا اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک میں آجکل ایسے حضرات کا قحط بھی ہے لیکن اگر واقعی مدارسِ عربیہ میں اصلاح کر کے انھیں وقت کے تقاضوں کے مطابق مفید اور کارآمد بنانا ہے تو یہ سب کچھ اور اس کی تکمیل کے لئے جو اسباب طبعی ہو سکتے ہیں ان کا بندوبست کرنا ہی ہو گا۔

دوسرا مسئلہ نصابِ تعلیم کا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف علوم و فنون کی تعلیم کے لئے جو کتابیں رائج ہیں ان کی جگہ ایسی کتابیں شاملِ درس کی جائیں جو ان علوم کی تعلیم کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتی ہیں اور آج کل بازار میں مل بھی سکتی ہیں۔ علاوہ بریں فنون کی تعلیم سے متعلق قدیم نقطۂ نظر کو بھی تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً اصولِ حدیث کے سلسلہ میں صرف نخبۃ الفکر پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا ہے حالانکہ اسماء الرجال کا جاننا بھی حدیث کے ایک طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔ ادب کا حال ان سب سے بدتر ہے۔ ادب کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخِ ادب اور علم السنہ اور ساتھ ہی عصرِ جدید کی ادبی ترقیات اور اس کی لسانی تبدیلیوں سے باخبر ہو۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کا فنِ تنقید نہایت کامل و مکمل ہے لیکن ہمارے طلبہ اس سے بھی ناآشنا رہتے ہیں ضرورت ہے کہ ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں ان تمام خامیوں کو دور کیا جائے اور اس کا نصاب ایسا بنایا جائے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ایک طالب علم آج کل کی اصطلاح کے مطابق صحیح طور پر ادیب کہلایا جا سکے۔

معانی و بیان اور بدیع میں ہمارے ہاں سب سے زور فنِ بدیع پر رہتا ہے حالانکہ اصل چیز فصاحت و بلاغت ہے فنِ بدیع متاخرین کی ایجاد ہے اور اس سے بسا اوقات لفظی حسن پیدا کرنے کی کوشش میں اصل معنی کا خون ہو جاتا ہے حدیث کی کتابوں میں کوئی ادل بدل نہیں ہو سکتا البتہ تفسیر کی مروجہ درسی کتابوں میں ادل بدل کرنا نہایت ضروری ہے اور اصولِ تفسیر کا فن ہمارے ہاں بالکل نہیں پڑھایا جاتا اس کو بھی شاملِ درس ہونا چاہیئے۔ فقہ میں کم از کم ایک کتاب ایسی ضرور ہونی چاہیے جس سے طالب علم کو حنفی مسلک کے علاوہ دوسرے مذاہبِ فقہ اور ان کے مبادی و

اصول کا علم ہو۔ پھر ہمارے طلبا تاریخ علوم سے ناواقف رہتے ہیں اس کے لئے مقدمہ ابن خلدون کا انتخاب یا کوئی اور کتاب جو اس مقصد کے لئے مفید ہو شامل درس ہونی چاہئے۔

اب رہے علوم عصریہ! تو کوئی بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ عصر کے بدل جانے کے ساتھ اب مدارس عربیہ کے علوم عصریہ بھی بے وقعت ہوگئے ہیں جو چیزیں فلسفۂ قدیم کی مسلمات سمجھی جاتی رہی ہیں اب وہ بدیہی البطلان بن گئی ہیں اور اب ان کا پڑھنا صرف ایک خاص زمانہ کی عقلی رفتار کے جان لینے کی حیثیت سے تو مفید ہوسکتا ہے ورنہ علمی اعتبار سے ان کا کوئی وزن نہیں۔ مدارس میں بالعموم رسالہ ملا جلال و میر زاہد کی صرف ایک یہ بحث کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کس مقولہ سے ہے؟ پورے ایک برس میں تمام ہوتی ہے اور پھر بھی دماغ میں روشنی پیدا نہیں ہوتی اس کے بالمقابل اگر کانٹ کی کتاب "تنقید عقل محض" پڑھائی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ فلسفہ کا ایک اہم مسئلہ حل ہوجاتا ہے بلکہ اس سے وحی اور الہام اور بعض اور مابعد الطبیعاتی حقائق کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے پھر ہمارے ہاں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ طبیعات اور الہیات دونوں کے مباحث ملے جلے ہیں اور وہ بھی جتنا کچھ پڑھایا جاتا ہے صرف جزء لایتجزی صورت وہیولی اور اسی قسم کے چند اور مسائل تک محدود رہتا ہے۔ موجودہ فلسفہ کا ایک اہم شعبہ فلسفۂ اخلاق ہے۔ مدارس عربیہ کے طلبا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔

کہا جاسکتا ہے آخر علوم عصریہ میں تو اور بہت سے علوم بھی شامل ہیں انھیں چھوڑ کر صرف فلسفہ کو ہی نصاب میں کیوں شامل کیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ اور علوم مثلاً اقتصادیات، علم نباتات، کیمیا اور طبیعات وغیرہ علوم معاشی یا عملی علوم ہیں۔ انسانی عقائد و افکار سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ انسان کے مذہبی اور اخلاقی و روحانی افکار و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر ذہنی کجروی اور گمراہی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر علما نے جس طرح پہلے فلسفۂ قدیم پڑھا اسی طرح اب ان کو فلسفۂ جدید پڑھ کر فکر و نظر کی گمراہی کا سد باب کرنا چاہئے۔

ان علوم کے علاوہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ اور جغرافیہ ان چیزوں کا بھی درس نظامی میں شامل ہونا نہایت ضروری ہے پھر تاریخ بھی صرف اپنی نہیں بلکہ مختلف قوموں اور سلطنتوں کی دنیا کے بڑے بڑے مذاہب اور تہذیب و تمدن کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے اس سلسلہ میں ابھی چند گذارشیں اور کرنی ہیں وہ آئندہ اشاعت میں پیش کی جاسکیں گی۔

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۷)

علیؔ | ایک حقیقت نگاہ ہستی ان بصیرت افروز صفاتِ عالیہ پر جب عمیق نظر ڈالتی ہے تو بے ساختہ اس کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلاشبہ قرآن اپنی تمام پیشرو کتبِ سماویہ کے مقابلہ میں رفیع الشان اور جلیل القدر ہے اور علوِ مرتبت و رفعتِ قدر کا حامل ہے کیونکہ نہ کوئی کتاب اس کے اعجازِ بیان کو پہنچتی ہے اور نہ اسرارِ الٰہیہ و غوامضِ کونیہ میں کسی کو اُس کی ہمسری حاصل ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ احدیت و صمدیت خود "علی - بلند تر" ہے۔ اور جبکہ اس کے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "علی" ہے، پھر قرآن کی صفت اگر "علی" نہ ہوتی تو یقیناً وہ کلام اللہ بھی نہ ہوتا اور نہ دوسری کتب سماویہ کی طرح اس کے نظم و معانی اعجاز کا خزینہ ہوتے اس لئے کہ اگر یہ مثل صحیح ہے کہ "کلام الملوک ملک الکلام" تو کیا وجہ کہ یہ بھی حق اور صحیح نہ ہو کہ "کلام الالٰہ معجز الکلام" یعنی جب خدا کی ذاتِ بحت بے ہمتا و بے مثال ہے تو اس کا کلام بھی دوسری تمام کتبِ سماویہ کے سامنے بے مثال اور معجز ہے اس لئے اس کی علوِ شان اور رفعتِ مکان مسلم اور حقیقتِ ثابتہ ہے۔

علاوہ ازیں توراۃ و زبور ہو یا انجیل و صحف تمام پیشرو الہامی کتابیں نہ نسخ و تنسیخ سے محفوظ رہ سکیں اور نہ تحریف و تبدیلی سے اور اسی بنا پر آج خود اہلِ کتاب کو اعتراف ہے کہ اُن کے پاس موجودہ سماوی کتابیں خود ان نبیوں اور رسولوں کے زمانہ میں مرتب و مہذب موجود نہیں تھیں بلکہ عرصہ دراز

کے بعد اُن کے حواریوں یا پیروانِ ملت نے ان کو موجودہ شکل میں پیش کیا ہے لیکن قرآن کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اس کی نظم و ترتیب ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے محفوظ اور اس کے احکام نسخ و تنسیخ سے مبرا ہیں اس لئے بھی وہ تمام پیشرو کتابوں کے بالمقابل "علی" ہے "بلند و بالا" ہے۔

وَاِنَّہٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ	اور بلاشبہ قرآن لوحِ محفوظ میں (محفوظ) ہے ہمارے
لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ	نزدیک یقیناً بلند و بالا اور مضبوط و مستحکم ہے۔

وہ لوحِ محفوظ میں مصئون و محفوظ ہے کہ جس کو نہ قلمِ خطا و نسیان بھلا سکتا ہے اور نہ اس پر خطِ نسخ و تحریف جاری ہو سکتا ہے اور پھر خدائے برتر کے ساتھ اس کی نسبت کا یہ حال ہے کہ تمام الہامی کتابوں کے مقابلہ میں یہ اس کے نزدیک مرتبہ کے لحاظ سے "علی" ہے اور رفعت و قدر کے پیش نظر "حکیم" ہے گویا جو صفات ذاتِ موصوف میں علیٰ وجہ الکمال موجود ہیں اُن کا کامل و مکمل عکس اس کی صفتِ کلام قرآن میں بھی جھلک رہا ہے اور اسی نسبت و قربت کی وجہ سے وہ بھی ان صفات کا موصوف ہے وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

حکمۃ تو اب یہ کہنے میں بھی تصنع، عبارت آرائی، یا مبالغہ آمیزی نہیں ہے کہ جو کتاب ان عالی قدر و عظیم المرتبہ صفاتِ کمالیہ کی حامل ہو وہ "حکمۃ" ہی "حکمۃ" ہے۔

"حکمۃ" دانائی اور صحیح فراست کا نام ہے ایسی فراست جب کہ اس سے رہنمائی اور رہبری کا کام لیا جائے تو حقیقی سعادت کا باعث ثابت ہو۔ تو اس مفہوم کے لحاظ سے قرآن حکمت ہی نہیں بلکہ "حکمتِ بالغہ" ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت تمام عالمِ انسانی روحانی درد و کرب میں مبتلا تھی اور اس کا ہر ایک گوشہ نقص و خام کاری میں آلودہ تھا۔ غرض حقیقی راہنمائی و قیادت سے سب ہی محروم تھے۔ ایسے تاریک دور میں قرآن کی مشعلِ ہدایت اور حکمتِ بالغہ نے دستری اور دستگیری کی اور زندگی اور مابعد زندگی کے لئے وہ نسخۂ حیات اور اکسیرِ ہدایت پیش کیا کہ حکیم و دانا اور فیلسوف

حیران وانگشت بدنداں ہوکر رہ گئے۔ اور وہ مسلمان ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن جلد یا بدیر سب ہی کو تسلیم کرنا پڑا کہ قرآن بلاشبہ حکمت ہے اور حکمتِ بالغہ ہے۔

اُس نے نازل ہوکر توحید کا پیغام سنایا اور شرک سے نفرت دلائی، اُس نے پیغمبرانِ خدا کو خدا اور خدا کا بیٹا مان لینے یا عام انسانوں کی طرح اُن کے پیغامات کو بھی محض انسان اور بشری خیالات بتلاکر غیر الہامی قرار دینے کی افراط و تفریط سے بچایا، اُس نے انسانی معاشرت کی اصلاح کی، معاشی اقدار کو عدل و نصفت کے سانچہ میں ڈھالا، اُس نے انسانوں کو انسانیت کا سبق دیا بلکہ انسانیت کبریٰ تک پہنچایا۔ اسی تعلیم کا نام حکمت ہے اور ایسے ہی پیغام کو حکمتِ بالغہ کہا جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ مذکرہ، حضرت ہود و صالح علیہما السلام کا اپنی قوم سے مناظرہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مجادلہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مقابلہ، غرض حق و باطل کے وہ تمام مظاہر جن کا ذکر انبیا و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے سلسلہ میں آیا ہے اسی حکمت اور حکمتِ بالغہ کے شواہد و نظائر ہیں۔

خدا کی توحید، رسول کی رسالت، معاد کا اثبات، معاشرت و معاشیات کی اصلاح، غرض وہ کونسا پہلو ہے جس کو حکمت بالغہ کے ذریعہ محکم دلائل و روشن براہین کی شکل میں اُس نے پیش نہ کیا ہو ہر ایک پہلو کو اس کی نمایاں خصوصیات کے ساتھ نمایاں کیا اور حکمت و دانائی کی راہ سے تمام پہلوؤں کے حقائق کو ممتاز بھی کیا اور ان کے درمیان تعلق و ربط بھی قائم کر دکھایا۔ سو یہی ہے وہ حقیقتِ عالیہ جس کو قرآن نے اس اعجاز بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حِکمۃٌ بالغۃ فما تغنی	(قرآن) پوری عقل کی بات ہے پھر ان پر موثر

النذر (القمر)	نہیں ہوتے ڈر سنانے والے۔

الحاصل قرآن کا یہ دعویٰ بھی اپنی جگہ حق و صداقت پر مبنی ہے کہ وہ ایسی بے نظیر کتاب،

بے مثال، بے ہمتا موعظت ہے کہ جس کا ہر ایک جملہ اور ہر ایک کلمہ حکمت اور حکمتِ بالغہ ہے۔

حبلُ اللہ سطورِ بالا سے جب یہ واضح ہو چکا کہ قرآن ایسی کتاب، ایسا کلام، اور ایسی موعظت ہے جو روشن برہان، محکم حجۃ، واضح بیان ہے اور اس کی تعلیم حکمت اور حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے تو پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی مضبوط رسّی ہے۔

حبل کے معنی رسّی کے ہیں اور حبل اللہ خدا کی رسّی کو کہتے ہیں۔ رسّی چند ایسے دھاگوں کے مجموعہ کا نام ہے جو بٹے جا کر اور انفرادی حیات کو اجتماعی زندگی پر قربان کر کے ایک مضبوط شے بن جاتے ہیں اور وہ نہ یہ کہ خود مضبوط ہو جاتے ہیں بلکہ دوسرے بھی ان کی مضبوطی کا سہارا اور آسرا ڈھونڈنے لگتے ہیں، تم نے ایک دھاگے کو خواہ وہ سوت کا ہو سن کا ہو یا ریشم کا دیکھا ہو گا کہ جب کوئی شخص اس پر زور آزمائی کرتا ہے تو بآسانی اس کے ٹکڑے کر دیتا ہے لیکن تم نے یہ بھی ضرور دیکھا ہو گا کہ جب چند دھاگے مل کر ایک بٹے ہوئی رسّہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو چند بہادر انسانوں کی رسّہ کشی کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اور کثرت نے وحدت کی جو صورت اختیار کر لی ہوتی ہے اُس کے بل بوتہ پر خود بھی محکم اور پائیدار رہتے ہیں اور دوسروں کی پائیداری کے لئے بھی سینہ سپر بن جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے جس طرح مادی دنیا میں "حبل متین" بے سہاروں کا سہارا اور بے پناہوں کی پناہ ثابت ہوتی ہے اور خود بھی محکم و استوار رہتی اور دوسروں کی استواری کے لئے ممد و معاون بنتی ہے۔ اسی طرح عالمِ روحانیات میں بھی "حبل متین" کے بغیر خدا طلبی اور خدا رسی ناممکن ہے اور گو اس کا وجود ہر ایک دور اور ہر ایک زمانہ میں رہا ہے لیکن مقتضیاتِ زمانہ اور تاثراتِ ماضیہ کے مطابق وہ ہمیشہ ایک مخصوص وقت تک کارگر ثابت ہوئیں اور وقتِ معینہ کے بعد چارہ گر نہ بن سکیں میرا وجود اس معاملہ میں بھی دوسروں سے ممتاز اور جدا ہے اور میں وہ روحانی حبل متین ہوں جو تا قیامِ قیامت ہر ہاتھ بڑھا کر سہارا لینے والے کو سہارا دیتی اور گرفت میں لینے والوں کے لئے آسرا بنتی ہوں اور اس لئے "حبل اللہ المتین" ہوں۔

یعنی میں سوت، سن، ریشم یا لوہے کی رسی نہیں ہوں کہ پانی میں گل جاؤں یا مٹی میں رل جاؤں یا ریشہ ریشہ ہو کر فنا کے گھاٹ اُتر جاؤں اور نہ میں وقتی تقاضا اور ہنگامی ماحول کی صدائے بازگشت ہوں کہ وقت اور ہنگام کے تقاضوں کو پورا کر کے موت کی آغوش میں سو جاؤں بلکہ ان کے برعکس میں خدا کی وہ رسی ہوں اور حبل اللہ ہوں جس کا وجود مستقبل کی آخری ساعات سے وابستہ ہے اور جس کی دسترس معاش سے معاد تک ابدی وصف کے ساتھ متصف ہے۔

پس جو خوش بخت میرا سہارا لیتا ہے وہ شاد کام و بامراد ہوتا ہے اور جو بدبخت میرے سہارے سے بے پرواہ ہو کر رہ روِ منزل بنتا ہے وہ ناکامی و خسران کا منہ دیکھتا ہے۔

لہٰذا یہ واضح رہے کہ میری جانب دوڑنے والے اور سہارا تلاش کرنے والے اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں جذب کر کے آئیں اور علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ مجتمع ہو کر اس کو پکڑ لیں تاکہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہر حیثیت سے بہتر اور مفید ثابت ہو۔ کیونکہ انفرادی زندگی درحقیقت زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کا سراب ہے حقیقی حیات تو دراصل اجتماعی حیات ہی کا نام ہے اور وہ انسانوں کو بلند مراتب اور اعلیٰ درجات پر فائز کرتی اور خدا کی درگاہ میں مقبول بناتی ہے۔ اس لئے کہ نہ تشتت و افتراق میرا شیوہ ہے اور نہ میری تعلیم کی یہ روح ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے لئے یہ راہ مہلک اور بے پناہ ہے۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ کسی طرح بچھڑے ہوؤں کو ملاؤں، افتراق کو مٹا کر وحدت پیدا کروں اور اس طرح خدا کی اس رسی کو مضبوط پکڑنے والوں کو یک دل و یک جان بنا دوں تاکہ انشقاق و تحزب کا انسداد ہو کر تمام کائناتِ انسانی ایک ہی "اخوت" کے دامن میں سما جائے اور دوئی کا اختلاف درمیان سے ہٹ جائے۔

غرض میرا مقصد، میری تعلیم، میرا جذبہ، میرا فیصلہ سب اسی ایک بات پر مرکوز ہیں کہ جو شخص "حبل اللہ" کو اجتماعی حیثیت میں گرفت کرے گا وہی منازل علیا کو حاصل کر سکے گا اور جو تشتت و تحزب کا طالب ہوگا وہ بے جان لاشہ کے سوا کچھ نہ پا سکے گا۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرّقوا۔ اور اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو اور باہم افتراق نہ پیدا کرو۔

قیّم | پھر یہ بھی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ قرآن اگر "حبل اللہ" ہے اور خدا کی مضبوط رسّی جو وصول الی اللہ کے لئے کافی و وافی ہے تو از بس ضروری ہے کہ وہ سیدھی اور راست ہو اور اس میں کسی قسم کی بھی کجی نہ ہو تاکہ رہرو راہِ طریقت منزل مقصود تک آسانی اور سہولت سے پہنچ سکے، ظاہر ہے کہ جو رسّی ٹیڑھی اور کج مج ہوگی اس کا سہارا لینے اور اس کو پکڑ کر منزل تک پہنچنے والا کب کجی اور کجروی سے محفوظ رہ سکتا ہے البتہ یہ بات جدا ہے کہ وہ راہ ہی راہِ مستقیم نہ ہو اور جادۂ استقامت کے برعکس ہو لیکن راہِ حق تو بہر حال "صراطِ مستقیم" ہے اور اس کی استقامت میں کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ تب یہ بھی لازم ہے کہ "راہِ مستقیم" کی معراج تک پہنچنے کے لئے جس حبلِ متین کو کام میں لایا جائے وہ بھی زیغ و کجی سے مستقیم اور سیدھی ہو۔

پس قرآن حکیم یہ بھی دعوٰی کرتا ہے کہ وہ ایسی حبل اللہ (خدا کی رسّی) ہے جو ہر طرح کجی اور کجروی سے مامون و مصئون ہے یعنی نہ اس میں افراط ہے کہ اس کے اوامر و نواہی بندگانِ خدا کے لئے مصیبت و عذاب بن جائیں اور نہ تفریط ہے کہ جس میں وہ ضروری احکام تک موجود نہ ہوں جن کی ضرورت اور حاجت ہے اور یہ کہ ان کی تکمیل کے لئے کسی دوسری الہامی کتاب کی احتیاج محسوس ہونے لگے چنانچہ قرآن نے اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر اس طرح واضح کیا ہے۔

"مافرطنا فی الکتاب من شئ" ہم نے الکتاب (قرآن) میں کسی شے کی کمی نہیں کی

یہی وجہ ہے کہ وہ الہامی کتابوں میں "آخر کتاب" قرار پائی اور اس کا پیش کرنے والا پیغمبرؐ "خاتم الرسل والانبیاء" کے معزز لقب سے سرفراز و ممتاز ہوا۔

یا اس لئے "قیم" ہے کہ معاش و معاد کے تمام بنیادی مسائل اور بندگانِ خدا کے تمام مصالح

کے لئے متکفل اور ضامن ہے اور اپنے اس وصف میں ہر طرح مستقیم اور کجی سے منزہ ہے۔ گویا مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی کتاب ہے جو ہر قسم کے نقائص سے پاک اور ہر طرح کے فضائل سے مزین ہے اور اسی حقیقت کا دوسرا نام "قیم" ہے۔

قرآن نے اپنی اس صفت کا اظہار منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں سے کیا ہے اور یہ کہا ہے "ولم یجعل لہٗ عوجا" "قیما" اب ادبی اعجاز کے لحاظ سے خواہ ان دونوں جملوں میں سے ایک دوسرے کی تاکید تسلیم کیجئے یا دونوں کو جدا جدا مفاہیم کے اعتبار سے قبول فرمائیے۔ ہر دو تعبیرات کی صحت کا ثمرہ اور نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح کائنات میں ہر شے کی خصوصیات کا اظہار دو ہی پہلوؤں سے ہوا کرتا ہے ایک مثبت اور دوسرا منفی یا ایک ایجابی اور دوسرا سلبی حتیٰ کہ خدا کی الوہیت کے ایقان و اعتقاد کا کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" بھی ان ہی ہر دو پہلو کا اعلان کرتا ہے اسی طرح قرآن بھی ان دونوں گوشوں سے اپنی حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ایسی کتاب ہوں جس میں خدا نے کسی قسم کی بھی کجی نہیں رکھی اور اس لئے افراط و تفریط سے پاک "معتدل المزاج" ہوں اور ایسی صورت میں یہ بھی صحیح ہے کہ جس شے میں "عوجاج" (کجی) نہ ہو وہ بلاشبہ "قیم" ضرور ہے اور یہ بھی درست ہے کہ صرف یہی نہیں ہے کہ مجھ میں کجی نہیں ہے اور اعتدال ہے بلکہ اس سے زائد یہ وصف بھی رکھتا ہوں کہ میں معاش و معاد انسانی کے تمام بنیادی گوشوں پر حاوی اور اوامر و نواہی خداوندی کے کامل و مکمل اصولوں پر مشتمل ہوں اور اسی بنا پر میں "قیم" ہوں۔

پس غور کیجئے کہ جو کتاب اعوجاج سے منزہ اور استقامت سے مزین ہو وہی اگر "جبل اللہ" نہ ہوگی تو پھر کس کتاب کو یہ رتبہ حاصل ہوگا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ ولم یجعل لہ عوجًا قیمًا (کہف)	اس اللہ کیلئے ہر قسم کی ستائش زیبا ہے جس نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر الکتاب (قرآن) کو نازل کیا اور نہیں ٹھیرایا اس کتاب کیلئے کجی کو اور نازل کیا اس کو مستقیم۔

العروۃ الوثقیٰ | اس زمانہ میں جار اور شربت کی پیالی اور فنجان کس نے نہیں دیکھیں اور نہیں برتیں کیا اس کو گرفت میں رکھنے کے لئے قبضہ کی ضرورت نہیں ہوتی؟ ضرور ہوتی ہے۔ پس اگر یہ قبضہ مضبوط ہے تو پیالی کار مفوضہ بخوبی انجام دے سکے گی ورنہ کمزور قبضہ اگر ٹوٹ گیا تو پیالی بھی شکست ہوئی اور قبضہ بھی فوت ہوا۔ نیز اگر کوئی شخص درخت پر چڑھا ہوا ہے تو اس کو اپنی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ ایسی شاخ کو پکڑے جو خود بھی مضبوط ہو اور اس کے سہارے کیلئے بھی مضبوطی کا باعث بن سکے۔

قرآن حکیم نے بھی ایک جگہ اسی تمثیل کو اختیار کیا ہے اور اس جانب توجہ دلائی ہے کہ یہیں درحقیقت جامِ شریعت اور شجرِ ایمان کے لئے "عروۂ وثقیٰ" ہوں پس جو شخص جامِ شریعت سے شاد کام ہونا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مجھ کو قبضۂ جام سمجھ کر مضبوطی سے پکڑے تاکہ اپنے مقصد میں کامران و کامیاب ہو یا جو شخص شجرِ ایمان کی پناہ لینا چاہتا ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ مجھ کو مضبوط شاخ سمجھ کر اچھی طرح گرفت میں لے تاکہ اس کو حقیقی پناہ نصیب ہو سکے۔

لیکن قرآن تو عالم رشد و ہدایت اور کائناتِ معاش و معاد کا ایک مکمل دستور ہے جو ہر گوشۂ زندگی کے لئے مصلح اعظم اور انقلاب آفریں ہے لہٰذا وہ تو خود ہی جامِ شریعت اور شجرِ ایمان ہے پھر اس کو "عروۂ وثقیٰ" کہنے کے کیا معنی؟ تو خود قرآن ہی نے اس اشکال کو اس طرح حل کر دیا کہ جو شخص اللہ پر ایمان و اعتقادِ صحیح رکھتا اور طاغوت کی ہر بات کا انکار کرتا ہے تو یہ ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت گویا پورے قرآن کی حقیقی تفسیر ہیں۔ اور ان پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا بلاشبہ قبضۂ جام اور شاخِ شجر کو مضبوطی سے پکڑ لینا ہے تو درحقیقت جام و شجر نے اپنے ظہور و نمود کو قبضہ و شاخ کہہ کر واضح کیا ہے اور یہ طریقۂ تعبیر اعجازِ بلاغت کا ایک کرشمہ ہے۔

فمن یکفر بالطاغوت ویومن　　پس جو شخص طاغوت (شیطان) سے سرکشی کرے
باللہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالعروۃ الوثقیٰ　　اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے مضبوط شاخ

لا انفصام لہا واللہ سمیع علیم۔ (بقرہ)
(یا) مضبوط قبضہ کو پکڑ لیا جس کو انقطاع (ٹوٹنے یا کٹ جانے کا اندیشہ) نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

اس حقیقت کا متعدد بار اظہار کیا جا چکا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ہستی بے سہیم و ہمتا اور یکتا ہے، اس لئے اس کی خالقیت و مالکیت میں بھی اس کا کوئی ہمسر و ہمدم نہیں ہو سکتا اور جبکہ وہ احد و یکتا ہے تو اس کا قانون قدرت بھی سارے عالم پر یکساں اور مساوی کارفرما ہے یہ نہیں ہے کہ مادیات و محسوسات کے لئے ایک قانون قدرت ہے اور روحانیات و مدرکات کے لئے دوسرا اور اس طرح خدا کی خدائی دو متضاد و متقابل کارفرمائیوں کے ماتحت ہو۔ تو جب فطرت تمام محسوسات و معقولات، مادیات و روحانیات سب پر ایک ہی طرح عامل ہے تب ضروری ہے کہ ماورار مادیات کے مسائل کو سمجھانے اور فہم سے قریب لانے کے لئے مادیات و محسوسات کو بطور تشبیہ، استعارہ اور تمثیل کے استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے اعجاز بیان کے ساتھ جگہ جگہ حسب تقاضار اسلوب عالم روحانیات کی باتوں کو عالم مادیات کی اشیار کے ساتھ تمثیلی، تشبیہی اور استعاری رنگ میں ذکر کرتا اور افہام و تفہیم کے لئے سہولت بہم پہنچاتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے امتیاز و اوصاف یا اپنی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے پیش نظر رکھا اور "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا" میں قرآن کو "حبل اللہ" سے اور "فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ" میں "عروۃ وثقیٰ" سے تعبیر کیا اور ان استعارات کو ذکر کر کے اس حقیقت حال کی جانب توجہ دلائی کہ قرآن ایک ایسا دستور کامل اور ایسی کتاب محکم ہے جس پر عامل ہونے اور امتثال اوامر و نواہی کرنے کے بعد کوئی شخص گمراہ نہیں رہ سکتا اور بلا شبہ اس نے خدائے برتر کے ساتھ ایسا محکم و مضبوط رشتہ قائم کر لیا جس کو کوئی طاغوتی قوت شکست و ریخت نہیں کر سکتی۔

غالباً اس لطیف مگر عریاں حقیقت کو پیش نظر لا کر خاتم الانبیار محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

نے بھی ایمان کو درخت سے تعبیر فرمایا اور اعتقادات و اعمال کو اس کی جڑ اور شاخیں قرار دیا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایمان
الایمان بضع وسبعون شعبۃ	کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں ان میں سے بلند و بالا
افضلھا قول لا الہ الا اللہ و	کلمۂ لا الہ الا اللہ ہے اور چھوٹی سی شاخ راہ سے
ادناھا اماطۃ الاذی عن	خس و خاشاک دور کر دینا ہے اور حیاء بھی
الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان	ایمان ہی کی شاخ ہے۔

"لا انفصام لھا" کہہ کر قرآن اس کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہے کہ گو قرآن کو "حبل اللہ" رسی کے اور "العروۃ الوثقیٰ" شاخ شجر یا قبضۂ جام سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن مشابہت صرف اسی پہلو میں منحصر ہے کہ جس طرح ان کو مضبوط پکڑ کر مادی اور حسی کار برآری ہو جا سکتی ہے اسی طرح روحانی سعادت اور ابدی و سرمدی فلاح کی کامرانی قرآن کو مضبوط پکڑنے سے وابستہ ہے لیکن قرآن ان تشبیہی امور سے کہیں بلند و برتر ہے اس لئے کہ قبضۂ جام اور شاخ شجر خود اپنی جگہ کمزور اور ناپائیدار ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ ہوتا رہتا ہے کہ جام موجود ہے مگر قبضہ شکست ہو گیا، یا درخت باقی ہے مگر وہ شاخ کہ جس پر تکیہ تھا ٹوٹ گئی لیکن قرآن اس طرح کا "عروۂ وثقیٰ" نہیں ہے بلکہ وہ تو خود بھی محکم و مضبوط اور ابدی و سرمدی ہے اور دوسروں کے لئے بھی ایسا مضبوط ہے کہ جس کے لئے نہ انقطاع ہے اور نہ انفکاک پس جو بھی اس کا انتثال کرتا ہے ابدی فوز و فلاح پاتا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ اس مالک حقیقی کا کلام معجز نظام ہے جو سمیع ہے اور کوئی نیت اور کوئی عمل اس کی سماعت سے [illegible] جو علیم ہے اور کوئی شے اور کوئی کام اس کے علم سے خارج نہیں۔

الوحی | سطور بالا سے بہ خوبی واضح ہو گیا کہ قرآن کی رشد و ہدایت اور تبلیغ و دعوۃ کا معیار کس قدر بلند اور رفیع ہے اور اس راہ میں اس کی بے مثال رعنائیوں اور خوبیوں نے عالم انسانی کے نشو و ارتقا

اور اصلاح احوال ومدارج کی کیسی بے نظیر تصویر پیش کی ہے؟ اور یہی نہیں کہ اس کے انقلاب کی صدا نے صرف روحانیات کی منزلِ آخر کے لئے رہنمائی کا حق ادا کیا بلکہ دینی ودنیوی سعادت کو اس مرتبۂ علیا پر پہنچا دیا کہ عقل وخرد کے نزدیک جس سے آگے کوئی منزل باقی نہیں رہتی۔

یہ تو آپ بارہا سن چکے ہیں کہ کائناتِ مادی میں جبکہ قانونِ فطرت ہر ایک آغاز کے لئے انجام ضروری قرار دیتا ہے اور یہ کہ انجام اُس حقیقت کا نام ہے جس کے بعد انتظار اور توقع کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی تو اس کہنے میں کیوں تامل کیا جائے کہ اسی طرح عالمِ روحانیات کا وہ آغاز جو آدمؑ (علیہ السلام) یا پہلے انسان سے ہوا تھا اس کے ارتقائی منازل کی آخری کڑی یا اُس آغاز کے انجام کا ہی دوسرا نام قرآن ہے۔

کیا تم اس کا انکار کر سکتے ہو کہ بچہ جب اس عالمِ مادی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی حاجات و ضروریات بہت ہی محدود ہوتی ہیں اور وہ اپنی ماں کے ماسوا کسی سے واسطہ نہیں رکھتا پھر جوں جوں اس کی زندگی کے لمحات آگے بڑھتے اور نشو وارتقاء کی منازل سے گذرتے جاتے ہیں اس کی ضروریات کا ماحول بھی وسیع ہوتا جاتا ہے اور والدین سے شروع ہو کر اعزہ واقربا، محلہ، مکتب ومدرسہ، شہر وملک تک پہنچ جاتا ہے اور اگر استعداد وصلاحیت، رفعت وعظمت کی سربلندیوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے تو ایک دن ساری کائنات کے ساتھ اس کا رشتۂ حیات وابستہ ہو جاتا ہے۔

یہی ماحول انسان کی اجتماعی زندگی وحیات کا ہے کہ گھر سے شروع ہو کر آخر کار ساری کائنات اُس کی آغوش میں سما جاتی ہے اور کائنات کے وہ تمام امتیازات جو خاندان، قبیلہ، برادری، قوم اور ملک کے نام پر قائم تھے مٹ کر خدا کی تمام مخلوق ایک کنبہ بن جاتی ہے۔

گویا انفرادی زندگی میں جس طرح ایک انسان طفولیت، صبارت اور مراہقت کے درجات طے کرنے کے بعد شباب کے عروج کو حاصل کر لیتا ہے اُسی طرح اجتماعی زندگی بھی ان امتیازاتِ اوّل سے

گذرکر "وحدتِ انسانی" کے عروج وارتقا پر پہنچ جاتی ہے اور یہی اُس کی آخری منزل اور مقصد حیات قرار پاتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح عالم روحانیات پر بھی طفولیت وصبارت کا دور آتا ہے اور رشد وبلوغت کا عروج وارتقا بھی حاصلِ وجود بنتا ہے اور اس منزل پر پہنچ کر کسی مزید نشو وارتقا کی حاجت باقی نہیں رہتی تو اس حقیقت کے پیشِ نظر جب ہم خدا کے پیغام اور نبیوں اور رسولوں کی رسالت کے ملّی اور دینی ادوار پر نگاہ ڈالتے ہیں تب ہم کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ انسانِ اول کے دور میں جس پیغام نے بساطِ دنیا پر صور پھونکا وہ اول اول بہت ہی محدود دائرہ رکھتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وسعت اور عروجِ ارتقا کی منازل پر گامزن ہوتا نظر آتا ہے تاہم ملکی اور قومی امتیازات کی حدود سے بے نیاز نہیں ہے لیکن جب وہ وقت آپہنچا کہ بنی آدم اپنی نسلی بقا کے لحاظ سے سنِ رشد وبلوغ کو پہنچ جانے والی تھی اور اس کے ذہنی ودماغی نشو ونما نے ارتقائی منزل کی آخری سیڑھی پر قدم رکھدیا تھا تو یہ تقاضائے وقت ضروری ہوا کہ اب ایک پیغام آئے جو خدائے واحد کی جانب سے تمام انسانی برادری، بلکہ انسانیت کے لئے "وحدت" کا پیغام ثابت ہو اور یہ شرف اُسی پیغام کو حاصل ہوسکتا تھا جو ابتدائی اور وسطانی دور کے پیغامات کے مقابلہ میں روحانیات کے رشد وبلوغت کا حامل ہو اور جس کے اساسی اور بنیادی اصولوں میں ارتقا کی وہ روح موجود ہو جس کے بعد کسی روحِ حیات اور صدائے حق کی تجدید کی ضرورت باقی نہ رہے اور یقیناً بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے انسانوں کے روحانی ارتقا کی تاریخی روشنی میں قرآن کے علاوہ کسی دوسرے پیغام کو یہ شرف حاصل نہیں ہے اور اس لئے رہتی دنیا تک ہر قسم کے روحانی انقلابات واصطلاحات کا مولد ومنشا صرف قرآن ہی رہے گا۔

لیکن اس مرحلہ پر پہنچ کر ہم کو اچانک ابتدا اور آغاز کی جانب نظر اٹھانا پڑتا ہے اور اس حقیقت کی کھوج لگانے کی فکر ہوجاتی ہے جس کو دینی اصطلاح میں "وحی" کہا جاتا ہے کیونکہ یہی

وہ حقیقت ہے جو کسی پیغام کو بشری اور انسانی پیغامات سے جدا کر کے کسی کلام یا کسی کتاب کو "پیغامِ الٰہی" قرار دیتی ہے۔

اگرچہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آج کا انسان اپنے ذہنی و دماغی نشوونما کے لحاظ سے اس درجہ کو پہنچ چکا ہے جس کو "رشد و بلوغت" کہا جاتا ہے مگر یہ بھی اسی دنیار مادی کا تجربہ ہے کہ جب کسی ذکی و فطین کی ذکاوت و فطانت حدِ اعتدال سے گذر جاتی ہے تو بسا اوقات وہ انسانی توازنِ دماغی کو کھو کر مالیخولیا اور جنون تک پہنچا دیتی ہے چنانچہ یہی حال انسانوں کی اجتماعی زندگی کا ہے خواہ وہ مادی حیات ہو یا روحانی یعنی جب انسان اس مقام پر پہنچ کر حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس راہ میں بھی اس کی حالت ایک مجنون یا مالیخولیائی انسان کی سی ہو جاتی ہے اور وہ ایسے امور کو گذرتا ہے جو کسی طرح بھی سلامت روی اور اعتدال سے مطابقت نہیں رکھتے۔

پس کوئی تعجب نہیں ہے اگر آج کے علمی دور میں یہ صدا گوش آشنا ہو رہی ہے کہ اس مادی دنیا کا تعلق مادیات ہی تک محدود ہے اور ماورار مادہ کوئی حقیقت موجود نہیں ہے اس لئے "وحی" بھی اُن خرافی تصورات و خیالات یا معتقدات کی ایک کڑی ہے جس کو دورِ جاہلیت میں انسانی دماغوں نے قبول کر لیا تھا ورنہ "وحی" نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ مادیات کے علاوہ یہاں کوئی شے موجود ہے۔

علمار مادیین نے اس علمی دور کے شروع میں دینی تصورات اور روحانی اعتقادات کا جس طرح شدت سے انکار کیا اور ان کو جاہلی خرافات قرار دیا اُن میں سے انکارِ وحی کو بہت نمایاں حیثیت دی انھوں نے کبھی کہا کہ انسان پر جب عصبی بیماری یا کمزوری مسلط ہو جاتی ہے تو اس کو ہسٹیریا کی قسم کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور وہ عالمِ بیہوشی یا نیم بیہوشی میں اوہام کی تخلیقی دنیا کے نئے نئے تماشے دیکھتا اور عجیب عجیب باتیں اور خبریں سنتا اور سناتا ہے۔ کبھی اس کو غیر معلوم آوازیں آتی ہیں اور کبھی مختلف اشکال سے متشکل انسانوں یا عجیب وغریب صورتوں کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جو اس سے باتیں کرتی، یا

اشارات کے ذریعہ کچھ کہتی نظر آتی ہیں اور یہی مرض جب کسی ایسے انسان پر طاری ہوتا ہے جو نیک خو، نیک سیرت، ہمدرد قوم، مصلح ملت ہو تو اس کے اپنے منتشر خیالات بیماری کے دورہ کے وقت تشکل ہو کر وہ سب کچھ ہو جاتے ہیں جن کا اظہار وہ شخص "وحی" کہہ کر کرتا یا فرشتہ کا نزول بتلا کر بیان کرتا ہے اور اگر وہ مریض نہیں ہے اور عصبی کمزوری میں بھی مبتلا نہیں ہے تو پھر وہ کذاب ہے اور جن باتوں کو "وحی" کہتا ہے ان کے بارے میں جھوٹ بولتا اور قصداً دھوکا دینا چاہتا ہے۔

بہرحال ان مادیین کے نزدیک جبکہ مادہ کے علاوہ نہ روح ہے اور نہ خدا اور نہ روحانیات کوئی شے ہے تو انکار وحی یقیناً اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہی سمجھنا چاہیے۔

فلسفۂ جدید اور انکار وحی و اقرار

سولہویں صدی عیسوی تک علماء مغرب بھی وحیِ الٰہی کے اسی طرح قائل تھے جس طرح آج بھی اسلام، نصرانیت اور یہودیت قائل ہے کیونکہ بائبل کی تعلیم بھی وحی کی حقیقت پر اس طرح یقین دلاتی ہے جس طرح قرآن کی تعلیم مگر جب سترہویں صدی میں علم کے نام سے شکوک کی دنیاءِ وسیع نے اپنا سکہ چلایا تو دین و مذہب کو بیکار ۔۔۔ وحی سے انکار کو علم کی روشنی قرار دیا اور اس کے اعتراف کو جہالت اور خرافات کی پیروی ظاہر کیا ابھی یہ دور ادیان و ملل کے اس اعتقاد پر مضحکہ خیزی ہی کر رہا تھا کہ انیسویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے امریکہ اور اس کے بعد یورپ میں مادی علوم ہی کے ذریعہ ایک نئے علم و اکتشاف کا آغاز ہوا اور انھوں نے دین و مذہب یا رسوم تقلیدی کی پیروی میں نہیں بلکہ علمی تجربیات کی فضا میں یہ اعلان کیا کہ یہاں صرف عالم مادیات ہی نہیں بلکہ مشاہد و محسوس مادیات کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے جس کو عالمِ ارواح کہنا مناسب ہے اور علمی تجربوں سے انھوں نے ثابت کیا کہ اگر مصنوعی طریقوں سے انسان کے مادی جسم اور حواس کو معطل کر دیا جائے تو پھر اس مادی شخصیت میں مستور روحانی شخصیت کارفرما نظر آئے گی اور اس کے ادراکات و علوم اور معرفت کی بلندی حیرت زا وسعت کے ساتھ عالمِ زیر و بالا تک رسا دیکھی جا سکے گی۔

وہ کہتے ہیں کہ اس محسوس اور مادی انسان میں ایک روحانی شخصیت موجود ہے اور انسان درحقیقت اُسی کا نام ہے مگر ہمارے یہ حواسِ خمسہ اُس کے احساس وتعین سے قاصر ہیں البتہ جب ہماری یہ مادی شخصیت کسی مصنوعی عمل سے یا خواب کی وجہ سے معطل ہو جاتی ہے تب اس باطنی شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں اور اس کے ادراکِ لطیف کی پہنائیوں تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مقناطیسی اثر سے کسی کو معمول بنا کر اُس پر مصنوعی نیند یا نیم بیہوشی طاری کر دیتے ہیں تو اس کی مادی شخصیت مقہور ہو جاتی ہے اور باطنی شخصیت اس قید وبند سے آزاد ہو کر ان امور تک رسائی حاصل کر لیتی ہے جن کا اس کی مادی شخصیت کو علم تو کیا گمان تک بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں انسان بہت سے غیبی امور اور مستقبل کے حوادث کا علم حاصل کر کے دوسروں کو بھی بتا دیتا ہے اور جہاں تک اس کے مادی جسم نے رسائی تک حاصل نہ کی تھی ان دور دراز مقامات کو عیاناً اور مشاہدۃً دیکھ دیکھ کر ان کے متعلق دریافت کردہ سوالات کا دست بدست صحیح جواب دینے لگتا ہے۔

چنانچہ امریکہ ویورپ کے علمار روحانیین۔ نے تقریباً تیس سال اس سلسلہ میں ہزاروں تجربے کئے اور بڑے بڑے علمارِ فلسفۂ روحانیات پر مشتمل کمیٹی نے ضخیم جلدوں میں ان کو مدون ومرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے علمی تجربوں نے متفقہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر ان کو مجبور کر دیا کہ انسان اس حقیقت ہی کا نام نہیں ہے جو مادی شخصیت میں ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے بلکہ اس کے اندر ایک اور شخصیت مستور ہے اور وہی ان اعضارِ انسانی کے لئے باعثِ تکوین اور موجبِ تحریک ہے جو ظاہر انسان کے ارادہ واختیار سے حرکت پذیر نہیں ہیں۔ مثلاً قلب، جگر، معدہ وغیرہ اس لئے اصل انسان وہ ہے نہ یہ جو محسوس ومشاہد ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو انسان کے جسمِ کثیف اور اس کے مادی افعال کے تعطل کی صورت میں قوی ہو کر مشاہد انسان کو ان امور سے باخبر کرتی اور ان علوم و معارف کا ادراک بخشتی ہے جو الہام یا وحی کہے جاتے ہیں گویا انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی خارجی

اثرات کے بغیر اُس کی جبلت و طبیعت ہی اس پر امور غائبانہ کا انکشاف کر رہی ہے۔

علماء روحانیین کی اس دریافت کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی قوتِ مدرکہ ودیعت ہے جس کا احساس حواس نہیں کر سکتے اور انسان نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح ہے لیکن اس کے ثمرات اور عطا کردہ معارف و علوم اور ادراکات پر مشاہدہ سے زیادہ یقین رکھتا ہے اور ان ادراکات و علوم کے مظاہرے اس قدر واضح اور یقینی ہوتے ہیں کہ خود وہی اُن کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ دوسرے بھی اس کے اعتراف پر مجبور نظر آتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص حساب سے قطعاً نا آشنا ہے اور اس کی عدم واقفیت اس کے رفقاء میں مسلم ہے تاہم جب مصنوعی طریقۂ تنویم سے اس کو نیم بیہوش کرنے کے بعد اس سے علم ریاضی کے مشکل سے مشکل سوالات کیے گئے تو اس نے فوراً ہی ایسے صحیح جوابات دیئے جن کو ماہرینِ علم ریاضی بھی کافی غور و خوض کے بعد دے سکتے تھے، اسی طرح مختلف ملکوں میں اس وقت جو ہو رہا تھا ایک دوسرے شخص پر بھی عمل کرنے کے بعد جب اس سے ان واقعات کے متعلق دریافت کیا تو اس نے ان واقعات کو اس طرح بیان کر دیا گویا وہ خود ہر واقعہ کو اپنی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ تجرباتِ علمی اس کے شاہد ہیں کہ بعض اشخاص ایسے پائے گئے بچپن میں جبکہ اُن کی عمر ریاضی مسائل کے سمجھنے کے بھی قابل نہ تھی" یعنی ۸ - ۹ سال کی عمر میں علم ریاضی کے دقیق مسائل کو آسانی سے سلجھا دیا کرتے تھے مگر جب وہ جوان العمر ہوئے اور ان کے باطنی مدرکات پر کثیف ظاہری شخصیت اور حواس ظاہری کا دباؤ زیادہ پڑا تو وہ ان حیرت زا جوابات دینے سے قطعاً قاصر نظر آنے لگے۔ جن کو وہ بچپن میں آسانی سے حل کر دیا کرتے تھے۔

غرض ان کا دعوٰی ہے کہ انھوں نے خوش اعتقادی یا دینی تقلید یا ملکی و وطنی رسوم سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ علمی تجربوں کی کسوٹی پر کس کر سیکڑوں انسانوں میں ایسے ہزاروں واقعات کا مشاہدہ کیا ہے

جن سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس مادی کثیف انسان کے اندر ایک ایسی زبردست باطنی شخصیت موجود ہے جس کے لئے یہ جسم اور اس کے ظاہری حواس و اعمال حجاب بنے ہوئے ہیں اور بعض مخصوص حالات میں جب اس کو اس کثافت کے دباؤ سے آزادی نصیب ہو جاتی ہے یا اس کا دباؤ نسبتاً کم ہو جاتا ہے تو پھر باطنی شخصیت کے واسطہ سے اس کی روح متجلی انسان کو حیرت زا علوم و معارف اور ادراکات سے روشناس کراتی ہے اور عظیم الشان انقلابات کا باعث بنتی ہے اور یہ مخصوص حالات کبھی مصنوعی ہوتے ہیں جو عمل تنویم یا طبعی خواب یا ریاضات و مجاہدات سے حاصل ہوتے ہیں اور کبھی فطری طور پر بچپن میں نمایاں نظر آتے ہیں اور جب عمر ترقی کر کے مادی انسان اور اس کے حواس قوی ہو جاتے ہیں تو یہ باطنی شخصیت اپنی کارفرمائیوں میں ماند پڑ جاتی اور بسا اوقات مستور ہو جاتی ہے۔

علماء مادیین کا یہ گروہ صرف اس لئے "روحانیین" کہلاتا ہے کہ ان کے نزدیک مادہ کے علاوہ ایسی باطنی روحی قوت موجود ہے جو اس قدر زبردست قدرت رکھتی ہے کہ اسبابِ ظاہر کی اعانت کے بغیر انسان کو علوم و فنون اور معارف و ادراکات کے لطائف و اسرار سے باخبر کرتی اور مادی اسبابِ معلومات کی نگاہ میں جو امور اور جو اشیاء پردۂ غیب میں ہیں ان کا مشاہدہ کرا دیتی ہے اس لئے ان کے علمی تجارب کا یہ فیصلہ ہے کہ "علم" نے ہمارے سامنے ایک بند دروازہ کھول دیا ہے اور کل جس کا ہم انکار کرتے رہے ہیں وہ آج ناقابلِ انکار حقیقت ہے مگر یہ وہ باطنی اور روحی طاقت ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہے اور کسی دوسری مخلوق (فرشتہ) کے ذریعہ یا اور دوسرے ذرائع سے باہر سے نہیں بخشی جاتی۔ اور کبھی یہ کیفیت خواب کی حالت میں بھی طاری ہوتی ہے اور بسا اوقات ایک شخص نیند میں مستقبل کے واقعات کا روز روشن کی طرح مشاہدہ کر لیتا ہے یا جن مسائل کو بیداری میں لاینحل اور مشکل تر سمجھتا رہا ہے وہ خواب میں آن کی آن میں حل ہو جاتے ہیں۔

پس جو علماء مادیین اس کا انکار کرتے ہیں وہ دراصل حقائق کے منکر ہیں، نیز جو نیک خصال،

کریم الاخلاق اشخاص قوموں اور ملکوں کی دینی و دنیوی سعادت کے لئے اصلاحی وانقلابی نظامِ حیات پیش کرتے ہوئے اس قسم کے علوم و معارف اور نکات کا مظاہرہ کرتے اور ان کو وحی یا الہام کہتے ہیں وہ نہ کاذب ہیں اور نہ مفتری ہیں اور نہ وہ دماغی اور غیر دماغی امراض کے مریض ہیں بلکہ اپنے دعوے میں سچے اور صادق القول ہیں۔ البتہ یا تو ان کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی باطنی شخصیت اور ملکۂ باطن کی قوتوں سے مرعوب ہو کر اس کو بشری طاقت سے خارج سمجھ لیتے ہیں اور یا قوتِ تخیلیہ ایک عجیب الہیئت شخصیت کو متشکل کر کے ان کو یقین دلا دیتی ہے کہ یہ علم و عرفان اس فرشتہ کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔

غرض ایک انسان کا اپنی جسمانی زندگی کے لحاظ سے بہت سے امور کے لئے جاہل، غبی، اور ناکارہ ہونا اور پھر یک بیک باطنی قوت کے ذریعہ جولانیِ طبع، فکرِ روشن اور ذہنِ رسا کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلوں کے پوشیدہ بھید، مستقبل و ماضی کے مستور کوائف و حالات کا انکشاف کرنا اور اقطاع و امصارِ بعیدہ تک پرواز کرتے ہوئے صحیح حالات سے مطلع کرنا اس بات کی صریح اور واضح دلیل ہے کہ اس کالبدِ خاکی میں ضرور ایک باطنی شخصیت پوشیدہ ہے اور یہ جسمِ خاکی اس کے لئے حجاب بنا رہتا ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ "وحی" کو جس معنی میں ادیان و ملل نے یقین کیا ہے مادیین عرصہ دراز تک اس کا انکار کرتے رہے اور چند صدی بعد جب علم نے ان پر روشنی کا مزید دروازہ وا کیا تب ان میں سے ماہرینِ علوم کی ایک بڑی جماعت نے اس کا اعتراف کیا کہ دنیائے موجود میں صرف مادہ اور محسوس ہی موجود نہیں ہے بلکہ ماورائے مادہ موجودات بھی حقیقتِ ثابتہ ہیں اور ان کا انکار علم و حقیقت کے انکار کے مرادف ہے۔

پس وہ روحانی قوت کے تو معترف ہوئے لیکن "وحی" کے متعلق اُن کے علمی تجربات نے اس سے زیادہ ان کی مدد نہیں کی کہ علم و یقین کی یہ نوع بھی دراصل انسان ہی کے اندر کی چیز ہے

خارج از انسان نہیں ہے اور یہ روحانی اور باطنی شخصیت، مادی شخصیت کے پردوں میں محجوب و مستور ہے اس لئے ہم کو جرأت کے ساتھ یہ کہنا چاہئے کہ اس حد پر پہنچ کر بھی "علمِ جدید" حدکمال تک نہیں پہنچ سکا اور ابھی مسلسل نت نئی ترقی کی طرف گامزن ہے اور وہ وقت قریب ہی آرہا ہے جب "علمِ جدید" کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ "وحی" کی جو حقیقت دین و مذہب کی راہ سے بیان کی گئی ہے "علمِ ظاہر" اس کے ادراک سے قاصر رہا اور اب علمی حیثیت سے بھی اس کو تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور "علم" کا یہ پہلو یقیناً موجودہ تمام علوم و ادراکات سے بلند ہونے کی وجہ سے ہمارے علوم سے علیحدہ نوع کا علم ہے جس کی معرفت کا ذریعہ ہم سے مستور مگر ذواتِ قدسی صفات پر منکشف ہے۔

اس لئے از بس ضروری ہے کہ وحی سے متعلق اُن مسائل کو سامنے لایا جائے جو مفہوم وحی، حقیقتِ وحی، امکانِ وحی اور وقوعِ وحی سے تعلق رکھتے ہیں تاکہ کشفِ حقائق کے بعد قرآن کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو سکے کہ وہ بلاشبہ "وحی الٰہی" ہے۔

وحی کے لغوی معنی "رازداری کے ساتھ کسی بات کی اطلاع دینا" لغت کی زبان میں "وحی" کہلاتا ہے یعنی جب کسی مخاطب کو اس طرح خفیہ خبر دینی ہو کہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہونے پائے تو عربی میں اس اطلاع کو یوں کہتے ہیں "وحیت الیہ" "اوحیت الیہ" نیز اگرچہ "وحی" معنی مصدری کا نام ہے لیکن اکثر و بیشتر اس خبر یا اطلاع پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو رازداری کے ساتھ دی گئی ہو۔

اصطلاحی معنی اور دین و مذہب کی اصطلاح میں اس بات کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر (نبی و رسول) پر القا کی جاتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں تعبیر کیجئے کہ "وحی" ایسے علم و عرفان کا نام ہے انسان جس کو اپنے نفس میں اس طرح پاتا ہے کہ اس کے متعلق اعتقاد جازم کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ یہ خدائے برحق کی جانب سے القا ہوا ہے خواہ اس علم و عرفان کے القا کے وقت کوئی آواز متمثل ہوئی ہو یا وہ بغیر آواز کے سنا گیا ہو اور وہ "قول اور لحن نے آواز نے" کا مصداق ہو۔ [1]

---

[1] یہ تعریف وحی متلو اور غیر متلو دونوں پر حاوی ہے۔

امکان وحی | اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس قسم کا علم و عرفان جو عامۃ الناس سے غائب ہو مگر ان کی مصالح سے ہی تعلق رکھتا ہو۔ کیا کسی ایسے انسان کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو خاص اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا ہو؟ اگر اس کا امکان ہے تو علمی مباحث میں اس کو کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے اور کس شکل میں اس کو قریب الفہم اور قرینِ عقل بنایا جا سکتا ہے؟؟

تو اس سوال کے حل کرنے کے لئے آپ خود اپنی عقل و فراست کو ہی حکم بنائیے اور دریافت کیجئے کہ اس عالمِ رنگ و بو میں کیا یہ حقیقت ہر جگہ بکھری ہوئی نظر نہیں آتی کہ یہاں عقل و فہم کے تفاوت کے اعتبار سے انسان مختلف درجات رکھتے ہیں اور اس تفاوت کا یہ حال ہے کہ جس بات کو ایک انسان محال اور ناممکن سمجھتا ہے دوسرا انسان اس کو نہ صرف ممکن جانتا بلکہ اس کے وقوع کا مشاہدہ کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی عقل و فراست جن حقائق فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کے بعد بھی بہ مشکل سمجھ پاتی ہے۔ دوسرے شخص کا فہم و ادراک نظر و فکر اور ترتیبِ مقدمات کے بغیر بداہۃً اس کو پالیتا ہے۔

پھر درجات کا یہ تفاوت صرف کسب و تعلیم ہی کی راہ سے نہیں ہوتا کہ ایک ہستی نے تعلیمی ریاضتؐ محنت کے بعد عقل و فہم میں ایسی حدت اور تیزی پیدا کر لی جس کو جاہل اور عامی پیدا نہ کر سکا اور اس سے محروم رہ گیا بلکہ تفاوتِ درجات کا یہ مظاہرہ خود فطرت اور قانونِ قدرت کی جانب سے ہوتا رہتا ہے اور انسانوں میں فطری طور پر بھی یہ فرق نمایاں نظر آتا ہے اور اس میں انسان کے کسب و اختیار کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں یہ بھی عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بعض امور معمولی اور متوسط افہام و عقول کے نزدیک نظری ہوتے اور دلیل و برہان کے محتاج نظر آتے ہیں اور بغیر ترتیبِ مقدمات ان کا حصول نہیں ہو سکتا لیکن ان سے بلند و عالی فکر و عقل کے نزدیک وہ بدیہی ہوتے ہیں اور بغیر کسی تامل کے وہ

ان کا انکشاف کرلیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ عقل و فکر اور فہم و فراست کے درجات کے علو اور ارتقار کی کوئی خاص حد معین نہیں کی جاسکتی اور اسی لئے اصحاب افکارِ عالیہ و عقول ذکیہ میں بھی درجات کا تفاوت موجود ہے یہی وجہ ہے کہ جن بعید اور عالی امور کو اربابِ ہمم قریب سے قریب تر سمجھتے اور عقل و خرد کے ذریعہ اُن کا مشاہدہ کرلیتے ہیں، کم درجہ کے اصحابِ عقول شروع میں ان کے منکر نظر آتے ہیں اور جب وہ وجود پذیر ہوجاتے ہیں تو ان کے تحقق کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے اور آہستہ آہستہ اُن سے اس درجہ مانوس ہوجاتے ہیں کہ کل کے انکار اور آج کی حیرت پر شرمندہ ہوکر یہ یقین کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ گویا یہ امور کبھی قابلِ انکار ہی نہ تھے اور اب اگر اُن کے سامنے کوئی انکار کرتا ہے تو پھر اس پر اُسی طرح غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں جس طرح شروع میں ذکی الفہم اور سریع العقل دانا پر ان امور کے انکار کے لئے کرتے رہے تھے۔

غرض تفاوت درجات کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور آج بھی موجود ہے اور ناقابلِ انکار حقیقت کی طرح موجود ہے۔

پس اگر یہ مقدمات ناقابلِ انکار اور بدیہی ہیں اور ان کے متعلق کبھی بھی دو رائے نہیں رہیں، اور آج بھی نہیں ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان صحیح اور بدیہی مقدمات کا جو نتیجہ اور ثمرہ لازم ہے وہ قابلِ تسلیم نہ ہو اور اس کا انکار کردیا جائے کیا ان مقدمات کا صاف اور سادہ نتیجہ یہ نہیں ہے کہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اس عالمِ ہست و بود میں ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جو "فیضانِ الٰہی سے" اپنے اندر ایسا جوہر صاف اور فطرتِ عالی رکھتی ہیں جن میں یہ استعداد موجود ہے کہ وہ عالم بشریت سے پرواز کرکے عالم روحانیات تک پہنچتی اور عالمِ قدس میں ان علوم کا مشاہدہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ سے ان کے لئے عینی شہادت حاصل کرلیتی ہیں عام عقول و فہم جن کا ادراک کرنے سے عاجز و قاصر ہیں یا دلیل و برہان اور ترتیب مقدمات کے بغیر ان کا حصول اُن کے لئے ناممکن ہے اور جو کچھ بڑے بڑے اصحاب عقل و فکر برسوں کی

محنتِ درس وتدریس اور تعلیم وتعلم سے حاصل کرتے ہیں یہ ہستیاں "فیضانِ الٰہی سے" فی البدیہہ اور علی الفور ان کا مشاہدہ اور معائنہ کر لیتی ہیں۔ اور پھر وہ ان علوم وعرفان کو دوسروں کی فلاح ونجاح اور اصلاح کے لئے پیش کرتی اور تعلیم ودعوت کے ذریعہ دوسروں تک ان کو پہنچاتی اور ان کے حق ہونے پر یقین دلاتی ہیں

اور عقل وفراست اس نتیجہ اور ثمرہ کو بھی کیسے فراموش کر سکتی ہے کہ اس غیر محدود تفاوتِ درجات کی موجودگی میں ناموسِ فطرت اور یدِ قدرت ضرور ایسے نفوسِ عالی کو منتخب ومخصوص کرئے جو ہر زمانہ میں انسانوں کی اجتماعی وانفرادی مصالحِ عامہ اور فلاح ابدی وسرمدی کے لئے تبلیغ ودعوت کا فرض انجام دیتے رہیں اور جب حضرتِ "انسان" دماغی اور عقلی قوٰی کے اعتبار سے سِن رشد وبلوغت کو پہنچ جائے تو پیغام ودعوت کا یہ سلسلہ بھی ایک ایسی حد پر جاکر ختم ہو جائے جو اپنے اساسی اور بنیادی اصولوں کے اعتبار سے رشد وبلوغت کا حامل ہو اور بنیادی مقاصد میں جس کے بعد کسی مزید دعوت وتبلیغ کی حاجت باقی نہ رہے اور ان کی روشنی میں دینی ودنیوی ترقی غیر محدود پر گامزن ہو سکے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ان نفوسِ عالیہ کو اگر ناموسِ فطرت کی جانب سے جوہر نفسی اور فطانت وفراست کی وہ معراج عطا ہوئی ہے کہ جس کی بدولت فیضانِ الٰہی ان کو بغیر محنت وکاوش کے یقینی علم وعرفان بخشتا اور موہبت کرتا ہے تو اس کے لئے باطن کی یہ روشنی ہی کافی ہوتی ہے اور کسی روحانی شخصیت کا اس کے اور خدائے برتر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا تو اس دعوٰی کے لئے اگر علمی برہان ودلیل موجود ہے تو پیش کی جائے ورنہ بآسانی یہ کہا سکتا ہے کہ جب علم جدید وقدیم دونوں متفق ہیں کہ اس عالم کیف وکم میں ایسے وجود کا پتہ لگتا ہے جو اس مادۂ کثیف سے بھی زیادہ لطیف جوہر سے بنے اور ہماری ان نگاہوں اور ظاہری حواس سے پوشیدہ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ان حقائق اقرار آج علمی تجربیات کے ذریعہ کیا جا رہا ہے نہ کہ خوش فہمی اور تقلید کی راہ سے تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا علمی قباحت لازم آتی ہے کہ ان ہی لطیف وجودات وحقائق میں سے بعض وہ لطیف وجود بھی ہیں جو علمِ الٰہی اور فیضانِ الٰہی کو

ان مقدس ہستیوں تک پہنچاتے اور علم و عرفانِ الٰہی کو ان پر روشن و متجلی کرتے ہیں۔ نیز نزولِ وحی میں آواز کا تمثل یا روح (فرشتہ) کا تشکل نہ عقل کے خلاف ہے اور نہ علمی نگاہ میں بے حقیقت یا خرافی ہے کیونکہ وہ جواہرِ معقولہ جو مادۂ کثیف سے زیادہ لطیف حقیقت رکھتے ہیں اور جن کا ثبوت علمی ذرائع یعنی ثبوتِ ارواح کے عنوان سے حاصل ہو چکا ہے اپنی حقیقت کے ساتھ متشکل و مصور ہو کر ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح ان نفوسِ قدسیہ کو نظر آتی اور ان سے خطاب و تکلم کرتی ہیں تو علمی تحقیق کا وہ کونسا گوشہ ہے جو اس کو ناممکن اور غیر معقول قرار دے سکتا ہے؟ اور اس تسلیم میں کونسی علمی قباحت لازم لاتی ہے کہ ان ارواح اور جواہرِ معقولہ کا تشکل نفوسِ قدسیہ کے ساتھ اس لئے مخصوص ہے کہ ید قدرت نے ان کے مزاج اور ان کی طبع و فطرت کا سانچہ دوسرے انسانوں کے مزاج کے مقابلہ میں ایسا مخصوص اور رفیع و بلند بنایا ہے کہ عام انسانی مزاج اس کی رفعت کا ادراک نہیں کر سکتے اور خدائے بخشندہ کی کارسازی اس کو صرف نفوسِ قدسیہ ہی کے لئے خاص رکھتی ہے۔

یہ جدا بات ہے کہ ایک مادہ پرست کی طبیعت ہی چونکہ ان حقائق کے اعتراف سے انکار کرتی ہے اور وہ اپنے انکار کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کی بجائے محض "انکار" ہی کو دلیل بنا لینا چاہتی ہے تو اس تعصبِ بیجا کے سامنے ہر قسم کی دلیل بے سود ہے۔

البتہ یہ کہا جائے گا کہ علم نے ابھی اس حد تک ترقی نہیں کی کہ وہ اس "ذریعۂ علم" کی حقیقت کو پا سکے جس کو نفوسِ قدسیہ یقین جازم کے ساتھ پا لیتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ خدا کی جانب سے ہے اور یہی امتیاز و خصوصیت ان کو رسول، نبی، اور پیغمبر کے القاب سے مشرف کرتے ہیں البتہ بعض ایسے نفوسِ قدسیہ بھی ہوتے ہیں جن کے مزاج اور فطرت کی ساخت اگرچہ ان پیغمبروں کے مزاج سے قریب تر ہوتی ہے لیکن باوجود اس کے وہ اس حد کامل اور "مثل اعلیٰ" تک نہیں پہنچ پاتے اور اُن کے ادراکات عقل و فراست اس سے نازل رہتے ہیں اور تفاوتِ عقل و فطرت کا مزید ثبوت پہنچاتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس

مرتبۂ رفیع کی رفعت کے لئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وقوعِ وحی | اس علمی بحث کے بعد بات اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ اب یہ غور کیا جائے کہ جس خاص علم کا نام "وحی" ہے کیا علمی و عقلی امکانات کے ساتھ ساتھ اس عالمِ ہست و بود میں اس کا وجود رہا ہے یا وہ آج بھی موجود ہے تو اس کا جواب "تاریخ" سے لینا چاہیے نہ کہ عقلی مباحث سے "الہیات" اور "مابعد الطبیعات" کے مسائل میں علماء عقلیین کی سب سے بڑی گمراہی یہی رہی ہے کہ انھوں نے عالمِ غیب کے حقائق کے صرف امکانات پر ہی علمی دلائل و براہین کا زور صرف نہیں کیا اور اقرار و انکار میں سے کسی ایک کو دلیلِ راہ نہیں بنایا بلکہ اس کے وجود کے اثبات و انکار پر بھی نظری دلائل سے کام لینے کی سعی ناکام کی ہے حالانکہ یہ نظری دلائل کی جگہ تاریخی ثبوت و عدمِ ثبوت کے محتاج ہیں اور اسی لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ عالمِ غیب سے متعلق جس مسئلہ پر بحث کی جاتی اول اُس کے امکان پر ہوتی اور اس کے لئے دلائلِ عقلی و نظری کو راہنما بنایا جاتا اور اگر اس کا امکان ثابت ہو جاتا تو پھر نظر و فکر کے رُخ کو نظری دلیل کی جانب نہیں بلکہ تاریخی ثبوت کی جانب پھیر دیا جاتا اور تاریخ سے دریافت کیا جاتا کہ کائنات میں اس مسئلہ کا وجود رہا بھی ہے یا نہیں۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی مسئلہ میں تاریخی ثبوت کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت عقل اپنی دلیل اور اپنے برہان سے تہی دامن ہو کر تاریخی ثبوت کو راہنما بناتی ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ سوال کے حل کے لئے عقلی دلیل، تاریخی ثبوت سے وابستہ ہو کر راہنما بنے گی صرف نظری بحث اس کے حل کیلئے کافی نہیں ہو سکتی

پس اس صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ قرآن کیا "وحی الٰہی" ہے تو تاریخ آگے بڑھ کر پُر شوکت الفاظ میں اس سچائی کا اعلان کرتی ہے کہ بلاشبہ قرآن "الوحی" ہے اور یہ اس لئے کہ جس مقدس ہستی پر اس کا نزول ہوا ہے ہر ایک مورخ پر تاریخ یہ روشن کرتی رہی ہے کہ

وہ ہستی رسمی علوم سے ناآشنا، ہر قسم کے مادی اسباب و وسائلِ علمی سے محروم، ہر قسم کی علمی سوسائٹی سے بے وسیلہ، وقتی علوم مدونہ سے بوجہ امی ہونے کے ناواقف، مقامِ پیدائش و تربیت کے لحاظ سے ناسازگار فضا میں تربیت یافتہ، غرض ہمہ قسم کے ذرائع علم و اخلاق سے بیگانہ مگر ذاتی اخلاق و کردار کے اعتبار سے اوصافِ حمیدہ میں ممتاز، باطنی کمالات و محاسن میں کامل و مکمل انسانی ہستی تھی جس نے عمر کے چالیس سال اپنی قوم کے ہر فرد بشر کے سامنے اسی حال میں گذارے کہ اچانک ایک روز یہ دعویٰ کرتا نظر آتا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر اور رسول ہے اور ساتھ ہی اپنی قومی زبان میں ایسا پیغام سناتا ہے جو ایمانیات و اعتقادات، اعمال و افعال، اخلاق و کردار کے علمی کمالات کا مخزن، دینی، سیاسی، معاشی اور معادی علوم و عرفان کا معدن، انفرادی و اجتماعی دستور و آئین کا منبع ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنے الفاظ و عبارات اور نظم و معانی میں معجزہ ہے بلکہ وہ پیغام کہ جس کی تعلیم اپنے عاملینِ حقیقی کے لئے عظیم الشان اور محیر العقول انقلاب، واصلاح کی کفیل اور عروج و اقبال اقوام و امم کی ضامن ثابت ہوئی اور ثابت رہی ہے۔ غرض اس کے متعلق تاریخ ادیان و ملل کا یہ فیصلہ ہے کہ بلاشبہ یہ پیغام حیاتِ ابدی کے لئے سرمایہ نجات اور فلاح و نجاحِ دنیوی کے لئے ذخیرۂ سعادت ہے اور اس کو پیش کرنے والا اُن نفوس قدسیہ میں سے ہے جس کی زندگی کا ہر ایک لمحہ ہر قسم کے رذائل سے پاک اور ہمہ قسم کے فضائل و فواضل سے روشن ہے تو جبکہ وہ اپنی صداقت مآبی اور دوست و دشمن کی جانب سے الصادق الامین کے لقب سے متصف حیاتِ طیبہ کے باوجود یہ دعویٰ کرتا نظر آتا ہے کہ اس کا یہ پیغام اپنا نہیں بلکہ خدا کا پیغام (الوحی) ہے تو اس کے دعویٰ کی تکذیب علم کا کام نہیں جہل کی ڈیوٹی ہے لہذا اس کے پرکھنے اور معیارِ حقیقت پر کسنے والے کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ وہ علمی دلائل سے اس کی صداقت کا امتحان کرے، اسی طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ وہ تاریخی حقائق کی ترازو میں بھی اس کو تولے اور دونوں طرق امتحان کے بعد فیصلہ کرے کہ قرآن کا یہ دعویٰ کہ وہ "وحی الٰہی" ہے غلط ہے یا صحیح، درست ہے یا نادرست۔

پس جو شخص بھی اس صحیح طریقِ امتحان کو اختیار کرے گا قرآن یقین دلاتا ہے کہ آخر کار اس کو یہ کہنا ہی پڑے گا کہ بلاشبہ قرآن "الوحی" ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیا میں قرآن نے اس حقیقت کا یوں اعلان کیا ہے۔

قل انما انذرکم بالوحی	کہد یجئے! میں جو تم کو ڈراتا ہوں سو "الوحی" کے ذریعہ
ولا یسمع الصم الدعاء	اور حقیقت یہ ہے کہ سنتے نہیں بہرے پکار کو جب
اذا ما ینذرون۔	کوئی ان کو ڈر کی بات سنائے۔

اور سورۂ طٰہٰ میں بھی اس طرح کہا ہے۔

ولا تعجل بالقرآن من قبل	اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک
ان یقضیٰ الیک وحیہ۔	پورا نہ ہو چکے تم پر اس کا اترنا۔

القرآن قرآنِ عزیز نے اپنی صفات عالیہ اور اوصاف کاملہ کا جس اعجازِ بیان کے ساتھ اظہار کیا ہے اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں زیرِ نظر آچکی ہے اور تمام صفاتِ حسنہ کے مجموعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کامل دستورِ صداقت، مکمل کتابِ ہدایت، اعلیٰ پیغامِ سعادت اور آخری برہانِ کرامت ہے، یہ نورِ روشن، روحِ حیات، حق و موعظت، ذکر و ذکریٰ اور حق و مصدق ہے، آیاتِ بینات ہے، کلام الٰہی ہے، صراطِ مستقیم ہے، اور مبارک ہے، علی و حکیم ہے، مصدق و مہیمن ہے اور حکم و حکمۃ ہے، تنزیل ہے، مثانی و متشابہ ہے، احسن الحدیث، حبل اللہ اور بشیر و نذیر ہے، عدل ہے، علم ہے اور منادی للایمان ہے اور اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ "الوحی" ہے۔

پس جب تم قرآن کے ان صفات کا مطالعہ کرتے اور اس کے نظم و معانی میں ان تمام اوصاف کی جھلک پاتے یا ان کو منور و روشن دیکھتے ہو تب تمہارا وجدان، تمہارا قلب اور تمہارے شوق و اشتیاق سے ایک پیاسے کی طرح اس کی تلاوت و قرارت کے لئے مضطرب و بے چین ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس کے اعجازِ بیان اور حلاوتِ نظم پر پروانہ وار نثار ہو جائیں اور بار بار اس کو دہرائیں

اور اس طرح روح کو تازگی اور نورِ قلب کے لئے بالیدگی کا سامان مہیا کریں۔

آپ دنیائے علم کے ہر گوشۂ ماضی و حال کی تفتیش کیجئے تو آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ اس عالمِ رنگ و بو میں کوئی کتاب، کوئی دستور، اور کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس کی تلاوت و قرارت اپنے اندر وہ جاذبیت رکھتی ہو جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہے کہ اُس کے معانی اور علوم و معارف کے فہم سے ناآشنا ہونے کے باوجود بھی اس کو الف سے یاتک حرف بحرف یاد رکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد ہر قرن اور ہر زمانہ میں لاکھوں اور کروڑں کی رہتی ہے اور یہی وہ نثر ہے جو نظم شیریں سے بھی زیادہ اپنی قرارت و تلاوت میں حلاوت و عظمت رکھتی ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن کے دورِ نزول سے آج تک جس قدر بے شمار حفاظ اس کتاب کے حافظ رہے ہیں دنیا اور دین کی کسی کتاب اور کسی تحریر کو اس کا ہزارواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا اور اس کی نمایاں وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے نظم و الفاظ میں حدِ اعجاز پر ہے جس کا مقابلہ کوئی کتاب نہیں کر سکی اور نہیں کر سکتی ہے اس لئے ماضی و حال بلاشبہ مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم جب یہ کہتا ہے کہ میں "القرآن" ہوں تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے کہ وہ بھی دوسری کتابوں اور تحریروں کی طرح پڑھی جاتی ہے اس لئے قرآن ہے بلکہ وہ اس حقیقت مسطورہ بالا کو پیش نظر رکھ کر یہ کہتا ہے کہ جبکہ میرے پڑھے جانے اور میرے نظمِ الفاظ کو دہرائے جانے میں بھی دوسری تمام کتابوں اور تحریروں پر خصوصی امتیاز حاصل ہے تو یہ کہنا حق بجانب ہے کہ قرارت دراصل میری قرارت ہے اور نہ صرف میرے اوامر و نواہی کے امتثال سے سعادتِ کبریٰ حاصل ہوتی ہے بلکہ میرے کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے میری قراءت و تلاوت بھی صد ہزار سعادتوں کا مجموعہ ہے اور اس لئے میں بلاشبہ "القرآن" ہوں۔

اور جبکہ نظم و معانی کے انسجام و اعجاز کے ساتھ میرا پیغام تمام کائناتِ انسانی بلکہ ہر ذی روح

کے لئے آخری پیغام حیات ہے اور ابدی و سرمدی نجات کا کفیل، حکمتِ بالغہ کا حامل، عظمت و کرامت کا پیکر، مجد و شرف کا معدن، عزت و غلبۂ حق کا مہبط ہے اور اس لئے کتبِ سماویہ میں میرا وجود حیرت و تعجب کا مرکز بن گیا ہے۔ پس اس میں کیا شبہ ہے کہ میں "قرآن مجید" بھی ہوں اور "قرآنِ کریم" بھی، "قرآن مبین" بھی ہوں اور "قرآنِ حکیم" بھی، "قرآن عربی" بھی ہوں اور "قرآنِ عجب" بھی، "قرآنِ عظیم" بھی ہوں اور "قرآن ذی الذکر" بھی۔

اور چونکہ میری صفت "قرآن" یا "القرآن" ایک نمایاں صفت ہے اس لئے میری رشد و ہدایت کے پیغام میں جگہ جگہ اس صفت کا کبھی تنہا اور کبھی صفاتِ بالا سے متصف اظہار کیا گیا ہے۔

چنانچہ بقرہ، نساء، مائدہ، انعام، اعراف، یونس، توبہ، نحل، اسرائیل، فرقان، زخرف، حجر، طٰہٰ، نمل، قصص، یوسف، احقاف، قمر، رحمٰن، مزمل، دہر، حشر، روم، سبا، حم، ق، ص، رعد، قیامہ، انشقاق میں ایک جگہ یا متعدد جگہ قرآن یا القرآن مذکور ہے اور سورۂ بروج میں "بل ہو قرآن مجید" آیا ہے اور سورۂ یٰسین میں "قرآن مبین" اور سورۂ حجر میں "القرآن العظیم" اور سورۂ یٰسین میں "القرآن الحکیم" اور سورۂ ص میں "القرآن ذی الذکر" اور سورۂ ق میں "القرآن المجید" اور سورۂ یوسف طٰہٰ، شوریٰ، زخرف میں "قرآنا عربیا" اور سورۂ جن میں "قرآنا عجبا" کہا گیا ہے۔

غرض یہ ہیں وہ صفاتِ عالی اور اوصافِ برتر جو مجموعۂ کمالات کے لحاظ سے قرآن عزیز کو نہ صرف نظامہائے دنیوی اور دساتیر بشری سے ممتاز کرتے ہیں بلکہ تمام کتبِ سماویہ پر فضیلت و برتری ظاہر کرتے ہیں اور "کلام الٰہی" ہونے کا ثبوت واضح اور برہان روشن پیش کرتے ہیں۔

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم

عدم تشدّد
اور
حفاظتِ خود اختیاری پر ایک نظر

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈووکیٹ ایبٹ آباد

ایک مدت سے عدمِ تشدّد (Non-Violence) کا اصول ہندوستانی سیاسیات میں ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا ہوا ہے، اور اب تک اس کے حق میں اور اس کے خلاف بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔

اس اصول کا سب سے بڑا حامی اور سب سے زیادہ پرچار کرنے والا ایک ہندو لیڈر ہے۔ اس کے خلاف مسلمانوں کا ایک طبقہ بڑے زور و شور سے عدمِ تشدّد کو ایک غیر اسلامی اصول ثابت کرنے میں مصروف ہے چنانچہ عوام عام طور سے اہنسا کو غیر اسلامی چیز سمجھنے لگ گئے ہیں۔

اس مضمون میں عدم تشدد کے متعلق خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلام میں عدم تشدد کی کوئی جگہ ہے یا مطلق نہیں اور یہ اصول کسی رنگ میں بھی اسلامی اصول کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مختصر الفاظ میں عدم تشدد سے یہ مراد ہے کہ تشدد نہ کیا جائے۔ اگر کوئی آدمی تشدد کرے تو اس کے مقابلے میں صبر، برداشت اور عفو سے کام لیا جائے۔ تشدد دو قسم کا ہوتا ہے، ایک تشددِ قولی، یعنی کسی کو بُرا بھلا کہنا، گالی دینا، توہین کرنا، غیبت کرنا وغیرہ وغیرہ، دوسرا تشدّدِ فعلی، یعنی کسی کو جسمانی ضرر پہنچانا۔

ہر شریعت میں اور ہر ملکی قانون میں تشدد کے مقابلے میں تشدد کے استعمال کرنے کا جواز موجود ہے۔ جوابی تشدد کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) تشدد کرنے والے کے خلاف قانونی عدالت تشدد کا حکم دے۔ یعنی مجرم کو قتل کرنے۔ جسمانی سزا دینے، جلاوطن کرنے، قید کرنے یا جرمانہ کرنے کے احکام صادر کرے۔

(۲) اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لئے یا کسی دوسرے شخص کی جان اور مال کی حفاظت کے لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ تشدد کرنے والے کے مقابلے میں تشدد کا استعمال کرے۔ اِس حق کو قانونی اصطلاح میں حقِ حفاظتِ خود اختیاری کہتے ہیں۔

اس مضمون کا اصل مدعا تو صرف اُس تشدد اور عدم تشدد کا بیان کرنا ہے جو حفاظتِ خود اختیاری میں استعمال ہوتا ہے لیکن چونکہ تشدد بحکمِ عدالت اور تشدد بمرادِ حفاظت کے مباحث ایک حد تک باہم وابستہ ہیں۔ اس لئے فہمِ مطالب کے لئے ضروری ہے کہ تشدد بحکمِ عدالت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر شریعت میں جوابی تشدد کا جواز موجود ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں بھی جہاں بروئے دھرم شاستر یہ عقیدہ ہے کہ کسی صورت میں بھی کسی ذوروح کو قتل کرنا جائز نہیں۔ وہاں بروئے ارتھ شاستر آتہ تائی کو قتل کرنا جائز ہے۔ ہندوں کی مذہبی کتابوں میں چھ قسم کے لوگوں کو آتہ تائی کہا جاتا ہے۔

(۱) وہ شخص جو کسی کے گھر کو آگ لگانے آیا ہو۔

(۲) وہ شخص جو زہر خورانی کا مرتکب ہو۔

(۳) وہ شخص جو مسلح ہو کر کسی کو قتل کرنے آئے۔

(۴) وہ شخص جو کسی کی دولت یا

(۵) عورت یا (۶) زمین چھین لے۔

منو کا قول ہے کہ آتہ تائی کو قتل کرنا گناہ نہیں۔ ایسے شخص کو بے تردد قتل کر دینا چاہیے۔ ہندو قانون میں اِس سے کم درجے کے تشدد کے جواب میں کم درجے کے تشدد کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

شریعتِ موسوی میں تشدد بجوابِ تشدد کے احکام جو موجودہ کتاب مقدس میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں۔

"جو کوئی کسی مرد کو مارے اور وہ مر جائے تو وہ البتہ قتل کیا جائے" پرانا عہدنامہ کتاب الخروج باب ۲۱۔ آیت ۱۲۔

"اور جو آدمی کو چُرا لے جائے اور اُسے بیچ ڈالے یا وہ اس کے پاس سے پکڑا جائے تو وہ البتہ مار ڈالا جائے گا" کتاب و باب مذکور آیت ۱۶۔

"۔ ۔ ۔ اور اگر وہ اس صدمے سے ہلاک ہو جائے تو تُو جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ" کتاب و بابِ مذکور آیات ۲۳ تا ۲۵۔

"اور وہ جو انسان کو مار ڈالے سو مار ڈالا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر کوئی اپنے ہمسائے کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا ہی پائے گا۔ توڑنے کے بدلے توڑنا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ دانت کے بدلے دانت، جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اس سے ویسا ہی کیا جائے۔" پرانا عہدنامہ۔ کتاب احبار۔ باب ۲۴ آیات ۱۷۔ ۱۹۔ ۲۰۔

"تو تم اس سے وہ سلوک کیجیو جو اُس نے چاہا تھا کہ اپنے بھائی سے کرے۔ تو اس طرح برائی کو اپنے درمیان سے دفع کیجیو۔ تاکہ باقی لوگ سنیں اور دہشت کھائیں اور آگے کو تمہارے درمیان ایسی شرارت پھر نہ کریں اور تیری آنکھ مروت نہ کرے کہ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، دانت کا بدلہ دانت، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہوگا۔" پرانا عہدنامہ کتاب استثنا۔ باب ۱۹ آیات ۱۹ تا ۲۱

توریت کی مندرجہ بالا آیات سے تشدد بجواب تشدد کی اجازت بلکہ ضرورت ثابت ہوتی ہے فی الواقعہ جوابی تشدد ضروری ہے کیونکہ یہ اور لوگوں کے لئے درسِ عبرت ثابت ہوتا ہے۔ اگر ظالم کے لئے کوئی سزا مقرر نہ ہو تو ظلم کے عام ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پرانے عہدنامے کی یہ آیات گو لفظاً جوابی تشدد بحکمِ عدالت کے متعلق ہیں، لیکن معناً ان کے اصول تشدد بحفاظتِ خود اختیاری پر بھی حاوی ہیں، اپنی جان اور اپنے مال یا کسی دوسرے کی جان اور اس کے مال کی حفاظت میں تشدد کا استعمال کرنا انسان کا فطری حق معلوم ہوتا ہے۔

آیئے اب جوابی تشدد کی اجازت اور ضرورت کے متعلق قرآنی آیات کی روشنی سے چشمِ بصیرت کو روشن کرنے کی سعی کریں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ	اور فرض کیا ہم نے اُن پر اُس (کتاب یعنی توراۃ)
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ	میں کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ
بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ	اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان
وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ۔ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ	اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے
فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ	ایسا ہی زخم، اور جو کوئی بخش دے اسے، پس وہ
وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ	کفارہ ہے اس کے لئے۔ اور جو کوئی حکم نہ کرے
فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔	اس چیز کے مطابق جو اللہ نے اتاری تو ایسے
(۵ – ۴۵)	لوگ ظالم ہیں۔

اس بارے میں توریت کی آیات آپ اوپر پڑھ چکے۔ اس آیتِ قرآنی میں انہی احکام کو دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔ اکثر علمائے اسلام اس طرف گئے ہیں کہ تورات کے یہ احکام جنھیں قرآن مجید نے بھی بیان کیا ہے ہمارے لئے بھی بمنزلہ قانون ہیں کیونکہ قرآن نے انھیں صراحت سے منسوخ نہیں کیا۔ لیکن بعض

علما کہتے ہیں کہ یہ آیتِ قرآنی صرف پرانے قانون کی خبر دیتی ہے۔ ہمارے لئے یہ احکام قانون نہیں ہیں بہر حال اس مضمون میں اِس اختلافِ رائے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں غور کے قابل یہ بات ہے کہ جہاں تورات میں یہ لکھا ہے کہ "تیری آنکھ مروت نہ کرے کہ جان کا بدلہ جان آنکھ کا بدلہ آنکھ، دانت کا بدلہ دانت، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں گا" وہاں قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ "جو کوئی بخش دے اسے، بس وہ کفارہ ہے اس کے لئے" یعنی اگر مقتول کے وارث قاتل کو اور مجروح زخم پہنچانے والے کو معاف کردے تو اس معافی کے بدلے اللہ تعالیٰ ورثا اور مجروح کے گناہ معاف کردیگا۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ "قاتل پر تین قسم کے حق ہیں ایک اللہ تعالیٰ کا حق۔ دوسرا مقتول کا حق، اور تیسرا ورثائے مقتول کا حق۔ پس جب قاتل نادم ہوا اور خدا کے ڈر سے تائب ہوکر اس نے اپنے آپ کو ورثائے مقتول کے سپرد کردیا (تاکہ اگر وہ چاہیں تو اُسے قتل کردیں) تو اس طرح اللہ تعالیٰ کا حق ساقط ہوگیا اور صلح و معافی سے حق ورثا ساقط ہوگیا۔ باقی رہا مقتول کا حق تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن قاتل سے مقتول کو معاوضہ دلادے گا۔ (یعنی قاتل کے بعض نیک کاموں کا اجر مقتول کو دیدیگا یا مقتول کے چند بُرے کاموں کی سزا قاتل کو دیدے گا) اور اس طرح قاتل و مقتول میں صلح کرادے گا۔"

پس قرآن مجید کی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قسم کے تشدد کے بدلے میں اسی قسم کا تشدد جائز ہے بلکہ فرض ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی اجازت دی ہے کہ مظلوم ظالم کو معاف بھی کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ قاتل کو بھی مقتول کے ورثا معاف کرسکتے ہیں۔ یہ حکم جوابی تشدد بحکم عدالت اور جوابی تشدد بحفاظتِ خود اختیاری دونوں صورتوں پر حاوی ہے۔ پس یہ ایک صورت ہے عدم تشدد یا اہنسا کی۔ اس بارے میں قرآن مجید کا ایک اور مقام بھی غور کے قابل ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ — اے ایمان والو۔ لکھا گیا ہے تم پر قصاص مقتولوں
الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ — کے بارے میں۔ آزاد ہو تو آزاد اور غلام ہو تو غلام

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى	اور عورت ہو تو عورت۔ اور جس (قاتل) کو اپنے
فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ	بھائی (فریقِ ثانی) کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے
فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ	تو معقول طور سے مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ
بِاِحْسَانٍ۔ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ	اس کو ادا کر دینا۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے
وَرَحْمَةٌ۔ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ	تخفیف ہے اور رحم۔ پس جس شخص نے اس کے
فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ	بعد تعدی کی اس کے لئے دردناک عذاب ہے
حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ	اور اے عقلمند لوگو تمہارے لئے قصاص میں زندگی
تَتَّقُوْنَ۔ (۲-۱۷۸-۱۷۹)	ہے تاکہ تم لوگ پرہیز کرو۔

قصاص سے مراد ہے تشدد بجواب تشدد۔ بدلہ لینا، قاتل کو قتل کے جرم کی سزا میں قتل کرنا یا زخم پہنچانے والے کو بدلے میں اسی طرح کا زخم پہنچانا قصاص ہے۔ ان آیات کی رو سے قصاص لازم ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی اجازت ہے کہ اگر مقتول کے ورثا قاتل کو یا مضروب ضارب کو معاف کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ قتل کی سزا صرف قتلِ عمد کی صورت میں ہوتی ہے ورثائے مقتول اگر قتل کی سزا معاف کر کے خون بہا لینا چاہیں تو چاہئے کہ وہ مناسب طور سے مطالبہ کریں اور ملزم کو چاہئے کہ وہ خون بہا بطیبِ خاطر ادا کر دے۔ قصاص کو فرض بتا کر اللہ تعالیٰ نے معافی کی اجازت بھی دیدی۔ یہ اُس کی طرف سے اپنے بندوں پر فضل و کرم ہے۔ تخفیف ہے اور رحمت ہے۔

ان آیات میں قصاص کے فرض ہونے کی حکمت بھی بتا دی اور کہا کہ قصاص میں تمہاری زندگی ہے فی الواقعہ اگر تشدد کے بدلے میں تشدد نہ ہو تو تشدد عام ہو جائے اور آدمی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ تورات میں بھی قصاص کے فرض ہونے کی بجائے یہی وجہ لکھی ہے " تو اس طرح برائی کو اپنے درمیان سے دفع کیجیو تاکہ باقی لوگ سنیں اور دہشت کھائیں اور آگے کو تمہارے درمیان ایسی شرارت پھر نہ کریں "

لیکن جہاں قصاص میں حکمت ہے۔ وہاں معافی میں بھی ایک حکمت پنہاں ہے جو آگے چل کر بیان ہوگی۔ پس ان آیات میں بھی عدم تشدد کی ایک صورت بیان ہوئی۔

الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ۔ کے متعلق مفسرین اور فقہا کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ بعض مفسر کچھ لکھتے ہیں اور بعض کچھ۔ بعض فقہا کی ایک رائے ہے بعض کی کچھ اور۔ لیکن یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کسی کمزور قوم کا کوئی غلام کسی بڑی قوم کے آدمی کو قتل کر دیتا تو اصل قاتل کی جگہ کمزور قوم کے کسی آزاد آدمی کو بدلے میں قتل کر دیتے اسی طرح عورت قاتل کی بجائے اس کی قوم کے کسی مرد کو قتل کر دیتے۔ اس کے برعکس اگر کمزور قوم کے کسی آدمی کو طاقتور قوم کا کوئی آزاد مرد قتل کر دیتا تو اس آزاد کی جگہ کسی غلام کو قتل کر دیتے۔ اسی طرح کی اور نامعقول اور نامنصفانہ رسمیں بھی عرب میں جاری تھیں۔ قرآن مجید نے ان بیہودہ رسموں کو بند کرنے کا حکم دیا۔ اس لئے قرآن مجید کے ان الفاظ کا یہی ترجمہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر قاتل آزاد ہو تو اسی آزاد کو قتل کرو، قاتل غلام ہو تو اسی غلام کو قتل کرو اور اگر قاتل عورت ہو تو اسی عورت کو قتل کرو

اب جوابی تشدد کے متعلق موجودہ انجیل کے احکام پر غور کیجئے۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرو بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی چاہے کہ تجھ پر نالش کر کے تیری قبا لے، کرتے کو بھی اُسے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا، جو کوئی تجھ سے کچھ مانگے اُسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔"

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا اپنے پڑوسی سے دوستی رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو اور جو تم پر لعنت کریں اُن کے لئے برکت چاہو جو تم کو

کینہ رکھیں ان کا بھلا کرو اور جو تمہیں دکھ دیں اور ستائیں ان کے لئے دعا مانگو، تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے فرزند ہو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں پر اُگاتا ہے اور راستوں اور ناراستوں پر مینہ برساتا ہے کیونکہ اگر تم انھیں کو پیار کرو جو تمہیں پیار کرتے ہیں تو تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ اور اگر تم فقط اپنے بھائیوں کو سلام کرو تو کیا زیادہ کیا؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ پس تم کامل ہو جیسا تمہارا باپ جو آسمان پر ہے کامل ہے" نیا عہد نامہ۔ متی کی انجیل۔ باب ۵ آیات ۳۸ تا ۴۸)

تشدد بجوابِ تشدد کے متعلق آپ توریت، انجیل اور قرآن مجید کے احکام پڑھ چکے اب آپ ان پر غور کریں اور اُن کا آپس میں مقابلہ کریں۔

(۱) تورات جو مذکورہ تینوں کتابوں میں سب سے پہلے کی ہے تشدد کے جواب میں تشدد کو لازم قرار دیتی ہے اور ساتھ ہی حکم کرتی ہے کہ تیری آنکھ مروت نہ کرے اور ظالم کو معافی نہ دے۔

(۲) انجیل تورات کے بعد کی کتاب ہے۔ اس میں تشدد بجوابِ تشدد سے بالکل منع کیا گیا ہے اور ہر صورت میں عفو سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے یعنی کلّی عدمِ تشدد کی تعلیم ہے۔

مشہور و معروف کتاب پرنس کے مصنف میکیاویلی کے مندرجہ ذیل خیالات گویا انجیل کی اِس تعلیم پر ایک تنقید ہے۔

"میکیاویلی کمینگی کمزوری اور بزدلی پر حملہ کرتا ہے اور اپنے معاصرین پر انہی کمزوریوں کا الزام لگاتا ہے جیسا کہ اس کی تاریخ فلارنس سے معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ یہ سوال کرتا ہے کہ انسان اپنی قدیم عظمت سے کیوں گر گئے ہیں تو اس کو اس کی وجہ ان کی تعلیم نظر آتی ہے۔ جس کے اثرات نے ان کو اپاہج اور مایوس کر دیا ہے اور اس تعلیم کا سب سے بڑا تعلق مذہب سے ہے قدما، آبرو، عزتِ نفس، قوت اور صحتِ جسم کو پسند کرتے تھے اور قدیم مذاہب ان فانی

لوگوں کو جو سپہ سالار، بہادر اور مقنن ہونے کی وجہ سے شہرت حاصل کرتے تھے، الوہیت کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ ان کے مذہبی رسوم شاندار ہوتے تھے۔ اور ان میں اکثر خونی قربانیاں ہوتی تھیں جو لازماً لوگوں کے دلوں میں تندی اور درشتی کا میلان پیدا کرتی ہوں گی۔"

"برخلاف اس کے ہمارا مذہب مقصد اعلیٰ کو دوسرے عالم میں جا رکھتا ہے اور اس دنیا کی آرزو کو نظرِ تحقیر سے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے وہ عجز اور ایثارِ نفس کو بڑی شاندار نیکیاں سمجھتا ہے اور فکر و مراقبہ کی خاموش زندگی کو خارجی امور کی عملی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر وہ ہم سے قوت کا بھی طالب ہوتا ہے تو قوتِ فعل کا نہیں بلکہ قوتِ برداشت کا۔ اس اخلاق نے انسانوں کو کمزور کر دیا ہے اور دنیا کو بے دھڑک اور شدت پسند آدمیوں کے سپرد کر دیا ہے جن کو یہ معلوم ہو گیا کہ اکثر لوگ بہشت کی امید میں بہ نسبت بدلہ لینے کے برداشت کرنے پر زیادہ مائل ہیں۔ میکیاویلی ساتھ ہی کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ انسانی بزدلی عیسائیت کی غلط تاویل سے پیدا ہوئی ہے لیکن ان الفاظ سے اُس کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ وہ عیسائی اخلاق اور قدیم اخلاق کے تمام تخالف کو واپس لیتا ہے اور اس کا خود جس طرف میلان ہے وہ ظاہر ہے"۔ [1]

(۳) قرآن مجید جو سب سے بعد کی کتاب ہے تشدد کے جواب میں تشدد کو لازم قرار دیتی ہے لیکن ساتھ ہی عفو کی اجازت بھی دیتی ہے۔

گویا پہلی کتاب میں قصاص ہے اور عفو نہیں۔ دوسری کتاب میں عفو ہے قصاص نہیں۔ تیسری کتاب میں قصاص بھی ہے اور عفو بھی۔ تورات کی تعلیم ایک انتہا پر تھی انجیل کی تعلیم دوسری انتہا پر۔ اور قرآن مجید کی تعلیم خیر الامور اوسطہا کا ایک روشن نمونہ۔ تورات کے احکام عوام کا دستور العمل بن سکتے ہیں۔

---

[1] تاریخ فلسفۂ جدید، جلد اول مصنفہ ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ۔ ترجمہ اردو از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ص ۲۷ - ۲۸ -

انجیل کے احکام خواص بلکہ انسانِ کامل کا معمول ہو سکتے ہیں اور قرآن مجید کے احکام ہر خاص و عام کے لئے شمعِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ ہم ان کتابوں کے احکام پر جتنا گہرا غور کرتے جائیں گے قرآن مجید پر ہمارا ایمان اتنا ہی زیادہ مضبوط ہوتا جائے گا۔

نوعِ انسانی کی تاریخ میں اہنسا کے اصول پر عمل پیرا ہونے کا سب سے پہلا واقعہ خود حضرتِ آدم علیہ السلام کی زندگی میں ہی پیش آیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ — اور سُنا ان کو حال آدمؑ کے دو بیٹوں کا سچا۔ جبکہ
إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا — دونوں نے قربانی کی پس قبول ہوئی ایک کی ان
وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ۔ قَالَ — میں سے اور نہ قبول ہوئی دوسرے کی۔ اس نے کہا
إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ — میں تجھے ضرور قتل کروں گا اس نے جواب دیا کہ اللہ
لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ — تو پرہیزگاروں ہی سے قبول کرتا ہے۔ اگر تو بڑھائیگا
لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ — میری طرف اپنا ہاتھ مجھے قتل کرنے کو تو میں نہیں
إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ ۔ إِنِّي أَخَافُ — بڑھاؤں گا اپنا ہاتھ تیری طرف تجھے قتل کرنے کو۔
اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۔ إِنِّي أُرِيدُ — میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہانوں کا پروردگار
أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ — ہے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو اٹھالے میرا گناہ بھی اور
فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۔ — اپنا گناہ بھی۔ پس تو ہو جا اہلِ دوزخ میں سے اور
وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۔ — یہی ہے سزا ظالموں کی۔ پھر آمادہ کر دیا اُسے اس
فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ — کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل کرنے پر۔ پس اُسے
فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۔ — قتل کر ڈالا اور ہو گیا خسارہ اٹھانے والوں سے۔

(۵ - ۲۷ تا ۳۰)

یہ قصہ ہے آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا۔ ان دونوں نے قربانی کی۔ ہابیل کی قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول کرلی اور قابیل کی قربانی کو قبول نہ کیا۔ اس پر قابیل کا رشک حسد میں تبدیل ہوگیا اور حسد دشمنی میں۔ قابیل نے ہابیل کو کہا کہ میں تجھے ضرور قتل کردوں گا۔ ہابیل نے جواب دیا کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف پرہیزگاروں کی قربانی قبول کرتا ہے اور اگر تو خواہ مخواہ مجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں جواب میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ کیونکہ میں خدا سے ڈرتا ہوں تجھ پر ہاتھ اٹھانے کی بجائے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اگر تو مجھے قتل کرے تو مجھ مظلوم کے گناہ بھی تیرے سر پر پڑیں اور تیرے اپنے گناہ بھی اور تو اس جرم کی پاداش میں دوزخ میں جائے کیونکہ ظالموں کی سزا یہی ہے اس پر قابیل نے ہابیل کو قتل کردیا۔

ظاہر ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے حملہ آور پر حملہ کرنا اور تشدد کے جواب میں تشدد کا استعمال کرنا نہ صرف شریعت اور قانون میں جائز ہے بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یقیناً ہابیل کو حفاظتِ خود اختیاری کا حق حاصل ہوچکا تھا لیکن اُس نے اِس حق کو استعمال کرنے اور قابیل کے تشدد کے جواب میں تشدد کرنے سے صاف انکار کردیا اور اہنسا کے اصول پر کاربند ہوکر مظلومانہ شہادت کو تشدد پر ترجیح دی۔

اس میں شک نہیں کہ ہابیل کا یہ طرزِ عمل جو آیاتِ بالا میں مذکور ہوا۔ خود ہابیل کا اپنا طرزِ عمل تھا۔ خدا کا حکم نہ تھا۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ یہ طرزِ عمل جس انداز سے قرآن مجید میں بیان ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہابیل کا یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کو منظور و مقبول تھا۔

ہابیل نے یہ جو کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ بھی اٹھالے، اس پر بعض اصحاب کو یہ تردد ہوا کہ ایک کا بوجھ دوسرا کیوں اٹھائے گا اور ایک کے گناہ کا بار دوسرے کے سر پر کیونکر پڑے گا۔ اس لئے انھوں نے بِاِثْمِی کا ترجمہ کیا "میرے قتل کا گناہ" یعنی تو اپنے اور گناہ بھی اٹھائے اور مجھے قتل کرنے کا

گناہ بھی۔ لیکن ہاشمی کا یہ ترجمہ محض سینہ زوری ہے۔ مظلوم کے گناہوں کا بار ظالم کے سر پر کس طرح پڑے اس سوال کا جواب بخاری کی ایک حدیث میں موجود ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ مظلمۃٌ لاخیہ من عرضہا او شیئٍ فلیتحللہ منہ الیوم قبل ان لا یکون دینارٌ ولا درھمٌ۔ ان کان لہ عملٌ صالحٌ اُخذ منہ بقدر مظلمتہ وان لم تکن لہ حسناتٌ اخذ من سیّئات صاحبہ فحمل علیہ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی اور چیز کے متعلق ظلم کیا ہو اُسے چاہئے کہ آج اس سے معاف کرالے قبل اس کے کہ (بروز قیامت) نہ درم رہے نہ دینار۔ اس وقت اگر اس (ظالم) کا کوئی عملِ صالح ہوگا تو اس میں سے بقدر اس کے ظلم کے لے لیا جائیگا (اور مظلوم کو دیدیا جائے گا) اور اگر اس (ظالم) کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو اس کے (مظلوم) ساتھی کی بدیاں لیکر اس (ظالم) پر لاد دی جائیں گی۔

قرآن مجید میں اکثر مقامات پر قصاص اور عفو یعنی جوابی تشدد اور عدمِ تشدد کا یکجا ذکر ہوا ہے اور جوابی تشدد کا جواز اور عدمِ تشدد کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۔ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ

اور وہ لوگ کہ جب ہوتا ہے اُن پر ظلم تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور بدلہ بُرائی کا ہے بُرائی ویسی ہی۔ پس جس نے معاف کر دیا اور صلح کر لی سو اس کا اجر ہے اللہ کے ذمے، بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جس نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ اس پر ظلم ہوا سو

مِنْ سَبِيْلٍ ۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ	ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام تو اُن پر ہے
يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ	جو ظلم کرتے ہیں لوگوں پر اور سرکشی کرتے ہیں زمین میں
بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	بغیر حق کے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ	ہے اور جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا سو یہ بیشک
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (۴۲-۳۹تا۴۴)	بلند ہمتی کا کام ہے۔

ان آیات سے پہلے کی آیات میں اچھے لوگوں کا ذکر تھا۔ انہی اچھے لوگوں میں وہ لوگ بھی مذکور ہوئے جو ظلم کا بدلہ لیتے ہیں چند اہم باتیں جو ان آیات سے ثابت ہوتی ہیں یہ ہیں۔

(۱) مظلوم کی طرف سے جوابی تشدد ظالم کے تشدد سے زیادہ یا بدتر نوعیت کا نہیں ہونا چاہئے حقِ حفاظتِ خود اختیاری کے موجودہ ملکی قانون میں بھی یہ شرط موجود ہے کہ جوابی تشدد ضرورت سے زیادہ نہ ہو

(۲) جوابی تشدد کے استعمال کرنے والے پر کوئی الزام نہیں اور نہ ایسا تشدد جرم کی تعریف میں آتا ہے

(۳) الزام صرف اس شخص پر ہے جو تشدد میں ابتدا کرتا ہے یا اس شخص پر جو جوابی تشدد میں مقررہ حدود سے گزر جاتا ہے۔

(۴) جو شخص ظالم کے تشدد کے جواب میں تشدد نہ کرے بلکہ اسے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ اُسے اِس صبر کا اجر عطا کرے گا۔

(۵) تشدد کے مقابلے میں صبر اور عفو سے کام لینا بڑی بلند ہمتی کا کام ہے اور بڑا قابلِ ستائش کام۔

پس ان آیات سے جوابی تشدد کی اجازت اور عدمِ تشدد کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ تبیان میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ قیامت کے دن ندا ہوگی کہ جس شخص کا خدا کے ذمے کوئی اجر ہے وہ اٹھے اور لے اس ندا کے جواب میں کوئی شخص نہ اٹھے گا سوائے اس کے جس نے کسی ظلم کو معاف کیا ہوگا (بحوالہ تفسیر حسینی)

عفواز گناہ سیرتِ اہلِ فتوت است　　بے حلم و عفو کارِ فتوت تمام نیست
بگذر ز جورِ خصم و کرم کن کہ عاقبت　　در عفو لذتےست کہ در انتقام نیست

قرآن مجید نے انجیل کی طرح قصاص کو ناجائز نہیں ٹھیرایا کیونکہ انسانی طبائع مختلف ہیں نہ ہر شخص اتنا بلند ہمت ہے کہ وہ ہر تشدد کو معاف کر سکے اور نہ ہر ظالم اس کا مستحق ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ بقول سعدی

بگفتیم در بابِ احساں بسے　　ولیکن نہ بایست با ہر کسے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا　اے نبی۔ بے شبہ ہم نے بھیجا ہے تجھے گواہی دینے والا اور
وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۔ وَدَاعِيًا إِلَى　خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا
ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۔ وَبَشِّرِ　اللہ کی طرف اس کے حکم سے۔ اور چراغ روشن اور
ٱلْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ فَضْلًا　خوشخبری دے ایمان والوں کو کہ ان کے لئے ہے، اللہ کی
كَبِيرًا ۔ وَلَا تُطِعِ ٱلْكَٰفِرِينَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ　طرف سے بہت بڑا فضل۔ اور نہ کہا مان کافروں اور
وَدَعْ أَذَىٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ ۚ وَ　منافقوں کا اور پرواہ نہ کر ان کی ایذا رسانی کی۔
كَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا ۝ (۳۳-۴۵ تا ۴۸)　اور بھروسہ کر اللہ پر اور کافی ہے اللہ کارساز۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلایا ہے کہ آپ نبی ہیں، بشیر ہیں، نذیر ہیں، داعی الی اللہ ہیں اور اہلِ عالم کے لئے روشن چراغ۔ اس لئے لوگوں کو اپنا پیغام سناتے جائیے۔ کفار کو عذابِ آخرت سے ڈراتے جائیے، ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی خوشخبری دیتے جائیے، دنیا میں نورِ ہدایت کی روشنی پھیلاتے جائیے نہ کافروں اور منافقوں کی باتوں میں آئیے اور نہ ان کی ایذا رسانی کی پرواہ کیجئے۔ اللہ کارساز ہے اور آخر کار آپ کی کارسازی کرے گا اور آپ کو کامیاب بنائے گا۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی ایذا رسانی کے مقابلے میں صبر، برداشت اور توکل

کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ ایذا کے مقابلے میں ایذا کا۔ یہ عدم تشدد کی تعلیم ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ — بلا (لوگوں کو) اپنے رب کے رستے کی طرف حکمت سے اور
الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ — اچھی نصیحت سے اور بحث کر ان کے ساتھ خوبصورت طریقے سے
اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ — بیشک تیرا رب بہتر جانتا ہے اس کو جو گمراہ ہوا اس کے رستے سے
سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ — اور وہی بہتر جانتا ہے راہِ راست پر چلنے والوں کو۔ اور اگر تم سختی
فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ — کرو تو سختی کرو ویسی ہی جیسی سختی تم پر کی گئی ہو۔ اور اگر تم
لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ۔ (۱۶-۱۲۵ تا ۱۲۶) — صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے۔

تبلیغ کا کتنا خوبصورت طریقہ بتایا گیا ہے۔ دعوت حکیمانہ ہو، نصیحت خوش آیند ہو اور بحث خوش آئندتر اگر ہمارے مبلغ اس اصول پر کاربند ہوں تو کامیابی یقینی ہو لیکن افسوس ہے کہ ہماری تبلیغ اور ہمارے تبلیغی مناظرے محض ایک دوسرے کی تضحیک پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور بس۔

ان آیات میں جوابی تشدد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم تشدد کرو تو بس اتنا ہی جتنا تم پر کیا گیا ہو اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ تم تشدد کے جواب میں تشدد نہ کرو۔ بلکہ صبر اور برداشت سے کام لو۔ جی چاہتا ہے کہ ان آیات کے نیچے مولانا ابوالکلام آزاد نے جو نوٹ لکھا ہے نقل کردوں تاکہ میری روکھی پھیکی عبارت کے صحرا میں ان کا ادیبانہ اسلوب بیان ایک سرسبز نخلستان کا کام دے جائے۔

"غور کرو قرآن کا محض ایک لفظ یا محض ایک ترکیب کس طرح مقاصد و مسائل کے فیصلے کر دیا کرتی ہے پہلے بصیغۂ امر دعوت کا حکم دیا گیا تھا "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ" پس چاہیے تھا کہ یہاں بھی بدلہ لینے کا حکم دیا جاتا کہ اگر تمہارے ساتھ سختی کی گئی ہے تو تم بھی ویسی ہی سختی کرو۔ مگر نہیں ایسا نہیں فرمایا بلکہ کہا "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ" اگر ایسا ہو کہ تم مخالف کی سختی کے جواب میں سختی کرنا چاہو تو چاہیے کہ حد سے نہ بڑھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سختی کے جواب میں سختی کا حکم نہیں ہے محض اجازت ہے

یعنی اگر ایک آدمی وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جو اس بارے میں بہتری اور خوبی کا مقام ہے۔ جھیل جانا اور بخش دینا۔ تو پھر اُسے بدلے کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن اجازت کو "بمثل ما عوقبتم" سے مقید کردیا، تاکہ زیادتی کا دروازہ بکلی بند ہوجائے۔ اب دو ہی راہیں کھلی رہ گئیں عزیمت تو اس میں ہوئی کہ جھیل جاؤ اور بخش دو۔ رخصت اس کی ہوئی کہ جتنی سختی کی گئی ہے۔ اتنی ہی تم بھی کرلو۔ اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے"

"اس آیت کی تفسیر میں امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک تقریر بہت مقبول ہوئی ہے جو انھوں نے "قسطاس المستقیم" میں لکھی ہے اور بعد کے مفسرین نے عموماً اسے اختیار کرلیا ہے وہ کہتے ہیں استعداد و فہم کے لحاظ سے ہر انسان کی طبیعت یکساں نہیں۔ اور ہر ذہنی حالت ایک خاص طرح کا اسلوبِ خطاب چاہتی ہے۔ اربابِ دانش کیلئے استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ عوام کے لئے موعظت کی اور اصحابِ خصومت کے لئے جدل کی۔ پس اس آیت میں قرآن نے تینوں جماعتوں کے لئے یہ تینوں طریقے بتلا دیئے ہیں۔ اربابِ دانش کو حکمت کے ساتھ مخاطب کرو، عوام کو موعظت کے ساتھ۔ اور اربابِ خصومت کے لئے جدل کی بھی اجازت ہے مگر بطریقِ احسن" (ترجمان القرآن ص ۳۴۵)

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم	اکثر اہلِ کتاب چاہتے ہیں کہ وہ پھیر دیں تمہیں
مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا	ایمان لائے پیچھے کافروں میں بوجہ حسد کے جو
مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ	ان کے دلوں میں ہے حالانکہ ظاہر ہوچکا ان پر
مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا	حق۔ پس معاف کرو اور درگذر کرو تا وقتیکہ
حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ	بھیجے اللہ اپنا حکم (یعنی حکم جہاد) بے شک
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲-۱۰۹)	اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسلام کی ابتدائی دور کی تاریخ شاہد ہے کہ مکہ معظمہ کے اہل کتاب کا فرآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان مٹھی بھر لوگوں پر جو ایمان لے آئے۔ طرح طرح کے تشدد اور ظلم کرتے تھے تاکہ انھیں تنگ کرکے پھر کافر بنا دیں۔ یہ اللہ کے بندے رنگا رنگ مصیبتیں اور اذیتیں جھیلتے رہے مگر ہاتھ نہ اٹھایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ "جھیل جاؤ اور بخش دو"۔ لطف یہ ہے کہ اس برداشت میں عفو کا عنصر بھی موجود تھا غور کیجئے کتنا بلند مقام ہے۔

جوابی تشدد اور عدم تشدد کی دو حیثیتیں ہیں۔

(۱) انفرادی اور شخصی (۲) جماعتی یا قومی

اس آیت میں جماعتی عدم تشدد کی تعلیم ہے، عدم تشدد دو چیزوں پر موقوف ہے ایک علو ہمت، دوسری مصلحتِ وقت۔ یہاں جس عدم تشدد کا حکم دیا گیا ہے اس میں یہ دونوں عنصر موجود ہیں، جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت مسلمان معدودے چند تھے اور کامیاب مدافعت کے ناقابل۔ یہ تو مصلحت کا عنصر لیکن بلند ہمتی کا عنصر بھی موجود تھا کیونکہ درگذر کے ساتھ عفو کی ہدایت بھی موجود ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کا شعر

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

ایک مقام ہے عقلِ مصلحت اندیش کا، ایک مقام ہے عشقِ مصلحت نااندیش کا۔ یہ دونوں مقام ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ کامیاب انسان کے لئے جہاں عشق مصلحت نااندیش کی ضرورت ہے وہاں عقلِ مصلحت اندیش کے بغیر بھی چارہ نہیں۔ یہ تھوڑے سے گنتی کے مسلمان اگر مقامِ عشق مصلحت نااندیش پر قائم نہ ہوتے تو یقیناً ان جانکاہ مصیبتوں کے مقابلے میں ارتداد کو ترجیح دیتے اور اگر وہ مقامِ عقلِ مصلحت اندیش سے ناآشنا ہوتے تو ضرور وہ مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوکر خودکشی کے مرتکب ہوتے لیکن وہ ان دونوں غلطیوں سے بچے رہے کیونکہ اُن کا ان دونوں مقاموں پر عبور تھا اسی لئے وہ مدافعانہ اقدام کے لئے اس وقت تک منتظر رہے جب کہ ان کی جماعتی طاقت بڑھ گئی۔ اور جہاد کا حکم آ گیا۔

لیکن دیکھئے جہاد کا حکم آیا بھی تو کتنا حکیمانہ اور کتنا منصفانہ۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ   اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن سے جو لڑیں تم سے اور
وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ   زیادتی نہ کرو۔ یقیناً اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ   کرتا اور قتل کرو انہیں جہاں پاؤ اور نکال دو ان کو
مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ   جہاں سے نکالا انھوں نے تم کو۔ اور فتنہ زیادہ سخت
مِنَ الْقَتْلِ ۔ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ   ہے قتل سے اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام (یعنی کعبہ)
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ   کے پاس۔ جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے وہاں۔ پس
فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۔ كَذٰلِكَ   اگر وہ لڑیں تم سے تو قتل کرو اُن کو۔ یہی سزا ہے کافروں
جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۔ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ   کی۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو یقیناً اللہ غفور اور
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى   رحیم ہے اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ
لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ   اور ہو جائے دین اللہ کے لئے۔ پس اگر وہ باز آجائیں
فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى   تو نہیں سختی مگر ظالموں پر۔ حرمت والا مہینہ
الظّٰلِمِيْنَ ۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ   حرمت والے مہینہ کے بدلے ہے اور سب حرمتوں
وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۔ فَمَنِ اعْتَدٰى   میں بدلہ ہے پھر جو زیادتی کرے تم پر تو تم بھی
عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى   اس پر زیادتی کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی
عَلَيْكُمْ ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ   اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں
اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ (۲۔ ۱۹۰ تا ۱۹۴)   کے ساتھ ہے۔

آیاتِ بالا میں قانونِ جنگ کے جو اصول بیان ہوئے وہ گہرے غور کے قابل ہیں۔

(۱) لڑائی صرف اسی قوم سے ہو سکتی ہے جو حملہ آور ہو۔ "الذین یقاتلونکم" اس سے معلوم ہوا

کہ جہاد مدافعانہ اقدام ہے۔

(۲) لڑائی میں فریقِ ثانی پر زیادتی کرنا جائز نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسلامی قانون کی رو سے ایٹم بم گرانا تعدی ہے اور خدا معتدین کو پسند نہیں کرتا۔

(۳) عرب کے رواج کے مطابق خانہ کعبہ کے نواح میں لڑائی کرنا منع تھا۔ اسی طرح بعض مہینوں میں بھی لڑائی بند ہوتی تھی۔ مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ تم بھی ان حرمتوں کا لحاظ کرو، ہاں اگر دشمن ان کا پاس نہ کرے تو اس صورت میں تم بھی آزاد ہو۔

(۴) اگر دشمن لڑائی بند کر دے تو تم بھی بند کر دو۔ "فان انتہوا" تاکید کے لئے یہ حکم مکرر بیان ہوا۔

(۵) لڑائی فتنہ دور کرنے کے لئے ہو فتنہ دور ہو جائے تو لڑائی بند کر دو۔ اس صورت میں فتنہ یہ تھا کہ کافر مسلمانوں کو پھر کفر میں واپس لانے کے لئے ان پر طرح طرح کے ظلم وستم کرتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کو ان کے مظالم سے تنگ آکر مکہ چھوڑنا پڑا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذہبی آزادی کیلئے لڑنا جائز ہے لیکن جب یہ آزادی مل جائے تو پھر لڑنا جائز نہیں۔ دین کا معاملہ خدا اور آدمی کے درمیان ہے کسی تیسرے شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس معاملے میں دخل دے۔ اگر کوئی دخل دے تو لڑو۔ لیکن جب پھر دین کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے تو لڑنا بند کر دو۔ "ویکون الدین للہ"

(۶) تعدی کے مقابلے میں اتنی ہی تعدی کرو جتنی تم پر کی گئی ہو، اس سے زیادہ جائز نہیں، یہ تقویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ تقویٰ کرنے والوں کا حامی و مددگار ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جوابی تشدد اگر ضروری بھی ہو جائے تو بھی وہ مشروط ہے بشرائطِ چند در چند۔ یہ نہیں کہ موجودہ زمانے کی لڑائیوں کی طرح انسانیت سوز حدود تک چلا جائے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ عدمِ تشدد اور اہنسا کی تضحیک کرتے ہیں اور دوسروں کو تشدد پر آمادہ کرتے رہتے ہیں وہ خود بڑے بزدل ہوتے ہیں اور دقت پر عورتوں کی طرح گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا	کیا نہیں دیکھا تونے ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا
اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ	کہ روک لو ہاتھ اپنے اور قائم کرو نماز اور ادا کرو
اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ	زکوۃ۔ پھر جب فرض کیا گیا ان پر جہاد تو اُن میں سے
الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ	ایک گروہ ڈرنے لگا لوگوں سے جیسے ڈرنا چاہیے
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ	اللہ سے یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور کہا انھوں نے
وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ	اے ہمارے رب کیوں فرض کیا تونے ہم پر جہاد
لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۴:۷۷)	اور ہمیں تھوڑی اور مہلت کیوں نہ دی۔

مکہ معظمہ میں جب کافر مسلمانوں کو ایذائیں دیتے تھے تو بعض مسلمان کہتے تھے کہ ہمیں جوابی تشدد کی اجازت دی جائے، انھیں کہا گیا کہ نہیں ابھی جہاد کا وقت نہیں، ہاتھوں کو روک رکھو اور نمازیں پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو لیکن جب جہاد کا حکم آیا تو یہ لوگ کافروں کے مقابلے سے اتنا ڈرنے لگے جتنا خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے کہ ابھی جہاد خلافِ مصلحت ہے اور مہلت ہونی چاہیے۔ مولانا رومؒ نے انہی لوگوں کے متعلق کہا ہے۔

درمیانِ ہمہ گر مردانہ اند	در غزا چوں عورتانِ خانہ اند
وقتِ لافِ غزو مستاں کف زنند	وقتِ جوش و جنگ چوں کف می فتند
وقتِ ذکرِ غزو شمشیرش دراز	وقتِ کر و فر تیغش چوں پیاز
لاف و غرہ ژاژ خارا کم شنو	با جُنُب ہا در صفِ ہیجا مرو
زانکہ زادو کم خبالا گفت حق	کز رفیقِ سست برگرداں ورق
پس مشو ہمراہ ایں اشتر دلاں	زانکہ وقتِ ضیق و بیم اند آفلاں
پس گریزند و ترا تنہا ہلند	گرچہ اندر لاف سحر با بلند

تو زرعنا یاں مجو ہیں کارزار　　تو زطاؤ ساں مجو صید و شکار

قرآن مجید میں تشددِ فعلی اور تشددِ قولی دونوں کے جواب میں عدمِ تشدد کی تعلیم موجود ہے۔

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ	یہی لوگ ہیں جنھیں اُن کا اجر دو دفعہ دیا جائے گا۔
بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ	بدیں وجہ کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ ہٹاتے ہیں
السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ	برائی کو بھلائی کے ساتھ اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے
وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ	اس سے خرچ کرتے ہیں اور جب وہ سنتے ہیں لغویات
وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ	تو اس سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي	ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے سلام ہے
الْجَاهِلِينَ۔ (۲۸ - ۵۴ و ۵۵)	تم پر، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔

آپ نے دیکھا عدمِ تشدد کا اجر دو چند ہے۔ صبر کرنے کی وجہ سے اور بدی کے بدلے میں نیکی کرنے کی وجہ سے عدمِ تشدد پر عمل کرنے والے لوگ جو کوئی لغویات سنتے ہیں تو اس کے جواب میں لغویات نہیں کہتے بلکہ یہ کہہ کر چل دیتے ہیں کہ "آپ جانیں اور آپ کے کام۔ ہمارا اور آپ کا ساتھ ممکن نہیں۔ آپ پر سلام ہو" فکر کا مقام ہے آج کل ہم میں کتنے ہیں جو اس نہایت حکیمانہ تعلیم پر کاربند ہیں۔

وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ	اور اللہ کے (نیک) بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر
عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ	عجز و انکسار کے ساتھ اور جب مخاطب ہوتے ہیں
الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (۲۵ - ۶۳)	ان سے جاہل تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو۔

کتنا بلند مقام ہے ہمارا یہ حال ہے کہ جہالت کے جواب میں جب تک ہم بڑھ چڑھ کر جہالت نہ کریں تسلی نہیں ہوتی ہمارا دستور العمل تو یہ ہے۔

الا لا یجھلن احدٌ علینا　　فنجھل فوق جھل الجاھلینا

مولانائے روم کے یہ دو شعر اسی بلند مقام کا پتہ دیتے ہیں جو اس آیت میں مذکور ہوا۔

اگر گویند زراقی و سالوس — بگو ہستم دو صد چندان و می رو
وگر از خشم دشنامے دہندت — دعا کن خوشدل و خندان و می رو

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ — اور وہ (نیک) لوگ جو نہیں شہادت دیتے
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا — جھوٹی اور جب وہ گزرتے ہیں لغو کے پاس سے
(۲۵ - ۷۲) — تو گزر جاتے ہیں وقار کے ساتھ۔

لغو قول یا لغو فعل پیش آجائے تو نیک بندے جواب میں نہ لغو کہتے ہیں نہ لغو کرتے ہیں بلکہ شرافت متانت اور وقار کے ساتھ کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ — اور صبر کر ان باتوں پر جو وہ کہتے ہیں اور چھوڑ دے
ھَجْرًا جَمِیْلًا ۔ وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ — اُن کو چھوڑنا خوبصورت اور چھوڑ دے مجھے اور ان
اُولِی النَّعْمَۃِ وَمَھِّلْھُمْ قَلِیْلًا — خوش حال جھٹلانے والوں کو اور مہلت دے انھیں
اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْکَالًا وَّ جَحِیْمًا (۷۳-۱۲) — تھوڑی بلا شبہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور دوزخ۔

یہ خطاب ہے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کافر اور مشرک آپ کو بیہودہ باتیں کہہ کہہ کر ایذا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ آپ ان کی باتوں پر صبر کریں اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں جانوں۔ لطف یہ ہے کہ چھوڑنا بھی وہ چھوڑنا نہیں جو بدزبان آدمی کے درخور ہے۔ بلکہ ہجرِ جمیل کی ہدایت خوبصورت چھوڑنا یہ نہ صرف عدمِ تشدد ہے بلکہ حسین وجمیل عدمِ تشدد۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ (سعدی)

فی الواقعہ یہ مقام بہت بلندی پر ہے۔ کوئی خوش بخت آدمی ہی وہاں تک پہنچ سکتا ہے

جوابی تشدد یعنی قصاص کی حکمت اور مصلحت پہلے بیان ہو چکی۔ قرآن مجید میں عدم تشدد یا اہنسا کی حکمت بھی بیان ہوئی ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ	اور نہیں برابر نیکی اور بدی (برائی کا) دفعیہ کر
اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ	ایسی بات سے جو اچھی ہو۔ پس یکایک وہ شخص جس
بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ	کے اور تیرے درمیان عداوت تھی۔ ایسا ہو جائیگا
وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ	جیسا ایک مخلص دوست اور نہیں ملتی یہ بات
صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ	مگر اُن کو جو صبر کرتے ہیں اور نہیں ملتی یہ بات
عَظِیْمٍ ۝ (۴۱ - ۳۴ و ۳۵)	مگر اس کو جو بڑا بخت والا ہوتا ہے۔

یہ حکمت ہے عدمِ تشدد کی اور یہ مقام ہے اُن لوگوں کا جنھیں اللہ تعالیٰ نے صابر اور ذو حظِّ عظیم کہا ہے حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "حسنِ خلق آنست کہ خلق را نرنجانی و رنجِ خلق بکشی بے کینہ و مکافات"

یہاں یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ اصحاب جو قرآن مجید کے ایک نصف کو دوسرے نصف سے منسوخ ثابت کرنے کے شائق ہیں تقریباً تمام مذکورہ بالا آیات کو آیہ سیف سے منسوخ قرار دیتے ہیں لیکن وہ لوگ جو ان نہایت حکیمانہ اور زریں تعلیمات کو منسوخ کہنے کی گستاخی نہیں کر سکتے یہ نہیں کہہ سکتے کہ عدمِ تشدد یا اہنسا کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

خطبہ جمعہ کی زبان

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

حضرت مولانا گیلانی کا یہ مضمون امید ہے ارباب علم اور اصحاب فتوٰی توجہ سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ دیوبند کے بعض مشہور اکابر پہلے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھا چکے ہیں، مولانا نے اپنی جدید تحقیق کی بنیاد تتارخانیہ کی جس عبارت پر رکھی ہے علامہ ابن عابدین (شامی) کا فیصلہ اس کے متعلق یہ ہے "لکن کونہا رجعا الی قولہ فی الشروع لم ینقلہ احد وانما المنقول حکایتہ الخلاف وما فی التتارخانیۃ فغیر صریح فی تکبیر الشروع بل ہو محتمل لتکبیر التشریق او الذبح بل ھذا اولیٰ، لانہ قرنہ مع الاذکار الخارجیۃ عن الصلوٰۃ یعنی نہ تو دربارۂ تکبیر صاحبین کا رجوع امام صاحب کی جانب ثابت ہے اور نہ یہ واضح ہے کہ تتارخانیہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ تکبیر تحریمہ کے متعلق ہے۔

بہر حال خطبۂ جمعہ کی سرکاری زبان کا مسئلہ ہمارے خیال میں ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کا فیصلہ چند متفرق قیاسات کو یکجا کر دینے سے نہیں ہو سکتا۔ (عتیق الرحمٰن عثمانی)

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے ہندوستان کے اساطین صوفیہ کے تحقیقی حالات کا جو سلسلہ برہان میں شروع کیا ہے بڑا مفید سلسلہ ہے۔ حضرت مولٰنا فخر قدس اللہ سرہ العزیز کی سیرت طیبہ غالباً اس سلسلہ کی دوسری قسط ہے حق تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں کہ توفیق پروفیسر صاحب کی رفیق ہو، مولانا فخر رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کے آخر میں یہ جو روایت نقل کی گئی ہے۔

"پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی در یں مملکت خوانده شود برائے چیزے کہ موضوع است حاصل نشود، الا برائے سائر الناس فائدہ ندارد کہ از زبان عربی واقف نیستند (فخر الطالبین ص ۴۲) برہان ص ۱۰۷ فروری ۱۹۴۷ء

اس وقت اسی کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے، ایک زمانہ سے ہندوستان کے حنفی علماء میں یہ مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے۔ عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبۂ جمعہ کو غیر مسنون قرار دینے والے حضرات کے دلائل

عام طور پر مشہور ہیں، غالباً ان میں سب سے قوی تر دلیل وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے پیش فرمائی ہے کہ

"غیر عربی ممالک میں حالانکہ جمعہ و جماعات کا عہد صحابہ میں ظاہر ہے کہ ہر مفتوحہ ملک میں انتظام تھا لیکن کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ان غیر عربی ممالک کے باشندوں کی رعایت سے سننے والوں کی زبان میں خطبہ کے ترجمہ کی اجازت دی گئی ہو"

مجھے اس وقت مسئلہ کی دلیلوں سے بحث نہیں ہے، پوچھنے والے جو یہ پوچھتے ہیں کہ شہادت کا نہ ملنا، اس کو وجودِ شہادت قرار دینا، یا کسی مباح فعل کو نہ کرنا، فعل کے عدم اباحت کی دلیل کیا بن سکتی ہے؟ کتاب و سنت میں ترجمہ کی ممانعت نہیں ہے اس لئے اس کو مباح سمجھنا چاہئے، صحابہ نے اگر کسی فعل مباح پر عمل نہ کیا تو ان کا عمل نہ کرنا اس فعل کی اباحت کو کیا کراہت سے بدل دیگا؟ نیز غیر عربی زبانوں سے عموماً صحابہ کی ناواقفیت بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ ترجمہ کے فعلِ مباح پر وہ عمل نہ کر سکے۔

بہرحال اصولی سوال و جواب کے سلسلے کو میں چھیڑنا نہیں چاہتا، بلکہ اس وقت یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "مسلک حنفی" جس کے مسلمانانِ ہند اپنی صلوات و صیام عقود و معاملات وغیرہ میں پابند ہیں اس کا اس باب میں صحیح نقطۂ نظر کیا ہے؟

جاننے والے جانتے ہیں کہ یہاں دراصل دو مسئلے ہیں ایک تو قرآن کے ترجمہ کا مسئلہ ہے یعنی بجائے قرآن کی اصل عربی عبارت کے نماز میں حق تعالیٰ کے کلام کا ترجمہ کسی زبان میں کر کے اگر کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

دوسرا مسئلہ قرآن کے سوا دوسرے اذکار (مثلاً تکبیر، تسلیم، تشہد، درود، قنوت، خطبہ، تسبیحات سجود و رکوع وغیرہ کا ہے کہ بجائے عربی الفاظ کے اسی مفہوم کو جو عربی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں غیر عربی الفاظ میں ترجمہ کر کے نمازوں میں کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

متنِ کنز میں دوسرے مسئلہ کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ او بالفارسیہ صح (یعنی بجائے عربی کے ان اذکار کو کوئی فارسی میں ترجمہ کر کے پڑھے تو یہ درست ہے) پھر چونکہ ایک اور سوال پیدا ہوتا تھا یعنی ایک آدمی ایسا ہے جو عربی الفاظ میں ان اذکار کو ادا کر سکتا ہے اور دوسرا آدمی ایسا ہے

جو عربی الفاظ میں ان اذکار کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہے، دوسری صورت میں تو امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ صاحبین ابو یوسفؒ و محمدؒ سب ہی اجازت دیتے ہیں البتہ عربی الفاظ میں تعبیر کی قدرت رکھتے ہوئے بھی غیر عربی الفاظ میں ان اذکار کو کوئی اگر ادا کرے تو لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کو اس وقت بھی اجازت دیتے ہیں لیکن صاحبین ایسی صورت میں اس طریقۂ عمل کو مکروہ قرار دیتے ہیں عینی نے کنز کے حاشیہ میں لکھا تھا کہ۔

والفتوٰی علی قول الصاحبین	یعنی صاحبین (ابو یوسف و محمد) کے قول پر علما نے فتویٰ دیا ہے

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسی صورت میں کراہت ہی کو ترجیح علما نے دی ہے ان اذکار کے سلسلہ میں خطبہ کو بھی لوگوں نے داخل کیا ہے، اس لئے حاصل یہی نکلتا ہے کہ عینی کے قول کے مطابق جیسے نماز کے اذکار کا بحالت قدرت غیر عربی الفاظ میں ترجمہ مکروہ ہے اسی طرح خطیب جو عربی تعبیر پر قادر ہو اس کے لئے غیر عربی الفاظ میں خطبہ کو پڑھنا مکروہ سمجھا جائے گا، فتویٰ اسی پر ہے عینی کے قول سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ان تفصیلات کو کنز کی مشہور شرح فتح المعین میں نقل کرنے کے بعد عینی کے دعویٰ پر "فیہ نظر" (یعنی کراہت ہی کے پہلو پر فتویٰ دیا گیا ہے عینی کا یہ دعویٰ بحث طلب ہے) کے الفاظ سے اعتراض کر کے آگے تتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

ان الشروع بالفارسیۃ	یعنی نماز کی تکبیر کو فارسی زبان میں شروع کرنا بالاتفاق سب کے
کالتلبیۃ یجوز اتفاقا	نزدیک جائز ہے جیسے حج میں لبیک بجائے عربی کے فارسی میں بھی کہنا جائز ہے

اور آخر میں اسی تتارخانیہ کے حوالہ سے صاحب فتح المعین اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ

محصلہ انہ فی مسئلۃ الشروع	خلاصہ یہ ہے کہ باوجود عربی پر قادر ہونے کے فارسی زبان
بالفارسیۃ ولو مع القدرۃ علی العربیۃ	میں نماز کو شروع کرنا یعنی فارسی میں تکبیر کا ترجمہ کرنا اس
رجعا الی قولہ بخلاف القراۃ بہا مع	مسئلہ میں ابو یوسفؒ اور محمد بن حسنؒ نے رجوع کر کے امام
القدرۃ علی العربیۃ فانہ رجع الی	ابو حنیفہؒ کے مسلک کو اختیار کر لیا ہے اور قرآن کی قراۃ میں
قولھما ومن ھھنا حصل الاشتباہ	امام ابو حنیفہؒ نے ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے

(فتح المعین ص ۱۸۳)

مذکورہ بالا عبارتوں کو چاہئے کہ اصل کتاب بھی علماء دیکھ لیں مسئلہ کی اس حقیقت پر مطلع ہونے کے بعد میں اب یہ سمجھا ہوں کہ عربی زبان کی تعبیر پر قادر ہونے کے باوجود قرآن کے سوا دوسرے اذکار (یعنی وہی تکبیر و تسلیم، تشہد، تسبیحات، درود جس میں خطبۂ جمعہ بھی بالاتفاق داخل ہے) ان کے متعلق ہمارے تینوں امام یعنی امام ابوحنیفہؒ قاضی ابویوسفؒ، ومحمد بن حسنؒ سب ہی اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر کسی کراہت کے غیر عربی الفاظ میں ان کا ترجمہ جائز ہے مبسوط کے حوالہ سے اسی موقع پر فتح المعین ہی میں نقل کیا ہے کہ من غیر کراھۃ علی الاصح علی ماذکرہ السرخسی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں صاحبین (ابویوسفؒ ومحمدؒ) کا رجحان ان اذکار کے متعلق بھی کراہت کا تھا اور امام ابوحنیفہؒ جواز کے قائل تھے لیکن بعد کو دونوں صاحب اپنے استاذ کے ہم نوا ہو گئے، اس لئے حنفی مذہب کا اب یہ اجماعی مسئلہ ہوا کہ سارے غیر قرآنی اذکار جن میں خطبہ جمعہ بھی شریک ہے ان کا ترجمہ عربی پر قادر ہونے کے باوجود خطیب کر سکتا ہے اور کسی قسم کی کراہت اس میں نہیں ہے۔

اسی کے مقابلہ میں قرآن کے ترجمہ کے متعلق امام ابوحنیفہؒ نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کیا یعنی قرآن کا ترجمہ نماز میں جائز نہیں ہے جیسا کہ صاحب فتح المعین نے لکھا ہے کہ قرآن اور غیر قرآنی اذکار میں لوگوں نے فرق نہیں کیا اور مشہور کر دیا گیا کہ امام ابوحنیفہؒ پہلے جواز کے قائل تھے لیکن بعد کو ابویوسفؒ و محمدؒ کے قول کی طرف انھوں نے رجوع کر لیا حالانکہ مسئلہ کی یہ صحیح تعبیر نہیں ہے بلکہ یہ دونوں الگ الگ مسئلے ہیں ایک مسئلہ یعنی قرآن کے متعلق امام ابوحنیفہؒ نے رجوع کیا اور غیر قرآنی اذکار میں صاحبین نے ابوحنیفہؒ کے مسلک کی طرف رجوع کیا اس لئے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

فظاھرہ کالمتن رجوعھما الیہ	تاتارخانیہ کی عبارت کا کھلا ہوا اقتضاء وہی ہے جو متن (کنز) کی عبارت سے معلوم
لا ھو الیھما فاحفظہ فقد	ہوتا ہے یعنی غیر قرآنی اذکار میں صاحبین ہی نے ابوحنیفہؒ کے قول کی طرف رجوع کیا
اشتبہ علی کثیر حتی الشرنبلالی	نہ کہ ابوحنیفہؒ نے ان دونوں کے قول کی طرف اس کو خوب اچھی طرح یاد رکھو اکثر کو شبہ ہو گیا حتی کہ شرنبلالی کو بھی

ایک زمانہ سے جی چاہ رہا تھا کہ فتح المعین کے اس فیصلہ کو علماءِ احناف کے سامنے پیش کروں آج موقعہ مل گیا فقیہ النفس بزرگوں سے توقع ہے کہ اس کی طرف رجوع فرمائیں گے۔

ادبیات

فردوسِ خیال

از جناب ماہر القادری

اب نہیں ہے وہ نگاہِ شوق کی بے مایگی — بند آنکھوں کو مبارک عشرتِ نظارگی

اُس کی وہ مجھ پر توجہ اور پھر یکبارگی — ہوش کو نیند آ گئی، بیدار تھی دیوانگی

گریۂ شبنم کو پھولوں سے سہارا مل گیا — آنسوؤں نے پھونک دی گلشن میں روحِ تازگی

اہلِ کشتی کو غمِ طوفان و بیمِ موج موج — اہلِ ساحل مبتلائے فتنۂ آسودگی

لمحہ لمحہ اضطراب و لحظہ لحظہ انقلاب — ختم ہونے کو ہے شاید اقتدارِ خواجگی

ہر نظر لطفِ تجلی، ہر نفس پیغامِ دوست — ایسے عالم میں ہے کس کو فرصتِ آوارگی

میری شانِ بندگی مختار ہے آزاد ہے — میرا یہ مسلک نہیں ہے "بندگی، بیچارگی"

او نگاہِ فتنہ ساماں! اے ادائے کامیاب! — تو نے کس کافر سے سیکھی ہے تغافل پیشگی

دیکھتے ہیں آپ ماہرؔ کو عجب انداز سے — کچھ توجہ، کچھ حیا، کچھ ناز، کچھ بیگانگی

نوائے وحشت

از جناب ماہر القادری

[illegible]

Papal Dispensations & indulgence.

تبصرے

دلی کی چند عجیب ہستیاں از جناب اشرف صاحب صبوحی تقطیع متوسط ضخامت ۲۷۴ صفحات طباعت اور کتابت بہتر شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی پتہ۔ قیمت عہ/ بلا جلد اور ۳ مجلد

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد دلی کی بہار لٹ گئی اور اس کا سہاگ اجڑ چکا تھا لیکن پھر بھی اس میں ایک بانکپن اور ایک خاص طرح کی دلکشی تھی اور یہ بانکپن طبقۂ علیا کے لوگوں سے لیکر نیچے درجہ کے لوگوں اور معمولی پیشہ وروں تک میں پایا جاتا تھا۔ اس کتاب میں اسی دور کی چند عجیب ہستیوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ جس طرح یہ ہستیاں مثلاً میر باقر، مٹھو بھٹیارا، گھمی کبابی، مکن نائی، مرزا چپاتی، بیرجی کوے، سیدانی بی بی، نیازی خانم وغیرہم اپنے عادات واطوار، سج دھج، وضع قطع، بات چیت اور طور طریق کے لحاظ سے نہایت دلچسپ اور عجیب ہستیاں ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے حالات جس زبان میں سنائے گئے ہیں وہ بھی دلی کی خالص ٹکسالی اور لال قلعہ کی بیگماتی زبان ہونے کی وجہ سے نہایت دلچسپ، شیریں اور بہت عجیب وغریب ہے۔ اب اس زبان کے لکھنے اور بولنے والے دلی میں بھی خال خال ہی رہ گئے ہیں اور انھیں میں ایک اس کتاب کے فاضل مصنف ہیں۔ جو اربابِ ذوق، دلی کی پرانی معاشرت، بول چال اور قدیم تہذیب وتمدن کی جھلک دیکھنا اور ساتھ ہی یہاں کی بیگماتی روزمرہ اور ٹکسالی زبان کا لطف لینا چاہتے ہوں اُن کو اس کتاب کا کم ازکم ایک مرتبہ ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ کتاب کے آخر میں خاص خاص لفظوں اور محاوروں کی مع ان کی تشریح کے اگر ایک فہرست بھی شامل کردی جاتی تو بہت اچھا ہوتا کیونکہ اس میں بہتیرے الفاظ اور محاورے ایسے ہیں کہ ابھی تک سینہ بسینہ ہی منتقل ہوتے رہے ہیں۔ عام متداول لغات میں بھی نہیں مل سکتے۔

مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں مرتبہ مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی تقطیع خورد ضخامت ۲۰۰ صفحات

کتابت طباعت بہتر قیمت غیر مجلد عہ اور مجلد عہ پتہ:- مکتبہ جمعیۃ التعاون دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

"الندوہ" دورِ جدید میں ایک مستقل عنوان "میری محسن کتابیں" کے ماتحت ملک کے مشاہیر اہلِ علم و ادب کے مقالات کا ایک طویل سلسلہ کئی ماہ تک شائع ہوتا رہا تھا اب انھیں مقالات کو مع دو اور مقالوں کے جو اُس زمانہ میں الندوہ میں نہ چھپ سکے تھے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے یہ کل مقالات گنتی میں اٹھارہ ہیں اور سب کے سب بلند پایہ مصنفین، ادبا اور اربابِ قلم و علم کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ان حضرات نے یہ بتایا ہے کہ اُن کی علمی اور ادبی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں سب سے زیادہ دخل کن کتابوں کا رہا ہے یہ مجموعہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل یگانہ ہے اس کا مطالعہ عام اربابِ ذوق اور طلبا کے لئے خاص طور پر بہت مفید ہوگا۔ آخر میں لائق مرتب نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے اُن تمام کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی دیدی ہے جن کا ذکر اس میں آیا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت دوچند ہوگئی ہے۔

نفسیاتِ جمال | از مولانا ابو النظر صاحب رضوی امروہوی تقطیع خورد ضخامت ۱۵۲ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:- اعلیٰ کتب خانہ دہلی قرول باغ۔

مولانا ابو النظر صاحب رضوی کے متعدد مقالات برہان میں شائع ہو کر علمی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب موصوف کا ہی ادبی کارنامہ ہے جس کا نام اگر بجائے "نفسیات جمال" کے "نفسیاتِ محبت" ہوتا تو بہتر تھا، کیونکہ اس میں محبت اور اُس کی مختلف کیفیات اور ادائیں مثلاً محبت اور زندگی۔ محبت اور شباب عزم و ارادہ، ناکامی، خودکشی وغیرہ وغیرہ جیسے ۲۷ عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ زبان بڑی شگفتہ اور انداز بیان فلسفیانہ ہے۔ لائق مصنف نے فلسفہ، ادب اور نفسیات ان تینوں کی ترکیب سے اس پیکر کو تیار کیا اور لطف یہ ہے کہ محبت کے شراب خانہ میں بیٹھنے کے باوجود انھوں نے اپنے قلب و نظر کو بہکنے نہیں اور موضوعِ گفتگو کے انتہائی نازک ہونے کے باوجود عریانی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اس کا مطالعہ ادبی نفسیاتی دونوں حیثیتوں سے دلچسپ اور لطف آفریں ہوگا۔

سنہ ۴۲ء۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ
اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد للعہ
خلافتِ راشدہ:۔ تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہدِ خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت وجامعیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں قیمت سے مجلد ہے
مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ عہ
سنہ ۴۳ء:۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ہے مجلد للعہ
سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ قیمت عہ
اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپئے مجلد سات روپئے۔
خلافتِ بنی امیہ:۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات وواقعات سے مجلد ہے

سنہ ۴۴ء۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ
قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ
مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ہے مجلد للعہ
سنہ ۴۵ء۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد سے
قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ہے
انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد سے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) محسنِ خاص:- جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرولباغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

ذیل میں ندوۃ المصنفین کی کتابوں کے نام مع مختصر تعارف کے درج کیے جاتے ہیں تفصیل کیلئے دفتر سے فہرستِ کتب طلب فرمائیے اس سے آپ کو ادارے کی ممبری کے قوانین اور اس کے حلقہائے محسنین معاونین اور احبار کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت سے مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ جرمنی سے پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے قیمت سے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ہم

۱۹۴۰ء نبی عربی صلعم۔ تاریخِ ملت کا حصہ اول جس میں سیرتِ سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہمِ قرآن جدید ایڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب قیمت عہ مجلد ہے

غلامانِ اسلام:۔ پچھتر سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک بسوط اور محققانہ کتاب جس میں اصولِ اخلاق اور انواعِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ قیمت صہ مجلد ہے

۱۹۴۱ء قصص القرآن حصہ اول۔ جدید ایڈیشن ندوۃ المصنفین کی مایۂ ناز اور مقبول ترین کتاب زیرِ طبع قیمت صہ مجلد ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات:۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری میں رہنے کے لائق ہے قیمت عہ

وحیِ الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب قیمت دو روپے مجلد سے

تاریخِ انقلابِ روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ قیمت عہ

برہان

جلد ہیزدہم شمارہ (۴)

اپریل ۱۹۴۷ء مطابق جمادی الاول ۱۳۶۶ھ

فہرستِ مضامین

۱ نظرات	سعید احمد	۱۹۴
۲۔ علم النفسیات کا ایک افادی پہلو	لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب	۱۹۷
۳۔ دستور الفصاحت		
اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک تنقید	محترمہ آمنہ خاتون ایم۔ اے لکچرر مہارانی کالج میسور	۲۱۱
۴۔ بچوں کی تعلیم و تربیت	سعید احمد	۲۳۷
۵۔ ادبیات:۔		
نقشِ دوام	جناب ماہر القادری صاحب	۲۵۱
قطعات	جناب رشید ذوقی	۲۵۲
۶۔ تبصرے۔	م۔ ح	۲۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

اصلاح تعلیم کے سلسلہ میں ہمارے مخدوم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے اپنی بلند پایہ کتاب "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" میں ایک نظریہ وحدت تعلیم کا پیش کیا ہے مولانا کا یہ خیال صحیح ہے کہ تعلیم کو قدیم وجدید دو حصوں پر تقسیم کردینا اور اس طرح تعلیم یافتہ مسلمانوں کا دو متخالف و متضاد گروہوں میں بٹ جانا انگریزی حکومت ہی کی ایک برکت ہے۔ ورنہ مسلمانوں میں دینی اور دنیوی علوم و فنون پر مشتمل ہمیشہ ایک ہی نصاب تعلیم رائج رہا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج علوم و فنون کی اس قدر کثرت اور ان میں جو وسعت پیدا ہوگئی ہے وہ پہلے کبھی نہ تھی اور آج کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنی میں مضبوط اور زندہ قوم نہیں ہوسکتی جب تک اس میں سب علوم جدیدہ و حاضرہ کے نہ صرف جاننے والے بلکہ ان میں بصیرت و مہارت رکھنے والے افراد موجود نہ ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص تمام علوم و فنون کا جامع اور ماہر نہیں ہوسکتا اور ایک علم و فن کی تدریس اور اس میں تحقیقی نظر پیدا کرنے کے لئے طبعی طور پر جن اسباب و آلات اور ماحول کی ضرورت ہے وہ دوسرے علم و فن کے لئے ضروری نہیں ہوسکتے۔ اس بنا پر اگر وحدت تعلیم سے مقصد یہ ہے کہ درسگاہیں ایک ہی قسم کی ہوں، نصاب تعلیم سب کا یکساں ہو۔ اور ماحول بھی ایک ہو تو ایسا ہونا نہ صرف یہ کہ عملاً ناممکن ہے بلکہ قومی اعتبار سے نقصان رساں اور مضر بھی ہوگا۔

البتہ تعلیم کی مدت کو چند حصوں پر منقسم کرکے یہ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی حصہ میں وحدت تعلیم کے نظریہ کو عملی شکل دی جائے اور وہ اس طرح کہ مثلاً میٹرک تک کا نصاب ایسا بنایا جائے اور وہ سب کے لئے لازمی ہو۔ کہ اُسے پڑھنے کے بعد ایک مسلمان طالب علم میں ایک طرف دینی علوم و فنون سے مناسبت پیدا ہوجائے اور دوسری طرف ضروری علوم عصریہ سے وہ ناآشنا نہ رہے۔ یہ نصاب پرائمری تعلیم کے ختم ہونے کے بعد زیادہ سے

زیادہ پانچ سال کا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ہر طالب علم کو اس کا موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنے فطری ذوق اور ذاتی صلاحیت و استعداد کے مطابق جس شعبہ میں چاہے کمال و امتیاز پیدا کرے۔ اس مرحلہ پر مدارسِ عربیہ میں انگریزی علوم و فنون کی یونیورسٹیوں کی طرح دینی اور عربی علوم کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ کے لئے الگ الگ اولاً ثانوی تعلیم اور پھر اس کے بعد درجۂ تکمیل کا بندوبست کرنا چاہئے۔ درجۂ تکمیل میں تدریس کا کام کم اور ریسرچ کا کام زیادہ ہوگا!

اصلاحِ تعلیم کے سلسلہ میں جہاں نصاب و طریقِ تعلیم میں تبدیلی کرنا ضروری ہے۔ اتنا ہی ضروری یہ امر ہے کہ طلبا میں علمی شغف، دینی جذبہ اور اخلاقی فضائل پیدا کئے جائیں۔ ورنہ نصاب تعلیم کتنا ہی صالح اور مفید ہو اگر طلبا میں عام دنیا داروں کی طرح علم کو ذریعۂ معاش بنانے اور اس کے ذریعہ دنیوی جاہ و منصب اور دولت و ثروت حاصل کرنے کا جذبہ باقی رہا تو بہترین نصاب تعلیم سے بھی . . . .

. . . . ہماری قومی مشکلات حل نہیں ہو سکتی۔ دورِ آخر میں ہماری علمی اور دینی تباہی کا بڑا سبب یہی رہا ہے کہ علمارِ سلف کے امتیازی اوصاف یعنی قناعت کیشی، مخلصانہ خدمت، دین کا جذبہ، بے غرض علمی انہماک ان سب کو عصرِ حاضر کی تہذیب نے بالکل تباہ کر دیا اور ہر شخص مادی منفعت کی جستجو میں بے لوث خدمت کے جذبہ سے محروم ہو گیا یہ صحیح ہے کہ ہر شخص سے بے لوث و بے غرض خدمت کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن ہر زمانہ میں بہر حال ایک ایسی جماعت کا وجود حیاتِ ملی کے لئے ناگزیر ہے زمانہ کے نشیب و فراز اور رجحاناتِ عصری کے باعث اس جماعت کے افراد میں کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن یہ اندھیر تو نہ ہونا چاہئے جو آج نظر آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی مختصر ہو لیکن قوم کو صحیح راستہ پر لیجانے اور ان میں ذہنی اور عملی خوبیاں پیدا کرنے اور ان کو نشو و نما دینے کا کام ہمیشہ ایسی ہی جماعت نے انجام دیا ہے۔ ایسی جماعت کو قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم ان کیلئے باعزت مگر آزاد وسائلِ معاش کا بھی انتظام کریں۔

آخر میں ایک اور اہم بات کی طرف توجہ دلانی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے نزدیک جب تک خالص اسلامی حکومت نہ ہو مسلمانوں کی تعلیم کو حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہونا چاہئے۔ ہمارا یہ خیال عام تعلیم سے متعلق ہے خواہ وہ مدرسوں میں ہو یا کالج

میں لیکن مدارسِ عربیہ کیلئے تو اپنی تعلیم کو حکومت کے اثر سے بالکل آزاد رکھنا اور بھی ضروری ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی اور یا مشترکہ۔ بہرحال جب تک وہ خالص اسلامی طرز کی حکومت نہیں ہے اس کی سیاست بے لاگ اور بے غل و غش نہیں ہو سکتی اور مدارسِ عربیہ کیلئے ایسی تعلیم درکار ہے جو ہر قسم کے بیرونی اثر اور خارجی عمل دخل سے یکسر آزاد ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ دار العلوم دیوبند ایسی چند درسگاہیں اب تک حکومتی اثرات سے آزاد رہی ہیں لیکن اب ملک میں نیشنل گورنمنٹ قائم ہے۔ اس لفظ "نیشنل" سے ہماری پرانی درسگاہوں کو دھوکہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ گورنمنٹ نیشنل ضرور ہے لیکن وہ اسلامک نہیں ہے اور ہماری تعلیم کسی نیشنلزم کی ہرگز پابند نہیں ہو سکتی۔

آنریبل مولانا ابو الکلام آزاد وزیر تعلیم مرکزی حکومت نے بہت اچھا کیا کہ اس قسم کے شبہ کو دور کرنے کے لئے لکھنؤ میں اجتماع کے بعد ہی ایک بیان میں فرما دیا کہ انھوں نے اجتماع میں جو تقریر کی تھی وہ وزیر تعلیم ہونے کی حیثیت سے نہیں کی تھی! کوئی وجہ نہیں کہ مولانا کے اس بیان پر اعتماد نہ کیا جائے خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ مدارسِ عربیہ کی اصلاح و تجدید مولانا کا آج کا نہیں۔ ایک عرصۂ دراز کا خواب ہے اور اب یہ خواب خوابِ پریشاں نہیں رہا۔ بلکہ رویائے صالحہ بن چکا ہے لیکن اگر مولانا علمائے دین کو یو۔پی گورنمنٹ کے کونسل چیمبر کے بجائے لکھنؤ کے کسی عربی مدرسہ یا کسی مسجد میں مجتمع ہونے کی دعوت دیتے اور وہاں تقریر فرماتے تو مولانا کا مذکورہ بالا بیان اور زیادہ مؤثر ہوتا اور بعض "اگلے وقتوں" کے عادی علما کو کونسل چیمبر میں جانے سے جو وحشت ہوئی وہ نہ ہوتی۔

ہمارے بعض احباب ہماری زبان سے اصلاحِ مدارسِ عربیہ کا مطالبہ سنتے ہیں تو انھیں گمان ہوتا ہے کہ ہم نصابِ تعلیم کی اصلاح کے ساتھ مدارس کے نظامِ تمدن کو بھی یونیورسٹیوں کے نظامِ تمدن کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ واضح رہنا چاہیے کہ اس طرح کا خیال ایک غلط بدگمانی سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ درسگاہوں میں ٹاٹ یا دری کے فرش اور تپائیوں کی جگہ میزوں اور کرسیوں کا انتظام کیا جائے۔ اور طلبا کو سادہ اور کم خرچ لباس پہننے کی بجائے جدید وضع کا اور گراں لباس پہننے کا تکلف کیا جائے علومِ دینیہ اسلامی ان بزرگوں کی مبارک میراث ہیں جو اگرچہ دبدبہ و حشم کے اعتبار سے کسی فرمانروا سے کم نہ تھے مگر ان کے گھر کا اثاثہ بقول مولانا شبلی کے "بوریائیست کہ در کلبۂ احزاں داریم" کا مصداق ہوتا تھا۔ اس بنا پر ان علوم کی تدریس و تعلیم کی شان اسی میں ہے کہ اس سادگی کو قائم رکھا جائے۔ مگر ہاں سادگی کے ساتھ صفائی ...

۴ اور علوم و فنون کی ضرورت ہے مگر ان اثرات سے بالکل جو نوجوان ان درسگاہوں کی تعلیم پاکر نکلیں گے وہ سب شرعی شعر کا مصداق ہوں گے۔ هیهون لینون ایسار ذعوه کلم + سوائی عملی جہاز نبا فرانسار

علم النفسیات کا ایک افادی پہلو[1]

خواب، ضبط، زندگی اور حرکت

از

لیفٹیننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب

Transference of Emotion. یعنی نقل جوش سے متعلق ہم گذشتہ مقالات میں عرض کرچکے ہیں کہ اس سے ہماری زندگی میں کیا کیا نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اس حجاب کا انحصار احساس کمتری پر ہے۔ ہمیں تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ اکبر اعظم کا ہی دورِ حکومت دیکھئے۔ بدایونی نے جو کچھ فیضی اور ابوالفضل کے متعلق اپنی منتخب التواریخ میں لکھا ہے اس سے تاریخ داں اصحاب بے خبر نہیں ہیں۔ اور پھر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نقل جوش کی محض یہی وجہ تھی کہ بدایونی کو فیضی اور ابوالفضل کے بڑھتے منصبوں پر رشک ہونے لگا۔ اور یہ رشک حسد کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ اور بدایونی احساسِ کمتری میں اس طرح گرفتار ہوگئے کہ سوائے اس کے کہ منتخب التواریخ کے صفحات پر دل کھول کر ایک پرآشوب بخار کا اظہار کرتے اور چارہ ہی نہ تھا۔ یہ غبار نمودار ہوا اور دنیا اس وقت تک اس کی شاہد ہے۔

دورِ اکبری اور دیگر شاہانِ مغلیہ کے وقتوں میں ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ اولیا اللہ اور علمار کا بے دریغ قلع قمع، دوستوں اور رشتہ داروں کا بے جا قتل، اگر اظہار احساسِ کمتری نہیں

[1] سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان نومبر ۱۹۴۶ء

تو اور کیا ہے؟ مذہب تو ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتا! طبیعتوں میں نہ تو ایمان و یقین تھا اور نہ ہی سکون و اطمینان۔ ہر فرد منصب کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جو کچھ بھی کسی کے راستے میں حائل ہوتا وہ اُسے اکھاڑ پھینکنے کی تاک میں لگا رہتا۔

مختصر یہ کہ اس دنیا میں کون و فساد کی بنیاد ہی نقلِ جوش ہوا کرتی ہے خواہ وہ کسی رنگ میں ہو اور یہی وجہ فتنۂ اعتزال کی تھی۔ بات کیا تھی؟ ایک منوانا چاہتا تھا دوسرا ماننے کو تیار نہ تھا، جبر و اختیار سے دونوں ہی ناواقف تھے، یا یوں کہہ لیجئے دونوں آشنا تھے مگر ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ دوسرا فریق غلط راستے پر چلا جا رہا ہے۔ مسئلہ خلقِ قرآن میں دونوں درست تھے۔ اسلامی اصولِ اعتدال کسی نے بھی اختیار نہ کیا۔ حکومت ایک فریق کے ساتھ تھی وہ دوسرے پر چڑھ گیا، اگر دونوں نے خاموشی اختیار کرلی ہوتی تو بات کچھ بھی نہ بنتی!!

گذشتہ زمانے میں جب یہ اختلافات شروع ہوئے تو عوام میں یہ باتیں ابھی شعور کی سطح پر تھیں جہاں سے انھیں بخوبی نکالا جا سکتا تھا مگر اب یہ تاثرات تحت الشعور کی گہری وادیوں میں پہنچ کر قیام کر چکے ہیں جہاں سے نکالنا انھیں کوئی آسان کام نہیں اس وقت ہم انھیں باقاعدہ حجاب کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

غرضکہ یہ نقلِ جوش زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ اب اگر ہم نفسیاتی دنیا کے افادی پہلو کا جائزہ لیں تو دو چیزیں ہمیں بخوبی نظر آتی ہیں جن پر ہم قابو پاکر زندگی کو سہل بنا سکتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) احساسِ کمتری Inferiority Complex.

(۲) نقلِ جوش Transference of Emotion.

ہم نے علمی دنیا میں ان دونوں حقیقتوں کا کسی قدر جائزہ لے لیا ہے۔ اب ہم اس حقیقت کا جائزہ ذرا تفصیل کے ساتھ خوابی دنیا میں بھی لینا چاہتے ہیں۔ خوابی دنیا میں ہم خیالی دنیا کو بھی شامل

سمجھتے ہیں جسے آئندہ واضح کیا جائے گا۔ انسان نصف سے زائد عمر سو کر اور سوچ کر گذار دیتا ہے تو کیا پھر یہ نصف حصہ انسان کی عمر کا ضائع ہو جاتا ہے؟ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس نصف عمر میں انسانی زندگی کا افادی پہلو کس طرح جدوجہد جاری رکھتا ہے اور یہ عملی دنیا کے ساتھ کس طرح وابستہ ہے۔ ہم خوابوں کی تعبیر کے علم میں پڑنا نہیں چاہتے محض اس بات کی وضاحت کریں گے کہ خواب وخیال کا اثر عملی زندگی پر کیسے، اور عملی زندگی کا خواب وخیال پر کس طرح ہوتا ہے۔ خوابوں کی تعبیر کا علم کوئی مستقل علم نہیں ہے جس کو اس وقت تک علمی حیثیت سے ترتیب دیا گیا ہو۔ البتہ یہ ایک خاص قسم کا ملکہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ عطا کردے۔ اشاری تعبیرات (Symbolical Interpretations.) جدید نفسیات کی ایجاد ہیں۔ البتہ جدید نفسیات میں ان کی نوعیت ایک حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ہم اس سے متعلق آئندہ صفحات میں انشاء اللہ تعالیٰ بالتفصیل کچھ عرض کریں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عملی دنیا اس احساسِ کمتری انسان کے اندر ایک ایسا نصب العین (Ideal.) قائم کر دیتا ہے جو اس کی پہنچ سے بہت بالاتر ہوتا ہے۔ یہ بھی قطعی امر ہے کہ ہر شخص ایک نصب العین رکھتا ہے مگر ہر ایک کا نصب العین ناممکن الحصول نہیں ہوتا۔ اکثر یہ نصب العین انسان کی پہنچ کے اندر ہوتا ہے اور اس کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ اگرچہ حالات کے مطابق اس میں ترمیم ہوتی رہتی ہے اور نصب العین کا افادی پہلو بھی یہی ہے کہ اس میں بتدریج ترقی ہوتی رہے۔ اگر نصب العین میں ترقی کی گنجائش نہیں اور اور وہ ایک جگہ پر قائم ہے یا وہ بجائے ترقی کے پیچھے کی طرف ہٹتا ہے تو یقیناً ایسا نصب العین احساسِ کمتری پر زندہ ہے۔

ہم نصب العین کو دو حصوں یا درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) فوری نصب العین Immediate Ideal.

(۲) آخری نصب العین Ultimate Ideal.

آخری نصب العین پر انسان فوری نصب العین ہی کے توسط سے پہنچتا ہے۔ اور اگر انسان کا فوری نصب العین موجود نہ ہو تو وہ نصب العین ناممکن الحصول ہوگا اور اس کی بنیاد احساس کمتری پر ہوگی۔ اگر ایک سرباز کا آخری نصب العین سرہنگ بننا ہی تو اس کے نصب العین کو سرداری اور سرگردگی کا راہ اختیار کرنا پڑے گی اگر درمیانی منازل مفقود ہیں تو یہ نصب العین ناممکن الحصول ہے اور خلافِ عقل۔ چنانچہ معمولی حالات کے اندر انسان کا نصب العین اس کی استعداد اور دسترس کے مطابق ہوگا۔ ان حالات کے اندر ایک اوسط درجہ کے دماغ کا آدمی اپنا نصب العین بخوبی حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی دسترس سے باہر نہ ہو۔ احساسِ کمتری کی وجہ سے جس قدر بھی نصب العین قائم ہوتے ہیں وہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کو وہ اکیلا بیٹھ کر خیالی پلاؤ پکا کر پورا کرتا ہے۔ دن میں خواب دیکھنا (Day Dreaming) نفسیات میں اس فعل کو (Wish Fulfilment.) یعنی خواہشات کا پورا ہونا کہا جاتا ہے۔

ہم نے ابھی عرض کیا ہے کہ انسان اکیلا بیٹھکر خیالی پلاؤ پکاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حجابات کی بنا پر ایجو (Ego) یعنی اَنَا اپنے گرد وپیش سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے اور اس نئے ماحول کے مطابق وہ اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے۔ جب انا علیحدگی اختیار کر لیتی ہے تو یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس پر سے تمام حجابات دور ہوجاتے ہیں۔

ہماری نگاہ میں صوفیائے کرام کے چلّے اور مراقبے بھی اسی اصول پر قائم ہیں مگر یہ حالت فقط خیالی و خوابی دنیا ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ اُس عالم تنہائی میں اَنَا اپنے گرد وپیش پر چھا جاتی ہے اور فقط یہاں ہی اُس کے لئے یہ ممکن ہے کہ اپنا وقار قائم رکھ سکے۔ یہ علیحدگی اگر بیداری کے وقت اختیار کر لی جائے تو اس کو ہم نفسیاتی زبان میں (.Day Dreaming) یا خیالی پلاؤ کہیں گے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اس حالت میں بھی انسانی حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور جس رنگ میں بھی وہ اپنے آپ کو

دیکھنا چاہتا ہے وہ دیکھ لیگا۔ یعنی جو کچھ وہ ہے ویسا نہیں، بلکہ جو کچھ وہ چاہتا ہے کہ ہو، اسی رنگ میں دیکھے گا لیکن جب وہ پھر عملی دنیا میں واپس لوٹتا ہے تو اس کے حجابات بدستور اسی طرح قائم ہوجاتے ہیں اور پھر جب یہ خواب کی سی غنودگی دور ہوتی ہے تو وہ ایک مدہوش انسان کی طرح اپنی خیالی دنیا میں پھر محو ہوجاتا ہے

اگر ایک دلپسند خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل جائے تو انسان پھر سونے کی کوشش کرتا ہے کہ شاید وہ منظر پھر سامنے آجائے! ایسے فعل کا تکرار بے عملی کا پیش خیمہ ہے کیونکہ وہ اپنا نصب العین دن بھر میں کئی مرتبہ بناتا اور توڑتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان جس کا نصب العین بہت بلند ہوتا ہے اور جو براہ راست اس تک پہنچنا چاہتا ہے تو وہ اسے عملی دنیا میں حاصل نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ ہر وقت اس سے متعلق سوچتا رہتا ہے، اسے سوتے میں بھی اپنے خیالات سے آزادی حاصل نہیں ہوتی طرح طرح کے خیالات مختلف شکلوں میں خواب میں آتے ہیں، گویا ناممکن الحصول چیزیں خواب وخیال میں ممکن الحصول بن جاتی ہیں۔

اس صدی میں اول اول شرنر (Scherner) اور فرائڈ (Freud) نے خوابوں کے متعلق نظریئے قائم کئے۔ ایڈلر (Adler) نے بھی ایک مستقل نظریہ قائم کیا۔ ہم ان میں سے اکثر کے نظریوں پر آئندہ صفحات میں جستہ جستہ تنقید کریں گے اور جو جو بات ہمارے موضوع کے مطابق ہوگی اس کی تفصیل بھی کردیں گے۔ ہم نے ابھی لکھا تھا کہ ہماری نگاہ میں خوابوں کی تعبیر کا علم کوئی مستقل علم نہیں جس کو ایک علم کی حیثیت سے ترتیب دیا گیا ہو، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ پہلو ہی مفقود تھا بلکہ ہمیں مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں کے اندر اس سے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کلدانیوں، مصریوں، ہندوؤں، یونانیوں، اور مسلمانوں نے خوابوں کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام نظریوں کو اکٹھا کرکے کسی ایک رائے پر پہنچا جائے جو وقت کے مطابق ہو یعنی موجودہ نظریوں سے مطابقت کرے۔ آسمانی صحائف، مثلاً انجیل، تلمود اور قرآن میں

متعدد جگہ خوابوں کا ذکر ہے۔ تمام الہامی خواب نہیں، تاہم ان میں تعبیر سے انجام کا پتہ دیا گیا ہے اس طرح تعبیر کا علم پیدا ہو سکتا ہے۔

فرائڈ کا نظریہ تعبیر اگرچہ اشاری (Symbolical) ہے تاہم اس میں جنسی عنصر یعنی (Sexual Element) اس قدر ہے کہ اس نظریہ کو قبول نہیں کیا جا سکتا اور اکثر حالتوں میں تو ہم نے اسے غلط بھی پایا ہے۔ البتہ اس کا طریقۂ تحلیل خواب جو ہے اس کی ترکیب بعض حالات میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ خوابوں کی ترتیب اور ساخت (Arrangement & Structure) کے متعلق فرائڈ کے نظریے کا دارومدار جنسی خواہشات پر ہے۔ مختصراً یہ کہ اگر خوابوں کی ترتیب اور ساخت میں افراط و تفریط ہے تو جنسی خواہشات جو بچپن میں اثر پذیر ہو چکی ہیں ان کی تکمیل نہیں ہوئی ہوتی۔ ایڈلر (Adler) اور ینگ (Jung) کو اس سے اتفاق نہیں۔ اگرچہ الہامی خواب کے وہ بھی قائل نہیں۔ بہرحال ان دونوں نظریوں کے مطابق خوابوں کی تعبیر کو اشاری ضرور ہونا چاہئے مگر اس میں جنسی عنصر کو دخل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم آئندہ صفحات میں اشاری تعبیر کی ایک مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے دیں گے تاکہ یہ امر واضح ہو جائے۔

الہامی خواب (Prophetic Dream) سے یہ مراد ہے کہ خواب کو تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی جس طرح کہ خواب دیکھا جائے وہ بعینہ اسی طرح واقعہ ہو جاتا ہے۔ ایڈلر ایسے خوابوں سے اتفاق نہیں رکھتا بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ اکثر خواب انسان کی مخفی قوتوں کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں جن کا انحصار مختلف حجابات اور تاثرات پر ہوتا ہے ہمیں اس حد تک اس سے اتفاق ہے مگر جہاں تک الہامی خوابوں کا تعلق ہے ہم اُن سے متفق نہیں ہیں ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ماہرینِ نفسیات الہامی خوابوں سے کس طرح انکار کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں انسانی زندگی کا طور و طریقہ تمامتر اس قسم کا ہے کہ اس سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کو مستقبل کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں یا حاصل

ہوسکتی ہیں۔ جب انسانی سیرت یعنی حرکات وسکنات کو سمجھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس کے مستقبل کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جاسکتی ہیں تو پھر خوابوں کے ذریعہ ایسے الہام کیوں بعید از عقل معلوم ہوں؟ ہمارے افعال وحرکات اس نوعیت کے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں مستقبل کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہے۔ زندگی کے شکوک وشبہات (Doubts.) کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم مستقبل کو بھانپ کر اپنا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم فیصلوں کو بھی اسی لئے ملتوی کردیتے ہیں کہ ہمیں مستقبل کے متعلق غیر شعوری طور پر معلومات ہوتی ہیں اور ہم ایک مناسب وقت کی تاک میں ہوتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ الہام نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم رات کو صبح کی تیاری کرکے سوجاتے ہیں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کل دن چڑھے گا بھی یا نہیں۔ باوجود اس کے ہم غیر شعوری طور پر تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں ہمارے علم کی نوعیت مختلف ہے۔ اور اس علم کا وجود ہمارے شعور میں موجود نہیں ہوتا۔ مگر اس حقیقت سے کیسے انکار ہو کہ علم تو موجود ہے۔

ہم الہام کے ثبوت میں کئی مثالیں دے سکتے ہیں مگر کیا حاصل، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر علمائے مغرب الہام کے نظریے کو مان لیں تو ایک روز انھیں وحی ونبوت کا بھی اقرار کرنا پڑے گا! ہم آخر میں یہاں ایک پاولو (Pavlov.) کا مختصر سا تجربہ بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ سائنس کے مطابق بھی الہام کی حقیقت کا ثبوت پیش کردیں۔

پاولو ایک پارو سکی سائنسداں تھا جس نے یہ تجربہ کیا کہ جب حیوانات کو خوراک دینے کا وقت آتا ہے تو ان کے معدے میں چند ایک اہم لعاب اُترنے شروع ہوجاتے ہیں جو ہاضمہ کے لئے مفید ہوتے ہیں یہ لعاب خود بخود معدے میں اُتر آتے ہیں گویا معدے کو پیشتر ہی سے معلوم تھا کہ خوراک آرہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ علمائے نفسیات الہام کی حقیقت کا تو اعتراف کرنا پسند نہ کرتے تھے، بچاؤ کی یہ صورت اختیار کی کہ اُسے ایک ایسا فعل اضطراری قرار دیا جو تجربہ کی بنا پر قائم ہوتا ہے اور اس کا نام رکھ دیا (Conditioned Reflex) !!!

ہمارے نزدیک الہام بھی ایک ایسا ہی فعل اضطراری ہے جو تجربہ کی بنا پر حاصل ہوتا ہے اور یہ فعل ہر ایک سے سرزد ہوسکتا ہے اور اس کی نوعیت تجربہ پر منحصر ہوگی۔ لہذا اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تو پھر اگر حیوانات کو بذریعہ الہام معلومات بہم پہنچ سکتی ہیں تو انسان کے بارے میں کیوں اس قدر تعجب ہو جو اشرف المخلوقات بھی ہے اور احسن التقویم بھی! ہم خوب جانتے ہیں کہ ماہر نفسیات کو اس حقیقت کا احساس ہے لیکن اگر وہ اس کا اعتراف کرلیں تو ان کا ایک بہت بڑا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ حقیقت بہر حال حقیقت ہی رہے گی اور انھیں ایک روز ماننا پڑے گا کہ الہامی خواب بھی ایک حقیقت ہیں!

اکثر خوابوں کا موضوع اور ان کی ترکیب خود انسان کے خیالات یا اس کی خواہشات کی پیدا کردہ ہوتی ہے وہ جو چاہتا ہے خود اپنے آپ کو خواب میں دکھا سکتا ہے بعینہ اسی طرح جیسے خیالی پلاؤ خود ہی پکا لیتا ہے۔ انسان کا صورتِ حال اس بات کا مقتضی ہوتا ہے کہ اسے خیالات و خواہشات کے متعلق جواب ملے۔ یہ جواب اس کو خواب کی شکل میں نمودار ہوکر دکھائی دیتا ہے جس کی تعبیر کا وہ اہل نہیں ہوتا مگر وہ اپنی کیفیت کے مطابق اس کی تعبیر کرکے اپنے دل کو تسکین دیتا ہے اور اگر وہ خواب کی تعبیر کسی دوسرے سے پوچھے جو اس کی مرضی کے خلاف تعبیر بتائے تو اُسے تلخ اور ناگوار گذرتی ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے خواب کی تصویر پر جو نقش و نگار ہوتے ہیں وہ حجابات اور دیگر ذہنی علامات کے مطابق ترتیب پاتے ہیں جس میں خواب دیکھنے والے کا نصب العین پنہاں ہوتا ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ نصب العین حجابات پر مبنی ہوتا ہے اور اسی پر انسان کی شخصیت کا دارومدار ہے۔ اگر اس عکس کی جزدی تحلیل کی جائے تو ہمیں ہر حصے میں ایک حجاب نظر آئے گا۔ مجموعی طور پر یہ عکس نصب العین کی تائید کرے گا گویا انسانی فطرت اس کو غیر شعوری طور پر مجبور کرتی ہے کہ وہ نصب العین کی تکمیل کے لئے ایک ایسا ذریعہ اختیار کرے جو اس کی خواہشات کے بالکل مطابق ہو۔ عملی دنیا میں

یہ ناممکن ہے لہذا خواب کے اندر اس کی تکمیل بآسانی ہوجاتی ہے۔

فرائڈ اور ایڈلر کے نظریوں کے مطابق جو خواہشات عملی دنیا میں نامکمل رہ جاتے ہیں ان کا اظہار و تکمیل خواب کی زبان کرتی ہے ہمیں اس سے قدرے اختلاف ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خواب کی زبان (Dream Language) بذاتِ خود دھندلی ہوتی ہے، یا ہماری اصطلاح میں خواب کا عکس دھندلا ہوتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات جو معنی خیز جزو ہوتے ہیں یا تو وہ بھول جاتے ہیں اور یا پھر ارادتاً بھلا دئیے جاتے ہیں، کیونکہ ان سے شخصیت کے حجابات کا انکشاف ہوجاتا ہے۔

ہمارے فکر کے مطابق خواب ایک دھوئیں کی مانند ہے جو صرف یہی بتاتا ہے کہ ہوا (حجابات) کا رُخ کس طرف ہے۔ البتہ دھواں یہ بھی ظاہر کردیتا ہے کہ ایک آگ موجود ہے اور وہ کہاں ہے! یہ مقام عکس کے جزو سے معلوم ہوجاتا ہے اور جب آگ کا مقام معلوم ہوگیا تو ہم بذریعہ استخراج وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی چیز جل رہی ہے! دھوئیں کو آپ غبار یا جوش سمجھئے اور آگ کو حجاب!!! حجاب کا جو کھچاؤ ہم نے گذشتہ مقالے میں بیان کیا تھا بعینہ اسی طرح غبار اور جوش کا ایک کھچاؤ ہوتا ہے۔ عملی دنیا کا جوش خواب میں ظاہر ہوکر مختلف صورتیں اختیار کرلیتا ہے اور ہر صورت کا ایک مطلب ہوتا ہے جسے اس کی تعبیر کہتے ہیں۔ اگر ہم خواب کے مختلف حصوں کو علیحدہ کرکے ان سے متعلق خواب دیکھنے والے سوالات کریں تو ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ ہر حصے کی آڑ میں ایک حجاب پنہاں ہے جو ایک خوفناک قوت کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے اور اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس میں اس کی ایجو یا انا کو بہت دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ عملی دنیا میں بیدار ہوچکی ہوتی ہے اور اگر عملی دنیا میں انسان فوق الانا یعنی (Super Ego) تک رسائی حاصل کرچکا ہو تو اس کا رابطہ ایک ایسی قوت سے قائم ہوجاتا ہے جو اُسے ہر قسم کی خبروں سے متنبہ کرتی رہتی ہے اور اسے خواب میں پیش از وقت مستقبل کے متعلق معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ ہم اسے الہامی خواب کہتے ہیں۔

جب ہم سے ایک شخص اپنا خواب بیان کرتا ہے تو ہمیں اس کے بیان میں اس کی زندگی کا ایک غیر شعوری خاکہ نظر آتا ہے (Unconscious Life Plan.) اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو غیر محفوظ سمجھتا ہے کیونکہ اس کے ذاتی تحفظ کے نشانات جا بجا خاکے پر نظر پڑتے ہیں۔ ہم اس سے انسان کے تعلقات اور اس کے طرزِ زندگی کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔ یہ تمام اثرات ذہنِ انسانی میں گھومتے رہتے ہیں تاکہ وہ اس کا حل معلوم کر سکیں۔ لیکن چونکہ عملی دنیا سے یہ چیز یا جدوجہد خیالی یا خوابی دنیا میں آچکی ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ شعور سے غیر شعور میں چلی آتی ہے اس طرح اس کا انجام خواب وخیال میں ظاہر ہوتا ہے۔ عملی لحاظ سے پھر یہ چیز بے کار ہو جاتی ہے۔

ہم نے فرائڈ کے نظریے کے متعلق تھوڑا بہت جو کچھ لکھا ہے وہ بھی سنبھل سنبھل کر لکھا ہے ہمارے نزدیک فرائڈ کی نفسیات میں افادیت کا پہلو یک قلم ناپید ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ فرائڈ کو دنیا کی ہر چیز میں جنسی جھلک نظر آتی ہے ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرائڈ خود ایک جنسی حجاب (Sexval Complex) میں گرفتار تھا اور اس پر اس نے آخر دم تک قابو نہ پایا، باوجودیکہ تحلیلِ نفسی کا ماہر تھا! ہمیں ذاتی طور پر اس کی زندگی کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ورنہ بہت ممکن ہے کہ اس کے بچپن کے زمانے میں اس قسم کے اثرات نمایاں ہوں اور ہم اس کی زندگی کی تحلیلِ نفسی خود اس ہی کے نظریوں کے مطابق کر کے ثابت کرتے کہ وہ بذاتِ خود جنسی حجابات کا شکار تھا۔

البتہ ایک بات روزِ روشن کی طرح صاف نظر آرہی ہے اور وہ یہ کہ فرائڈ ایک جرمن یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو جرمنی حکومت کے مختلف دوروں سے گذرا۔ جرمن یہودیوں کا اخلاق جرمنوں نے بہت پست کر دیا تھا، اول تو یہودیوں کا اخلاق ویسے ہی پست ہوتا ہے۔ جرمنوں کا جنسی رویہ یہودیوں کے ساتھ کچھ نامناسب تھا۔ ہمیں تاریخ بھی بتاتی ہے اور ہم نے اس جنگ کے دوران میں بھی یہ اکثر سنا، غالباً انہی تاثرات کے ماتحت فرائڈ نے اپنا نفسیاتی نقطۂ نگاہ جنسیات پر رکھا ہوگا

ورنہ فرائڈ کے استادوں میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ تھی جس نے ہٹلر کو مجبور کیا کہ وہ فرائڈ کی تمام کتابیں تباہ کرادے۔ ایک تو وہ اس کے قوم کے اخلاق کو پست کر رہی تھیں۔ دوسرے ان میں جرمنوں کی کرتوتوں کی جھلک تھی۔ تیسرے اس میں افادی پہلو مفقود تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یورپ میں فرائڈ کی نفسیات ایڈلر اور ژنگ سے بڑھ کر ہر دل عزیز تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب اقوام کا اخلاق پست ہوجاتا ہے تو ان کی ہر بات میں جنسیات دخل انداز ہوتی ہیں، یہ قوم کی پستی کی علامت ہے۔

آپ ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں کے ذرا جدید ترقی پسند اردو ادب کو ملاحظہ فرمائیے۔ بڑے بڑے ترقی پسند ادیب آپ کو یہاں ملیں گے جو اس بات پر ناز کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو ادب پر بہت احسان کیا ہے جو فرائڈ کی جنسیات اس میں داخل کردی ہیں۔ اپنے آپ کو وہ ترجمانِ حقیقت کہتے ہیں مگر کمبخت یہ نہیں سمجھتے کہ اپنے حجابات کو بے حجاب کر رہے ہیں وہ افسانے لکھ کر لطف لیتے ہیں کیونکہ ان کی عملی زندگی میں وہ لطف ناپید ہے اپنے حق میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ ایک قدرتی امر ہے اور ہم مجبور ہیں۔ کیونکہ جب قوم کا اخلاق پست ہوتا ہے تو ایسی باتیں اُبھر آتی ہیں۔ اللہ اکبر و انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گویا اپنی کمزوری کو بھی مانتے ہیں مگر اپنی مجبوریوں کو ایک ایسی آڑ دیتے ہیں کہ خود بری ہوجائیں، دوسرے الفاظ میں زمانے کو برا بھلا کہا اور اپنے سر سے الزام اٹھا دیا۔ سمجھ میں نہیں نہیں آتا کہ ایسے فعل میں کیا کمال ہے؟

درحقیقت ان لوگوں کی زندگیوں کے تجربات نے ان کے اندر اتنے حجاب پیدا نہیں کئے جس قدر فرائڈ کے پڑھنے سے ہوگئے ہیں اور پھر زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس قدر بھی یہ جدید ادب کے پرستار اور ترقی پسند ادیب ہیں یہ اپنے آپ کو اشتراکیت پسند کہتے ہیں! ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا!! حالانکہ اشتراکیت افادیت پسند ہے اور یہ فرائڈ کے غلام افادیت سے دور بھٹکے ہوئے ہیں

اپنا تعلق کسی مذہب سے ثابت نہیں کرنا چاہتے کیونکہ پھر ان کی عریانی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ کوئی انھیں نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا اور یہی وجہ ہے کہ اب عوام کا رویہ اُن کے لئے ایک حجاب بن کر نقلِ جوش میں اظہار کر رہا ہے اور وہ ان کی لامذہبیت ہے۔ زمانہ بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی، جو خود نہ سمجھ اُسے زمانے کی ٹھوکر سکھا دیتی ہے۔

آسمانی صحائف اور احادیث سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خواب دو قسم کے بیان کئے گئے ہیں۔ تیسری قسم جس کا ذکر جدید ماہرینِ نفسیات کرتے ہیں، اس کا ذکر موجود نہیں۔ یہ دو قسمیں جو ہیں تو ان میں سے ایک کو ہم الہامی خواب کہہ سکتے ہیں اور دوسرے وہ خواب جن کے سمجھنے کے لئے تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ الہامی خواب بعینہ اسی طرح واقع ہوتا ہے جیسے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس میں تعبیر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ان کو رویائے صالح کہہ لیجئے یا کشف روحانی۔ ہم یہاں ہر دو کی مثال احادیث سے دینا چاہتے ہیں اور بعد میں پھر ان ہی سے متعلق نفسیاتی رنگ میں ان کی تعبیر کے دلائل پیش کریں گے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ان	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا
النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال رأیت	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں نے ایک
کانّ امراۃً سوداء ثائرۃَ الراس	کالی پریشان بالوں والی عورت دیکھی جو مدینہ
خرجت من المدینۃ حتی قامت بمھیعۃ	سے نکل کر حجفہ میں جا ٹھہری ہے تو میں نے
وھی الجحفۃ فاولت ان وبا المدینۃ	اس کی یہ تعبیر کی ہے کہ مدینہ کی وبا وہاں
ینقل الیھا۔	بھیجی گئی ہے۔

ہم اب کوشش کرتے ہیں کہ خوابوں کی جدید نفسیاتی تعبیر کے اصولوں کے مطابق اس حدیث کا جائزہ لیں۔ یہ خواب ظاہر ہے کشفِ روحانی یا رویائے صالح نہیں بلکہ ایک عام خواب ہے جس کے سمجھنے کے لئے تعبیر درکار ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیر خود ہی فرمائی۔

ہم لکھ چکے ہیں فرائڈ اور ایڈلر کے اصول تعبیر کے مطابق تعبیر اشاری یعنی (Symbolical.) (Inter Pretation.) ہوا کرتی ہے۔ خواب کے ہر جزو یا حصہ کی مناسبت ایک خاص بات سے قائم کر لی جاتی ہے جو زیادہ موزوں معلوم ہو۔ مگر اس اصول کے لئے کوئی خاص قانون موجود نہیں تاہم یہ معتبر پر منحصر ہے کہ وہ تشخیص کے لئے کیا پسند کرتا ہے۔ مندرجہ خواب کو ہم اس کے مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے چار حصے ہیں جو اصول تعبیر کے مطابق بہت اہم ہیں اور وہ حصے یہ ہیں

۱۔ عورت

۲۔ سیاہ رنگ

۳۔ پریشان بالی۔

۴۔ حرکت و قیام

خواب میں عورت زندگی کی علامت ہے اگر صحیح و سالم ہو۔ اگر اس میں ذرا بھی نقص پیدا ہوگا تو زندگی کا مناسب پہلو بگڑا ہوا ہوگا۔ اس کا سیاہ رنگ اس کا مصیبت زدہ ہونا ظاہر کرتا ہے اور اس کا اضطراب یعنی بالوں کی پریشانی اس امر کی تصدیق کرتا ہے اس کا حرکت و قیام اس عارضے یا مصیبت کی نقل ظاہر کرتا ہے۔ عورت اگر خواب میں پریشان نظر آئے تو جدید نفسیات کے مطابق بیماری ظاہر کرتی ہے۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا ہم نے پچھلی کسی قسط میں فرائڈ کے عمل تحلیل نفسی کی ایک مثال دی تھی اس میں جس شخص کی تحلیل کی گئی تھی اس کا پہلا خیال جو اس نے فرائڈ پر ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ ایک حسین عورت باغ میں چلاتی ہوئی اس کے پیچھے گھبرائی ہوئی بھاگ رہی ہے۔ اور اس خیال سے متعلق جو کچھ فرائڈ نے کہا وہ یہ تھا کہ اس کی بیوی ایک ایسے عارضہ میں لاحق ہے جس کی وجہ حیض کے دنوں میں درد ہوتا ہے یعنی اس کو (Dysmenorrhoea) کا مرض تھا۔ تو گویا اس مثال میں بھی عورت کی پریشان حالی بیماری ہی ظاہر کرتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک میں عورت حسین ہے اور دوسری میں سیاہ فام ہے اور

دوسرا فرق یہ ہے کہ ایک خواب ہے اور دوسرا خیال تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ خواب و خیال میں نفسیاتی لحاظ سے بہت کم فرق ہوتا ہے ایک کو Night Dreaming اور دوسرے کو Day Dreaming کہہ سکتے ہیں

اب حدیث کا آخری حصہ حرکت و قیام ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وبا مدینہ سے نکل کر جحفہ میں پہنچ گئی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارے اصولِ تعبیر کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر درست ہے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہوگا اگر ہم ایسا کہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولِ تعبیر کے مطابق ہماری تعبیر ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ احادیث میں نفسیات کوٹ کوٹ کر بھری پڑی ہیں اور ان کے لئے ایک بہت گہرا نفسیاتی مطالعہ درکار ہے۔ ہماری نگاہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اس وقت تک دنیا میں کوئی بھی ماہرِ نفسیات پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ آپ کی زندگی کے روزمرہ کے واقعات اس امر کی روشن دلیل ہیں۔ آپ کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں اور یہ مصلحت ہی زندگی کا افادی پہلو ہے۔

اس قسم کی تعبیر انسان کے ذاتی مشاہدہ اور علم پر مبنی ہوتی ہے بعض لوگ خواب کے معانی واقعہ پیش آنے سے پہلے پا جاتے ہیں اور بعض کو اس کا احساس صرف اس وقت ہوتا ہے جبکہ واقعہ پیش آجاتا ہے۔ مثلاً ہم سے ایک مرتبہ ہمارے عمِ محترم نے بیان کیا کہ وہ سو رہے تھے اور کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے افق پر سرخ رنگ کے بادل کبھی ابھرتے ہیں اور کبھی اترتے ہیں۔ اتنے میں کسی نے ان کو ہلا کر اٹھا دیا اور وہ جاگ اٹھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھانجا ان سے کہہ رہا ہے کہ جلدی گھر چلئے ثریا (اس کی چھوٹی بہن تھی) کی نبض کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چل پڑتی ہے اور وہ مرنے کے قریب ہو گئی ہے اس خواب کو ہم الہامی خواب نہیں کہہ سکتے کیونکہ مزید تعبیر چاہتی ہے۔ اگرچہ تعبیر انھیں خود بخود فوراً ہی معلوم ہو گئی۔

(باقی آئندہ)

تصحیح:۔ گذشتہ اشاعت میں جناب ماہر صاحب کی غزل "فردوسِ خیال" کا ایک مصرعہ افسوس ہے کہ غلط چھپ گیا تھا صحیح شعر یہ ہے

گریۂ شبنم سے پھولوں کو سہارا مل گیا   آنسوؤں نے پھونک دی گلشن میں روحِ تازگی

دستور الفصاحت

اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک تنقیدی نظر

از

محترمہ آمنہ خاتون ایم۔ اے لکچرر فارسی و اردو مہارانی کالج میسور

اردو زبان کے قواعد پر قدمائے جو دو چار کتابیں لکھی ہیں اُن میں میر انشاء اللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اُس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔ حالانکہ اسی زمانہ میں سید احمد علی یکتا لکھنوی نے دستور الفصاحت کے نام سے اسی موضوع پر جو کتاب لکھی تھی وہ انشاء کی کتاب کی طرح دلچسپ نہ سہی۔ بہرحال فنی افادی حیثیت سے کسی طرح بھی اس سے کم نہیں کہی جا سکتی۔

اس کتاب کے شروع میں مصنف نے اردو زبان کی پیدائش ترقی اور اس کی وسعت سے بحث کی ہے۔ پھر چند ابواب اور ذیلی عنوانات کے ماتحت صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض اور قافیہ کے قواعد و ضوابط بیان کئے ہیں۔ خاتمہ میں ۳۵، ایسے شاعروں کا ذکر ہے جن کے اشعار کتاب کے اندر بطور سند پیش کئے گئے ہیں لیکن اپنی اس افادیت اور اہمیت کے باوجود اس کتاب کی گمشدگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ خوش قسمتی سے مئی ۱۹۳۹ء میں اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ عالیہ رامپور کے لئے خرید کیا گیا اور کتاب خانہ کے ناظم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کتاب کا مقدمہ اور خاتمہ اپنی تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کر کے اس خزانہ کو ارباب ذوق کے لئے عام کر دیا۔ علاوہ

تصحیح وتحشیہ کے موصوف نے ایک نہایت فاضلانہ اور مفید و پُراز معلومات مقدمہ بھی لکھا ہے جو عام ارباب ذوق اور تاریخ ادب اردو کے طلبا کے لئے خاص طور پر بڑے کام کی چیز ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی کتاب کی ترتیب اور اس کے حواشی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

چونکہ ہمارے اس مقالہ کا خطاب براہ راست کتاب کے فاضل مرتب سے ہے اس بنا پر ضمیر غائب استعمال کرنے کی بجائے ہم نے جگہ جگہ "آپ" لکھا ہے۔

دیباچۂ مصحح

واوین میں جو عبارتیں ہیں وہ دستور الفصاحت کی ہیں اور بقیہ الفاظ میرے اپنے مخطوطے کے جملہ ورقوں کی تفصیل یوں لکھی ہے صلا۲

شروع کے فاضل + درمیان کے اصل + آخر کے فاضل

۲ + ۲۱۹ + ۱ = ۲۲۲ جملہ ورق

صلا۲ " ورق ۳ ب سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے" حالانکہ کتاب کا آغاز ۳ الف سے ہوا ہے۔

صلا۲ " اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں قطعۂ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۴۹ لکھے گئے ہیں" اور متن مطبوعہ میں مندرج ہندسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی ۲۲۱ ب صحیح ہے لیکن دیباچے کے صلا کی پہلی سطر میں خاتمے کے ختم کے ہندسے ۲۱۹ ب لکھے ہیں" خاتمہ (ورق ۱۸۷ الف - ۲۱۹ ب)" یہ کمپوزنگ کی معمولی غلطیاں ہیں۔

مخلوطے میں مختلف تحریریں | صلا۲ " ورق ۱ ب اور ۲ الف پر کتاب کا تھوڑا سا دیباچہ نقل کیا گیا ہے" اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کتاب کا جو اصل دیباچہ ۳ الف سے شروع ہوا ہے (سن صیغۂ عبودیت) اسی کا تقریباً ڈیڑھ صفحہ فاضل اوراق پر نقل کیا گیا ہے۔ اگر یہ دیباچہ اصل دیباچے سے مختلف ہوتا تو آپ لکھتے کہ ایک " ادھورا " دیباچہ" لکھا ہے۔ بہر حال اس کی صراحت ضروری ہے اور مخطوطے میں اس

تھوڑے سے دیباچے کے بعد دو قطعے لکھے ہیں اور ان کے نیچے لکھا ہے "کاتب الحروف بندہ شیخ دلاور علی بہاری بمقام موتیہاری" جس طرح آپ نے اکبر پور کا محل وقوع لکھا ہے (ص۱۹) اسی طرح اگر موتیہاری کا محل وقوع بھی تحریر فرماتے تو قارئین کو واقعات کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی۔

ص۱۳ "آخر میں کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے" الکاتب الخاتمہ ہدایت علی الموہانی "مگر یہ صرف خاتمۂ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائی ابواب کے کاتب کا نام مذکور نہیں ہے۔ غالباً وہ شیخ دلاور علی بہاری ہوگا۔"

میری رائے میں اگر دلاور علی ابتدائی ابواب کا کاتب ہوتا تو اس کا نام خاتمے سے پہلے ص۱۸۶ پر لکھا ہوتا کیونکہ جو شخص ڈیڑھ صفحہ اور دو قطعے لکھنے کے بعد اپنا نام لکھنا ضروری سمجھے وہ ۱۸۴ صفحے لکھنے کے بعد ضرور اپنا نام لکھتا یا اگر دلاور علی کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ملتی ہو تو وہی اس کا کاتب قرار دیا جا سکتا ہے اور جب آپ نے لکھا ہے کہ موہانی صرف خاتمۂ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے تو خاتمے کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ضرور مختلف ہوگی۔

ص۱۳ " پہلے صفحے پر سیاہ مربع مہر ہے۔ مہر کے اندر" اللہ حافظ مہر کتاب خانۂ محمد مردان علی خاں رعنا ۱۲۸۲ھ" منقوش ہے۔"

ص۱۳ " ۳ الف کے بائیں گوشے میں" مولفہ سنہ ۱۲۴۹ھ از تالیف سید احمد علی یکتا لکھنوی" غالباً یہ رعنا کے قلم کی تحریر ہے اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں قطعۂ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۴۹ لکھے گئے ہیں"

ص۱۵ ورق ۱۲۵ ب اور ۱۷۳ الف کے حاشیوں پر جو ترمیم و اضافہ ہوا ہے وہ آپ کی رائے میں یکتا کے قلم سے ہے۔

ص۱۵ آخر میں ایک ورق منضم ہے جس پر چٹنی کا ایک نسخہ" جناب حکیم سید احمد علی خاں صاحب قبلہ" کا تجویز کیا ہوا درج ہے۔"

خلاصہ یہ کہ اب تک مخطوطے کی مختلف تحریروں کے جو کاتب آپ نے معین کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اب - ۲ الف تھوڑا سا دیباچہ مع دو قطعات . . . . کاتب شیخ دلاور علی بہاری بمقام موتیہاری۔

(۲) ۳ الف - ۱۸۷ الف - ابتدائی ابواب . . . . . . کاتب شیخ دلاور علی۔

(۳) ورق ۴۵ اب اور ورق ۱۷۲ الف پر ترمیم و اضافہ، بشرطیکہ حاشیے کا خط متن کے خط سے نہ ملتا ہو، کاتب یکتا

(۴) ۱۸۷ الف - ۲۱۹ ب خاتمہ . . . . کاتب ہدایت علی موہانی

(۵) ۳ الف اور ۲۱۹ ب . . . . کاتب غالباً رعنا۔

(۶) ۲۲۲ الف چٹھی کا نسخہ . . . . کاتب نامعلوم

ان تحریروں کے پیش نظر آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے:۔

ص۱۵ سطر ۲ - ۱۰ "میرا خیال ہے کہ ہمارا نسخہ (ج) مصنف کے اس نسخے (ا) کی نقل ہے (ب) جو رمضان علی لکھنوی نے تیار کیا تھا" یعنی یکتا نے پہلے ایک مسودہ لکھا اس کو آ کہئے۔ پھر اس کو رمضان علی نے نقل کیا۔ اس کو ب کہئے۔ اب جو نسخہ آپ کے پیش نظر ہے وہ ب کی نقل ہے۔ اس کو ج کہئے۔ اور ساری بحث اسی نسخہ ج سے متعلق ہے۔

غالباً اس میں (ب) بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے جن کے مقابل حاشیے پر مصنف نے اپنا شک ظاہر کیا تھا" یعنی نسخہ ب کے حاشیوں پر مصنف نے اپنا شک ظاہر کیا تھا یعنی مصنف کی اس سعی کے باوجود کہ نظر ثانی کرتے وقت اس کو حسب خاطر درست کرے بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے۔

"ہمارے نسخے (ج) کے کاتب نے حاشیے کی عبارتوں کو بھی بعینہ نقل کر لیا۔ جب یہ نسخہ (ج) مصنف نے دیکھا تو حاشیوں کو قلمزد کر کے متن میں ان مقامات کی تصحیح کر دی۔"

یعنی جب نسخہ ج کو جو آپ کے پیش نظر ہے یکتا نے دیکھا تو الخ

"نیز اس نظر میں وہ غلطیاں بھی درست کر دیں جو پہلے نسخے کے مطالعے کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں

یعنی نسخہ ج کو دیکھتے وقت مصنف نے وہ غلطیاں بھی درست کردیں جو نسخہ ب کے مطالعہ کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں۔" نتیجہ یہ کہ

(۱) آپ کے پیش نظر جو نسخہ ج ہے وہ یقیناً شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا نسخہ ب نہیں ہے۔

(۲) نسخہ ج میں یکتا نے جا بجا اپنے قلم سے اصلاح دی ہے۔

(۳) نسخہ ج میں یکتا نے امکان بھر کوئی غلطی نہ رہنے دی۔

پہلے نتیجہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ آپ کے پیش نظر جو نسخہ ہے اس کے ابتدائی ابواب رمضان علی ہی کے لکھے ہوئے ہیں جیسا کہ یکتا نے لکھا ہے۔

"مخفی مباد کہ عرصۂ بعید و مدتِ مدید سپری گردیدہ کہ چہرۂ تحریر این مقالہ و گردہ تصویر این رسالہ بر صفحۂ وجود نقش گرفتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وسالہا سال بسر آمد ہرگز طبیعت متوجہ نشد کہ بنظر ثانی پرداز دیا آں کہ بنحوی کہ منظور بود، درست سازد۔ کہ دوستی از دوستان فقیر مسمی بہ شیخ رمضان علی سلمہ از باشندگان لکھنؤ کمر ہمت بستہ بنقلش پرداختند"

رسالے اور مقالے سے مراد صرف ورق ۳ الف سے ۱۸۷ الف تک ہے اور "بنحوی کہ منظور بود درست سازد" سے مراد فہرست مضامین و خاتمہ و تصحیح و تحشیہ وغیرہ ہے اور اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ ہر مصنف کی طرح یکتا نے بھی متعدد مرتبہ مسودے میں کاٹ چھانٹ کی تھی۔ لیکن پھر بھی جیسی کہ چاہئے تصحیح نہ کر سکا تھا۔ اور آپ بھی نظر ثانی کو ص۲۷ سطر ۱۵ میں تسلیم کرتے ہیں۔

یکتا کے اس مسودے میں ورق ۱۴۵ ب پر استفہام تقریری کی بحث میں میر سوز کا یہ شعر متن کے اندر درج تھا ؎

تو جو کہتا ہے، گلہ میرا کیا جس تس کنے   کب کیا، کس جا کیا، کس وقت، کس دم، کس کنے

اس شعر کے محاذ میں حاشیے پر لکھا تھا "معلوم باد کہ شعر میر سوز مشتمل بر استفہام انکاری بود از سہو خود

در تقریری نوشتہ شدہ" شیخ رمضان علی نے اس کو جوں کا توں نقل کر لیا۔ اور اس عبارت کے بعد لکھ دیا "النقل کالاصل" چوں کہ کہیں شعر کو بے محل لکھا اور حاشیے پر خواہ مخواہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بیجا تکلف ہے۔ یکتا نے اس کو بہت مدت کے بعد محسوس کیا اور مبیضے میں دونوں عبارتیں کاٹ دیں۔

اگر یکتا پہلے ہی یہ کام کرتا یعنی مسودے میں اس شعر پر یہاں خط کھینچ کر اس کو استفہام تقریری کی مثال میں لکھ دیتا تو کس قدر زحمت سے بچتا۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ مسودے میں یہ شعر استفہام تقریری کی بحث میں مذکور تھا۔ رمضان علی نے اس کو عین میں لکھ دیا۔ یکتا نے جب یہ مبیضہ دیکھا تو شعر کو کاٹ کر قصہ چکانے کی بجائے اس پر ایک نوٹ لکھا، یہ تمام عبارتیں ایک اور کاتب نے نقل کر لیں۔ یعنی "النقل کالاصل" اس دوسرے کاتب نے لکھا ہے اور جب یہ دوسری نقل یکتا نے دیکھی تو اس وقت اس نے وہی کام کیا جو وہ پہلے ہی کر سکتا تھا یعنی متن میں کا شعر اور حاشیے کا اپنا لکھا ہوا نوٹ اور دوسرے کاتب کا نوٹ سب کو قلم زد کر دیا۔ جو بات آپ دوسری نقل میں تسلیم کرتے ہیں اس کو پہلی ہی نقل میں تسلیم کر لینے میں کون امر مانع ہے

میرے قیاس میں ورق ۲۷ الف پر جو رباعی مسودے میں لکھی تھی اس کو رمضان علی نے ہو بہو نقل کر لیا۔ مصنف نے اس کو قلم زد کر کے دوسری رباعی حاشیے پر لکھ دی۔ اب آپ کے قیاس کے مطابق اس کی توجیہ یہ ہوگی۔ یکتا نے یہ رباعی مسودے میں لکھی تھی۔ شیخ رمضان علی کے مبیضے میں وہ نقل ہو گئی۔ یکتا نے جب اس مبیضے کو دیکھا تو رباعی میں ترمیم کا خیال نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ مبیضہ دوبارہ نقل ہو کر یکتا کے سامنے آیا۔ تب اس نے متن میں کی رباعی پر خط کھینچ کر حاشیے پر اصلاح شدہ رباعی رکھ دی۔

اگر میرا قیاس درست ہے تو ورق ۵۴ اب کے حاشیے پر جو نوٹ ہے اس کا اور متن کا ایک ہی خط ہونا چاہیے کیونکہ دونوں خط رمضان علی کے ہیں اور متن میں کسی اور جگہ خط نسخ میں کوئی تحریر ہے تو وہ بھی "النقل کالاصل" کے خط سے ملنا چاہیے لیکن حاشیے کی رباعی کا خط متن کے خط سے ضرور مختلف ہونا چاہیے کیونکہ یہ یکتا کی تحریر ہے۔

خاتمہ لکھے جانے کے بعد یکتا نے اس کو ہدایت علی المو ہانی سے لکھوایا۔ پھر یہ کتاب انقلاب زمانہ سے بہار پہنچی۔ اور وہاں سے مرادآباد ہوتی ہوئی رامپور آئی۔ شیخ رمضان علی نے جن وجوہ سے مسودے کی نقل کی ہے ان کے پیشِ نظر یہ بالکل غیر مناسب ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ آخر میں کاتب کی حیثیت سے اپنا نام لکھتا خصوصًا جب کہ مصنف خود احسان ماننے اور اعتراف کرنے کے لئے تیار تھا۔

اب ایک صورت یہ رہ جاتی ہے کہ حاشیے پر کی رباعی کا خط متن کی رباعی کے خط سے مختلف نہیں ہے تو دستور الفصاحت کا موجودہ نسخہ نہ شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا ہے اور نہ اس میں کہیں یکتا نے اپنے ہاتھ سے اصلاحیں دی ہیں بلکہ کسی کاتب نے رمضان علی کے نسخے کو جس میں یکتا کی اصلاحیں تھیں ہو بہو نقل کر لیا تاکہ اس تصنیف کی ترقی کے مدارج محفوظ رہ جائیں۔ اور مصنف کی اس آرزو کے پیشِ نظر "ہنجوی کہ منظور بودہ درست سازد" اگر کہیں کہیں متن کے اندر یا حاشیوں میں کتابتی غلطیوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے۔ تاہم متن میں بہت سی املائی غلطیاں باقی ہیں۔" ص۱۳

تو ماننا پڑتا ہے کہ یکتا کے قول و فعل میں یکسانی نہیں تھی اور وہ کوئی ذمہ دار اور محتاط مصنف یا مصحح نہیں تھا اور اختلافِ خطوط کی صورت میں یکتا پر کوئی اعتراض نہیں۔ ایک اور قیاس یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جیسا کہ اشرف علی خاں فغاں کے مرتب کردہ انتخاب میں مرزا فاخر مکیں نے "جا بجا استادوں کے اشعار کو کہیں بے معنی سمجھ کر کاٹ ڈالا، کہیں تیغِ اصلاح سے زخمی کر دیا" تھا (آب حیات ص۱۶۵) اور جیسا کہ گلزارِ ابراہیم قلمی کے متن میں مصنف کے سوا کسی اور شخص نے بھی معتدبہ اضافے کئے ہیں (ماخذ حواشی ص۷) ویسا ہی ممکن ہے کہ دستور کے مخطوطے میں بھی کسی نے تصرفات کئے ہوں۔ اس صورت میں جب تک کہیں یکتا کی کوئی اور تحریر نہ مل جائے یا کسی اصلاح کے نیچے ان کا دستخط نہ ہو۔ ساری قیاس آرائیاں صرف قیاس آرائیاں ہی رہیں گی اور آپ جس تفصیل سے دستور الفصاحت کے مخطوطے کا تعارف کرانا چاہتے ہیں اس کے لئے یہ لازم ہے کہ اس میں جتنے مختلف طرز کے خط ہیں ان کے کاتب معین کرنے کی کوشش کی جائے

تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ مخطوط کن کن کے پاس سے اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا رام پور پہنچا ہے۔

دستور الفصاحت کے مختلف کاتبوں اور خطوں کی آپ نے جو بحث چھیڑی ہے اس کا قطعی فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ نسخہ یا اس کے متعدد عکسی نسخے مختلف نقادوں کے پیش نظر نہ ہوں۔ اب جو کچھ بھی بحث ہو سکتی ہے اس کا انحصار آپ کی تحریر کے اس مفہوم پر ہے جو پڑھنے والے کی سمجھ میں آئے۔ اب اگر آپ کا بیان اس قدر مستقل ہے کہ پڑھنے والا وہی ایک بات سمجھنے پر مجبور ہے جو آپ سمجھانا چاہتے ہیں تو پڑھنے والے کی سمجھ میں بھی وہی بات آئے گی جو آپ نے سمجھی ہے۔ اور اگر عبادت پہلو دار ہو گئی ہے تو پڑھنے والا نہ تو نسخے کی اصل کیفیت ہی سمجھ سکتا ہے اور نہ آپ نے جو سمجھا ہے وہی معلوم کر سکتا ہے۔ یعنی ساری بحث کا اصل کتاب سے وہی تعلق ہے جو آپ کی تحریر کا اس سے ہے۔

دستور کے اختتام کی تاریخ	ص۲۶ " ان پانچ شہادتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۲۹ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیان تمام ہو چکی تھی" حالانکہ ان کی چار شہادتیں (قتیلؔ

شاہ نصیرؔ، میر تقیؔ، مرزا جعفرؔ) خاتمے یعنی تذکرۃ الشعراء سے متعلق ہیں اور مقدمے میں جو مرزا جعفر کا نام آیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے۔

مقدمہ ص۲۔ مرزا جعفر کے نام کے بعد "مغفور اندلا زال دولتہ واقبالہ" لکھا ہے اور کوئی دعا قلم زد نہیں اسی صفحے پر مرزا حاجی کے نام کے ساتھ دام اقبالہ ہے۔

خاتمہ ص۱۰۲، مرزا جعفر کے نام کے بعد "دام اقبالہ اور مغفور و مرحوم" ہے اور دام اقبالہ قلم زد ہے۔

خاتمہ ص۱۱۱ شاہ نصیر کے احوال میں مرزا حاجی کے لئے نہ کوئی القاب ہے نہ کوئی دعا۔ لیکن اس کا اقتباس جو آپ نے دیباچے کے ص۲۵ لکھا ہے اس میں "دام اقبالہ" موجود ہے۔

خاتمہ ص۱۲۱ مرزا حاجی کے نام کے بعد "دام ظلہ واقبالہ" اور مرزا جعفر کے نام کے بعد "دام اقبالہ" لکھا ہے

خلاصہ یہ کہ مرزا حاجی کی وفات ۱۲۷۵ھ میں ہوئی اور دستور پر نظر ثانی ۱۲۴۹ھ میں، اس لئے ان کے نام کے ساتھ مغفرت کی دعا کیوں کر آسکتی تھی اور جس وقت رمضان علی نے اس کی نقل لکھی مرزا جعفر مر چکے تھے اور جہاں کہیں مرزا جعفر کا نام آیا ہے اور جو تعریفی اور توصیفی لفظ استعمال ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان کی زندگی میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے سب جگہ ان کی درازی عمر کی دعا آئی ہے اس لئے یا تو سب جگہ دعائے مغفرت لکھی جانی چاہئے تھی یا کہیں نہ لکھی جاتی۔ اب ایک جگہ دونوں دعائیں بحال ہیں (خاتمہ ص۲) ایک جگہ صرف دعائے مغفرت بحال ہے (ص۳۰) اور ایک جگہ صرف دعائے زندگی (ص۱۳۱) تو یہ سب شیخ رمضان علی کی کتابت اور یکتا کی تصحیح نقل میں مسامحت کے کرشمے ہیں۔ البتہ جہاں دعائے بقا قلمزد کرکے دعائے مغفرت بڑھائی گئی ہے وہاں خط کے اختلاف سے ان کے لکھنے والوں کا پتہ مل سکتا ہے۔

ص۲۷ " ان دونوں شہادتوں سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۳ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی" یہ شہادتیں احسن اللہ بیان اور قائم کے متعلق ہیں اور ان کا تعلق بھی تذکرۂ شعراء سے ہے نہ کہ (قواعد صرف و نحو، عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدیع) اصل کتاب سے۔ اور اس تذکرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو یکتا نے ۱۲۱۳ھ سے پہلے ارادی یا غیر ارادی طور پر لکھنا شروع کر دیا تھا اور برابر لکھتا رہا یہاں تک کہ ۱۲۳۰ و ۱۲۲۹ھ کے بعد ہی اس کو ختم کر دیا گیا۔ تذکرے میں جن شعرا کا مذکور ہے ان کی موت و حیات سے تذکرے کی ابتدا اور انتہا کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

بیان کی وفات اگر ۱۲۱۳ھ میں ہوئی ہے اور تذکرے میں اس کو "تا حال زندہ است" لکھا ہے تو اس سے صرف اتنا نتیجہ نکلتا ہے کہ بیان کی وفات اگر ۱۲۱۳ھ میں پہلے قلمبند ہوئی تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ اس سنہ میں تذکرہ ہی ختم کر لیا گیا تھا۔ اور پھر ۱۲۱۳ھ کی بنا پر یہ کہنا کہ "دستور الفصاحت" کی تالیف کا کام انشا کی دریائے لطافت سے پہلے (۱۲۲۲ھ)

انجام پاچکا تھا" ص۲۷ اور یہ کہ مصنف کی نظر میں دریائے لطافت کا نہ ہونا اس بنا پر تھا کہ یہ ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی" ص۲۷ خود یکتا کے اس جملے کے ہوتے "غواص بحرِ فصاحت" صاحب دریائے لطافت" ص۱۰۳ خاتمہ حقیقت سے بعید ہے۔

یکتا کے اس جملے میں دو باتیں اظہر من الشمس ہیں۔ (۱) انشا کا احوال تذکرۃ الشعرا میں ۱۲۲۲ھ کے بعد لکھا گیا ہے یا کم از کم یہ ٹکڑا اس سنہ کے بعد بڑھایا گیا ہے (۲) انشا دریائے لطافت کے مصنف کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہو چکے تھے کہ ان کے نام کے ساتھ اس تصنیف کا ذکر لازمی ہو گیا تھا۔ یکتا کو اتنی بھی رعایت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس نے یہ سن کر کہ یمین الدولہ نے انشا کو قواعد و مصطلحات زبانِ اردو لکھنے کا حکم دیا ہے۔ خود بھی انھیں مرتب کرنے لگ گیا ہو۔ کیونکہ دستور کا مقدمہ دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یکتا نے دریائے لطافت کے مقدمے اور درروانۂ اول و دوم و سوم اور باغ در ذکر فوائد دیگر کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ دریائے لطافت فارسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو کے صفحوں کے حوالے سے چند ہم مطلب مقام درج ذیل ہیں۔ ان کی مطابقت سے ان تصانیف کی تقدیم و تاخیر واضح ہو جائیگی توارد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

متحد مضامین	دستور	دریا
فردوسِ آرامگاہ	۶	۳۷
سودا	۶	۲۲
مرزا جان جاناں	۶	۱۷
ستی	۷	۳۴
خنجر	۷	۷
تعریف محاورہ و لفظ و تعریف اردو	۹	۳۷
دلی		۲۴۱
سفیل	۹	۲۴۲

پھر بھی اگر مکیتا فرماتے ہیں کہ "ہیچ کتابی از کتب ایں فن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در نظر ندا شتم بود" تو اس کی صداقت بھی قائم کے اس قول سے کہ "الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعراے ریختہ کتابی تصنیف نگردیدہ" ملتی جلتی ہے۔

صد ۲ "ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشار اللہ خاں نشا کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو مرزا قتیل کی مدد سے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں تمام ہوئی تھی" مجھے اس جملے کے خط کشیدہ حصے سے اتفاق نہیں۔ دریائے لطافت بلا شبہ من حیث الکل قتیل کی مدد سے لکھی گئی ہے لیکن قواعدِ اردو اور مصطلحات زبانِ اردو میں قتیل کا کوئی حصہ نہیں۔ انشا نے ازراہِ کسرِ نفسی اپنی فارسی عبارت تک میں اصلاح دینے کا قتیل کو اختیار دیا ہے لیکن وہ اس کے روادار نہیں کہ قتیل قواعد و مصطلحات زبان اردو میں کوئی ادنیٰ سا تصرف بھی کرے مرشد آبادی نسخے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"ایں ہمہ فرصت بدست نیامد کہ تنہا رنگ بر چہرۂ ایں نقش بدیع کشم مرزا محمد حسین قتیل را نیز کہ روکردۂ ادیبے تامل رو کردۂ من و پسندیدۂ او پسندیدۂ ایں کرمحر زبان بودہ است واز صغر سن میانۂ من و او رادر ہر چیز حصۂ برادرانہ قرار پذیرفتہ شریک ایں دولت ابد مدت ساختم و باہم چنیں مقرر شد کہ خطبۂ کتاب و لغت و محاورہ اردو ہر چہ صحت و سقم آں باشد و مصطلحات شاہجہاں آباد و علمِ صرف و نحو ایں زبان را راقم مذنب یعنی کمترین بندۂ درگاہ آسماں جاہ انشا بنویسد۔ و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع را او بقیدِ قلم درآورد و چوں بندہ را بیشتر با نظم سروکار ماندہ و او را با نظم و نثر ہر دو چند سطری کہ می نویسم نگاہداشتن آن نیز موقوف بر پسند او ست۔ سوائے لفظ و محاورہ و اصطلاح اردو دخلش در عبارت ہمہ مقبول خاطر فقیر گشتہ"

اس لحاظ سے یہ کہنا کہ قتیل نے ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب لکھنے میں انشا کی مدد کی۔

حقیقت کے خلاف ہے"

اصل کتاب کی وجہ تصنیف | بعضے عزیزان و شفیقان بنوشتن قواعد صرف و نحو وغیرہ بطرزیکہ

اجرای آنہا بزبانِ ہندی موافق محاورۂ اردو بودہ باشد اکثر تکلیف می کردند۔ و راقم

چوں قدرت تحریر آں بمرتبہ کہ پایہ ایں اعتبار را شاید در خود نمی دید، متامل بود کہ دریں اثنا

...... مرزا حاجی صاحب ...... نیز باصرار فرمودند، ناچار امتثا لاً

للامر بتسوید رسالہ پرداختم۔ و ہر قدر کہ نوشتم قواعد مسطور از فارسی نقل نمودہ بہ ہندی

مطابق ساختم۔ پس مسمّیٰ گردانیدم مجموعۂ مذکورہ را بہ "دستور الفصاحت" و مرتب نمودم

ترتیبش را بمقدمہ و پنج باب و خاتمہ"۔

مقدمے کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جوہر شناس احباب مدت سے تقاضا کر رہے تھے کہ یکتا قواعد صرف و نحو اردو پر نہ کہ احوال شعرا پر ایک رسالہ لکھے لیکن وہ کسر نفسی سے اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ مرزا حاجی نے بھی اصرار کے ساتھ اس تصنیف کی فرمایش کی تو یکتا نے مجبور ہو کر اس کو لکھنا شروع کیا "ناچار امتثا لاً للامر بہ تسوید رسالہ پرداختم" اور قواعد اردو کو قواعدِ فارسی کے سانچوں میں ڈھالنے لگا۔ ان مراحل کے بعد اس نے اس کتاب کا نام "دستور الفصاحت" رکھا۔ "پس مسمّیٰ گردانیدم مجموعۂ مذکور را بہ دستور الفصاحت"۔

یعنی کتاب کے مطالب یکتا کے ذہن میں خواہ کتنی ہی مدت سے رہے لیکن اس نے انھیں ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ میں مرزا حاجی کے حکم سے قلمبند کرنا شروع کیا۔ پھر جب اس کا خاکہ تیار ہو گیا تو کئی وجوہ سے سالہا سال تک حسب دلخواہ نظر ثانی کر کے اس میں رنگ بھرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔

"عرصۂ بعید و مدتِ مدید سپری گردیدہ کہ چہرۂ تسطیر ایں مقالہ و گردۂ تصویر ایں رسالہ بر صفحہ وجود نقش گرفتہ بہ سبب تردد خاطر ... در محل تعطل افتادہ بود۔ و دریں تعطیل کہ سالہا سال

بسر آمدہ ہرگز طبیعت متوجہ نشد کہ بنظر ثانی پرداز دیا آں را بنحوی کہ منظور بود درست سازد"

یعنی انیس[۱۹] برس تک یہ کتاب مسودے کی حالت میں رہی اور ۱۲۴۹ھ میں اس کا تاریخی نام رکھا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حاجی کے حکم سے جب کتاب لکھی جانے لگی تھی تو "قواعد صرف و نحو اردو" کے سوا کوئی اور نام مصنف کے ذہن میں نہیں تھا۔ اگر بقول آپ کے یہ کتاب ذہنی طور پر نہیں بلکہ خارجی طور پر ۱۲۳۰ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی تو یکتا نے اپنے اس بیان میں کہ "ناچار امتثالاً للامر بہ تسوید رسالہ پرداختم" صریح جھوٹ کہا ہے اور آپ یکتا کو اس مقام میں جھوٹا تسلیم کر لیں جو ناگزیر ہے تو پھر آپ اس کی کس بات کی حمایت میں دلائل پیش کر سکتے ہیں۔

رقعات قتیل "معدن الفوائد" سے پتا چلتا ہے کہ دریائے لطافت کی متعدد نقلیں لکھی جا چکی تھیں اور یہ امر ناممکن ہے کہ آٹھ برس (۱۲۲۲ - ۱۲۳۰) بلکہ ستائیس برس (۱۲۲۲ - ۱۲۴۹) کے عرصے میں باوجود اس شہرت اور اعتراف شہرت کے یکتا نے دریائے لطافت کا مطالعہ کرنا ضروری نہ خیال کیا ہو اور یوں خیال کرنا یکتا پر ظلم کرنا ہے۔ علاوہ یکتا کے اس بیان کے۔

"ہیچ کتابی از کتب ایں فن و رسائل ایں ہنر کہ مفید مطلب و معین مقصد دریں باب می شد در نظر نداشتم کہ موافق آں می نوشتم و از خطا مصئون می ماندم"

یہ معنی کہاں نکلتے ہیں کہ یکتا نے اس فن صرف و نحو اردو کی سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں دیکھی تھی یا کوئی ایسی کتاب معرض وجود ہی میں نہ آئی تھی بلکہ یکتا کا کہنا یہ ہے کہ "اس فن پر ملکیوں اور غیر ملکیوں کی کتابیں تو بہتیری ہیں مگر میں جس طرز پر لکھنا چاہتا تھا اس طرز کی یا اس پائے کی کہ میں اس سے استفادہ کروں یا اس کے نقش قدم پر چل کر غلطیوں سے محفوظ رہوں کوئی کتاب میری نظر میں نہیں تھی۔" اس نے صاف صاف لکھا ہے کہ۔

"اس فن کی کتابوں میں سے کوئی کتاب یا اس ہنر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ جو

اس بارے میں مفید مطلب ہو و معین مقصد ہو میری نظر میں نہیں تھا کہ میں اسی کے
موافق لکھتا اور غلطیوں سے محفوظ رہتا۔"
کسی فن کی کتابوں اور رسالوں کو دیکھے بغیر ایک مصنف کیسے کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی
مفید مطلب اور معین مقصد نہیں، پھر کسی فن پر اس فن کی کتابوں سے جو پہلے سے موجود و مشہور ہیں
آنکھیں بند کر کے لکھتے چلے جانا اور یہ سمجھنا کہ بس قواعد صرف و نحو اردو میرے ہی افکار کے محتاج ہیں
جہالت ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یکتا نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ بخلاف اس کے قائم کی ڈھٹائی
قابلِ داد ہے۔ کس دلیری سے لکھتا ہے۔

"الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابی تصنیف نگردیدہ، وتا ایں
زماں ہیچ انسانی از ماجرای شوق افزای سخنوراں ایں فن سطری تالیف نرسانیدہ۔"

اب یکتا نے جو یہ کہا ہے کہ دریائے لطافت بھی دستور فصاحت کی تصنیف میں مفید و معین
نہ ہو سکی یا یہ کہ دستور بہ نسبت دریا کے بہت جامع اور فنی کتاب ہے اس کی تصدیق یا تکذیب
دنیائے ادب اسی وقت کر سکتی ہے جب اس کے سامنے پوری کتاب چھپ کر آئے اور وہ بذاتِ خود
اس پر کوئی رائے قائم کر سکے۔ اب اس پر جو کوئی بھی جو کچھ بھی رائے قائم کرے گا اس کی بنیاد
آپ کی رائے پر ہوگی۔

خاتمے کی وجہ تصنیف | "خاتمہ در تذکرۃ الشعرا یعنی دربیان اسامی وقدری احوال بعضی از شعرا کہ
بتقریب مثال۔ کلام فصاحت نظام ایں بزرگواراں دریں رسالہ مندرج گردیدہ تا مطالعہ
کنندہ را از حالت و قوت مرتبہ ہر یک فی الجملہ وقوف و آگہی بودہ باشد"

اصل تصنیف سے خاتمے کا صرف اتنا تعلق ہے کہ اس کے پڑھنے سے اصل تصنیف میں جن
شعرا کے اشعار مثال کے طور پر آئے ہیں، ان میں سے بعض کے رتبے اور حالات معلوم ہوتے ہیں

یکتا نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے کب سے اور کس کے حکم سے یہ تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ اندرونی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ ایک مدت سے بطور خود تذکرۃ الشعرا مرتب کر رہا تھا۔ اس کا آغاز ۱۲۱۳ھ سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور ۱۲۲۹ھ تک اس میں برابر ترمیمات اور اضافے کرتا رہا۔ اسی کا ایک انتخاب بطور خاتمے کے دستور کے آخر میں ملحق ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا کا اصل کتاب قواعد صرف و نحو اردو کی ابتدا اور انتہا سے کوئی تعلق نہیں اور یہ دونوں مستقل اور مختلف تصانیف ہیں۔

جس شاعر نے جس قدر اردو کی خدمت کی ہے اور اس کی نشوونما میں حصہ لیا ہے۔ اسی تناسب سے ہمیں اس کے سوانح زندگی کی تلاش رہتی ہے۔ خدمت اردو کا درجہ اول ہے اور احوال زندگی کا ثانوی۔ ہم میر تقی میر کو اس سے عزیز نہیں رکھتے کہ وہ خان آرزو کے بھانجے تھے یا خود آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ طلب کیا تھا یا وہ اپنے اور سودا کے سوا کسی کو پورا شاعر نہ مانتے تھے۔ بلکہ ان کا کلام ان کے کمالاتِ شاعری کا شاہد عادل ہے اور اسی کے ضمن میں ہم اُن کی شاعری کو قابلِ مطالعہ سمجھتے ہیں اور اپنے عزیز اوقات کو اس میں صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ورنہ وہ خان آرزو کے بھانجے تو کیا نوح علیہ السلام کے بیٹے بھی ہوتے تو انھیں کون پوچھتا اور کون اس کی تحقیق کرتا کہ دلی سے لکھنؤ جاتے وقت میر کے پاس ساری گاڑی کا کرایہ تک تھا یا نہیں۔ وہ لوگوں سے کم التفاتی و بے اعتنائی سے پیش آتے تھے یا لجاجت اور چاپلوسی سے اور وہ اپنی کمر میں ستوئے کا ایک پورا تھان لپیٹ لیتے تھے یا رسی باندھ لیتے تھے اور اسی طرح انشا نے جو کچھ بھی اردو کی خدمت کی ہے اگر وہ نہ کی ہوتی تو کون اس کی پروا کرتا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تالیف "انشا" پر انشا کی جو تصویر بنی ہے اس میں سر پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ حال آنکہ تکملۃ الشعرا کے مولف نے جو انشا کا معاصر تھا لکھا ہے "بطور آزاداں باصفائی چہار ابرومی ماند" تو ان دونوں میں کون مستند ہے۔ یا یہ کہ انشا آخری وقت میں مجنوں ہو گئے تھے یا مجذوب وعلی ہذا القیاس۔ یہ سب ذیلی اور ضمنی باتیں ہیں۔ تحصیل زبان و ادب میں ان باتوں کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی

کوئی گھٹاؤ یا بڑھاؤ نہیں ہوتا۔ آج دنیائے اردو میں افسانوں کی ہوا چل رہی اور ہر ادیب ارادی یا
یا غیر ارادی طور پر اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس لئے شعرا کی سوانح عمریاں پڑھنے میں جو لطف آتا ہے
وہ ان کے کلام کی خصوصیات اور اردو پر ان کے احسانات کے فنی مطالعہ سے نہیں آتا۔

جرأت معاف۔ دستور الفصاحت کے دو حصے ہیں پہلا ایک سو تاسی صفحے کا نادر اور قیمتی
تحقیقات کا خزانہ اور دوسرا اس خزانے کے بعض نادر روزگار طلائی سکوں کی تفصیلات کا صرف بتیس
صفحوں کا خاتمہ۔ آپ نے دنیائے اردو کو خزانے سے محروم کرکے صرف اس کی تفصیلات کے خاتمے کو
مزید نایاب و کمیاب تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیا۔ یکتا کی ہمیں ایک تصنیف مل گئی۔ اس کے حالات
نہیں ملے۔ خیر زبان و ادب کا کوئی معتد بہ نقصان نہیں ہوا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی یکتا کے صرف
حالات ملتے اور تصنیف نہ ملتی تو کس قدر نقصان اور افسوس ہوتا۔

ماخذ حواشی میں جو چوراسی صفحے لکھے ہیں ان میں چھوٹے ٹائپ میں اصل کتاب کے ۱۸۷ صفحے
سماجاتے۔ یہ صفحے آپ نے جس دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے لکھے ہیں اس محنت شاقہ کی داد کچھ وہی لوگ
دے سکتے ہیں جنھوں نے اس قسم کے کام کئے ہیں۔ یہ حصہ اس قابل تھا کہ تذکرۂ تذاکیر الشعراء کے نام سے
علیحدہ شائع کیا جاتا۔ یہ ایک مستقل اور ضخیم تالیف ہو سکتا ہے اور بہت ہی صبر شکن اور حوصلہ آزما کام ہے۔
دنیا اردو داں شعرا کے حالات سے اگر کما ینبغی نہیں تو تھوڑا بہت پہلے سے واقف تھی ہی۔ آپ نے
اس معلومات میں اور اضافہ کیا۔ یہ بیشک آپ کا احسان ہے لیکن احسانِ عظیم ہوتا اگر آپ اس نایاب حصے
کو جس سے دنیائے اردو مطلق واقف نہیں ہے شائع کر دیتے۔

دریائے لطافت اور قتیل میں خواص کا ذکر نہیں کرتی متوسط بلکہ اس سے کچھ اونچے درجے کے ادبا میں کتنے
ایسے ہوں گے جنھوں نے دریائے لطافت کا مکمل نسخہ دیکھا ہے اور اس کے دیباچے
کو جس کا اقتباس میں نے اوپر لکھا ہے بغور پڑھا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ دریائے لطافت

میں یہاہم قواعد اردو کی کتاب انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو مرزا قتیل کی مدد سے ۱۲۲۲ھ میں تمام ہوئی تھی۔" مدد کے لفظ سے ہر اس عبارت کو پڑھنے والے کا دماغ قواعد اردو کی تدوین میں قتیل کی مدد کی طرف منتقل ہوگا۔ میری دانست میں اس عبارت میں یہ ترمیم ہونی چاہئے۔

"ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو ۱۲۲۲ھ میں تمام ہوئی تھی۔ اس میں منطق وعروض وقوافی ومعانی وبیان پر جو ابواب ہیں وہ مرزا قتیل نے لکھے ہیں۔"

مدد یا شرکت کا لفظ بہت ہی مغالطہ انگیز ہے مثلاً "حضرت جوش نے مولانا حسرت کی مدد یا شرکت سے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شائع کیا ہے" تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہر غزل کے انتخاب میں حضرت جوش اور ہر نظم کے انتخاب میں مولانا حسرت کی صلاح اور مشورے کو دخل ہے۔ حالانکہ کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ

"حضرت جوش نے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شائع کیا ہے جس میں غزلوں کا انتخاب مولانا حسرت نے کیا ہے۔"

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا "قواعد اردو کی کتاب موسومہ بہ دریائے لطافت کی تالیف میں قتیل شریک تھے یا وہ ان کی مدد سے لکھی گئی"؟ ذمہ دار تحریروں میں کوئی ایسے جملے جن میں ابہام ہو کیوں باقی رہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تذکروں میں جو سنہ آغاز واتمام لکھا جاتا ہے وہ محض برزخی کیفیت رکھتا ہے اور تذکرے کا حقیقی آغاز واتمام۔ اس سے بہت قبل اور بعد ہوتا ہے۔ مثلاً مجمع النفائس کے اختتام کا سنہ ۱۱۶۴ھ لکھا گیا ہے حالانکہ اس کی تالیف کا زمانہ اندرونی شواہد کے مطابق سنہ ۱۱۵۴ھ سے سنہ ۱۱۶۴ھ تک کا ہے اور واقعی آپ نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مجمع النفائس کے آغاز کے متعلق حزیں کے حالات سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کی ترتیب ۱۱۵۴ھ سے پہلے سے ہونے لگی تھی اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مصنف (آرزو) نے دیباچے میں یہ بھی بتایا ہے کہ انھیں اس کی ترتیب کا خیال کس طرح اور کب ہوا" اگر مصنف کی یہ عبارت بھی شائع ہو جاتی تو آپ کی تحقیق کی مزید تائید ہو جاتی۔

کسی تذکرے کا آغاز و انجام معین کرنے کے لئے صرف دو امور اہم ہیں۔ ایک یہ کہ مولف نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو کب تذکرے کی صورت دینے کا ارادہ کیا اور دوسرا یہ کہ اس نے اپنے تذکرے کو پہلے پہل کب قابلِ اشاعت سمجھا۔

مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو طالب علمی کے زمانے سے اساتذۂ فارسی کے منتخب اشعار ایک بیاض میں لکھنے لگے صرف اپنی دلچسپی کے لئے نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ شدہ شدہ وہ ایک اچھا خاصا نادر اور انمول ذخیرہ بن گیا تو انھیں بطورِ خود یا دوستوں کے اصرار سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس علمی خزانے کی افادی حیثیت سے دوسروں کو کیوں محروم رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو منظم اور مرتب طور پر شائع کرنے کا قصد کر لیا۔ اور یہی زمانہ اس تذکرے کے آغاز کا ہے ممکن ہے کہ اس سنہ آغاز سے بیس سال پہلے اس بیاض کی ابتدا ہوئی ہو لیکن وہ مدت معتبر نہیں۔ ورنہ یوں کہنا غلط ہو گا کہ زید ۱۹۴۲ء میں بی اے کی جماعت میں داخل ہوا اور دو سال کا نصاب ختم کر کے ۱۹۴۴ء میں بی اے پاس ہوا۔ کیونکہ بی اے کی جماعت میں داخلے کے لئے اس کو تیرہ سال پہلے سے تیاری کرنی پڑی تھی اور آج تک وہ برابر ان مسائل کی تحقیق میں ہے جنھیں وہ دو سال کے عرصے میں امتحانی نقطۂ نظر سے سمجھ تو چکا تھا، لیکن حل نہ کر سکا تھا اور یوں کہنا حقیقت کے خلاف ہو گا کہ وہ ۱۹۲۹ء سے بی اے کی جماعت میں داخل رہا تھا اور اب امتحان پاس ہو جانے کے بعد بی۔ اے کے درجے کی جو معیاری لیاقت ہے وہ جامع اور مانع طور پر زید کو حاصل ہو چکی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خوش نصیب سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بی اے پاس کر لیتا ہے محض اس لئے کہ قدرت نے اسباب فراہم کئے تھے اور وہ امتحانات پاس ہوتا ہی چلا گیا اور کوئی دھن کا پکا بڑی عمر میں بی اے ہونے ہی کے قصد سے ابتدائی مراحل طے کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تمثیل پیش پا افتادہ ہے لیکن میرا مفہوم اور تذکروں کے مولفین کا حال اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

آرزو دیباچے میں لکھتے ہیں کہ مجھے فلاں سنہ میں (۹) تذکرے کی ابتدا کا خیال پیدا ہوا تو وہی اس کے آغاز کا سنہ ہے خواہ اس سے پہلے کے کسی سنہ کے کسی واقعے کا ذکر مولف نے بصیغۂ حال کیا ہو۔ لیکن مولف اگر آغاز کا صراحتاً یا کنایتہً ذکر کرے تو تذکرے میں جن مختلف زمانوں کا حال ملتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم زمانے کو آغاز کا زمانہ قرار دینے کے لئے یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اس مولف کے سوانح حیات سے بخوبی واقف ہوں کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت کہاں پائی۔ اس کے طبعی رجحانات اور مشاغل زندگی کیا تھے۔ تلاشِ معاش میں کہاں کہاں کا سفر کرنا پڑا۔ تصنیف و تالیف کے لئے جس آسودگی اور سکون کی ضرورت ہے وہ اس کو عمر کے کن زمانوں میں میسر ہوئی۔ اس تذکرے کی تالیف کے محرکات کیا تھے وغیرہ۔

اب رہی تاریخِ اختتام وہ بلاشبہ وہی رہے گی جو مولف نے لکھی ہے اس میں کوئی تبدیلی روا نہیں۔ پہلے زمانے میں طباعت کی سہولتیں نہ تھیں اس لئے تذکرہ ختم ہو جانے کے بعد بھی مولف ہی کے پاس دھرا رہتا تھا اور صرف خاص خاص لوگوں کی نظروں سے گزرتا تھا۔ ایک آدھ شایق کو اس کی نقل لینے کی اجازت ملتی بھی تھی تو وہ نقل اصل تذکرے کی ضخامت کے لحاظ سے ہفتوں اور مہینوں میں پوری ہوتی تھی۔ یہ ضروری ہے کہ ہر تالیف میں کچھ کمیاں رہ گئی ہیں یا بعض مقام تفصیل یا اختصار چاہتے ہوں مولف انھیں وقتاً فوقتاً درست کرتا رہتا تھا۔ یہ گویا مکرر کئی ایڈیشن ہیں مثلاً آبِ حیات کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں نکلا اس میں میر ضاحک اور مومن کے حالات نہیں تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں

یہ بڑھائے گئے تو یہ کہنا کہ ۱۸۸۰ء میں یہ تذکرہ ختم نہیں ہوا تھا اور اس کا سال اختتام اس سنہ کے بہت بعد ہے حقیقت نہیں۔

دستور الفصاحت کی آئندہ اشاعتوں میں آپ ترمیمات اور اضافے کرتے ہی جائیں گے لیکن اس کا سالِ اختتام یعنی اشاعتِ اول کا سنہ وہی ۱۹۴۳ء رہے گا اور حق یہ ہے کہ کوئی مولف یا مصنف اپنی تالیف یا تصنیف ختم کر لینے کے بعد اس میں جو عبارتیں گھٹاتا اور بڑھاتا ہے وہ اس کی انصاف پسندی اور اصابت رائے کی کسوٹی ہوتی ہیں اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کوئی مولف اپنے ماضی اور اپنے زمانے سے کس قدر گہری اور سطحی واقفیت رکھتا ہے اور اگر ہم کسی تذکرے کے اختتام کا سنہ اس میں کے آخری اضافے کے سنہ کو مان لیں تو نفسیاتِ انسانی کا ایک اہم باب حذف ہو جائے گا کہ وہ کس طرح اپنی سعی کو کسی خاص درجے پر پہنچکر مکمل تصور کر لیتا ہے اور امتدادِ زمانہ اس فیصلے کو نظر ثانی کا محتاج ثابت کر دیتا ہے۔

زمانے میں تذکروں کی اس نہایت ہی محدود اشاعت سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ مولف جس کے بارے میں جو جی چاہتا تھا لکھتا تھا اور کوئی معارض نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پورا زمانہ گزر جاتا تھا۔ متاخرین کو اگر مولف اور اس کی تحریروں کے متعلق کافی ذخیرہ معاصرین کا لکھا ہوا مل جاتا ہے تو آسانی ہو جاتی ہے ورنہ وہ وثوق کے ساتھ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ایک اور مشکل یہ ہے کہ جب تک مولف کی شخصیت ایسی نہ ہو کہ اس کے قلم سے نکلا ہوا لفظ سند بن جانے کا امکان رکھتا ہو تو معاصرین اس سے تعرض بھی نہیں کر سکتے۔ اور اگر کریں بھی تو جب تک خود معترض یا اس کے معاصران اعتراضات کو قلم بند نہ کریں وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کسی ایسے تذکرے میں جس کا معاصرین نے ذکر نہیں کیا اور جس کو مولف اور اس کے کراماً کاتبین کے سوا کوئی چھوتا نہیں جانتا تھا کسی مانی ہوئی بات کے خلاف کوئی امر لکھا ہو تو ایک سو سال کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر یہ امر

واقعہ نہ ہوتا تو اسی زمانے میں لوگ اس دروغ بیانی کا تارو پود بکھیر کر رکھ دیتے۔

عوام میں مشہور ہے کہ لوگ خود مشہور ہو جانے کے لئے کسی مستند شخص پر تنقید کر دیتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ حقیقی شہرت کا سودا اگر اس قدر سستا چک سکتا ہے تو اس میں زبان اور ادب کا کوئی نقصان نہیں۔ سراسر نقصان تو اس امر میں ہے کہ کوئی غلط بات ایک مستند شخص کے قلم اور زبان سے نکل کر صحیح مشہور ہو جائے لیکن تاریخ زبان و ادب گواہ ہے کہ ہر دور میں بعض مشاہیر کی شخصیتیں اس قدر "تنقید سہار" ہوتی ہیں کہ ان کے معاصرین کی معقول سے معقول تنقید بھی ان کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتی اور وہ آئندہ نسلوں پر اس کا فیصلہ چھوڑ جاتے ہیں کہ مملکت علم میں یہ "اٹل پن" بغاوت تھا یا خروج۔

آپ نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے دو جگہ اختلاف کیا ہے۔

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر یہ قیاس کرتا ہے کہ نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اسے تسلیم فرمالیا ہے (دیباچہ صفحہ ۴۳)

(۲) صاحب گلزار کی تاریخ وفات ڈاکٹر اسپرنگر اور بلوم ہارٹ نے ۱۲۰۸ھ بتائی ہے۔ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے بھی گلشنِ ہند کے مقدمے میں اسی سنہ کو دہرایا ہے۔ اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو الخ (دیباچہ صفحہ ۷۸)

"تسلیم فرمالیا ہے" اور "دہرایا ہے" کے یہ معنی ہوئے کہ انھیں اسپرنگر کے ان فیصلوں کو تسلیم نہ فرمانا اور نہ دہرانا چاہئے تھا۔ لیکن نکات الشعرا کے متعلق آپ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "میر صاحب نے یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۱ھ میں یا اس کے کچھ بعد لکھنا شروع کیا اور شعبان ۱۱۶۵ھ کے قبل ختم کیا" ملا تو مولوی صاحب پر صرف اتنا اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھوں نے "سنہ اختتام" کی بجائے "سنہ تالیف" کا لفظ استعمال کیا جو سنہ آغاز و انجام دونوں پر حاوی ہے اس لئے دھوکا ہوتا ہے کہ میر نے اسی سنہ

میں تذکرہ شروع کرکے اسی سنہ میں اس کو ختم کردیا تھا لیکن مولوی صاحب نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ کسی کتاب پر میرے رائے دے چکنے یا اس کتاب پر کسی کی رائے کی تصدیق کرچکنے کے بعد تحقیق کا دروازہ بند ہے اور کسی کو مزید تحقیق کا مجاز نہیں۔

ہم مولوی صاحب سے غلطیوں کا وقوع محال کیوں فرض کرلیں جو ہم کو ان کی کسی غلطی پر تعجب ہو۔ جیسا آج اردو کا ہر محقق آزاد کی آبِ حیات پر کوئی اعتراض ضروری سمجھتا ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب پر کوئی ایراد ضرور کرتا ہے۔ انھوں نے تاریخ ادب اردو میں بے شمار صحیح معلومات کا انکشاف کیا ہے کہیں کہیں غلطیاں بھی ان سے ہوئی ہیں۔ لیکن انھیں بطریق احسن رفع کرنا ہمارا فرض ہے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی تحقیق پیش کرنے سے پہلے اگر صرف اسی قدر لکھتے تو کافی تھا کہ "ڈاکٹر اسپرنگر اور مولوی عبدالحق صاحب یہ قیاس کرتے ہیں کہ نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے اور صاحب گلزار کی وفات اسپرنگر اور بلوم ہارٹ اور مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے ۱۲۰۸ھ بتائی ہے۔

مولوی صاحب پر جو دوسرا اعتراض ہے اس میں صاحب گلزار کی تاریخ وفات ۱۲۰۸ھ کے صحیح نہ ہونے میں آپ کو جو شبہے ہیں ان کے وجوہ نہیں لکھے گئے۔ حالانکہ آپ صاحب گلشنِ ہند کی سند پر صاحب گلزار کو ۱۲۱۵ھ سے پہلے متوفی مانتے ہیں۔

دیباچہ صفحہ ۴۴:۔ آپ لکھتے ہیں "میر صاحب نے صرف ایک شعر اس غزل کا چنا ہے جو ۱۱۶۱ھ کے کسی مشاعرے کی طرح میں لکھی گئی تھی۔ اگر میر صاحب نے حاتم کا حال زیادہ بعید زمانے میں لکھا ہوتا تو ان کی بعد کی کہی ہوئی غزلوں کے شعر بھی چنتے جو دلی کے مشاعروں میں برابر پڑھی جاتی رہی تھیں" اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی غالب کے حال اور نمونۂ کلام میں ان کا صرف یہ ایک شعر

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

لکھے تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ مولف نے ۱۱۵۵ھ یعنی ذوق کی وفات سے پہلے غالب کا حال لکھا ہو کیوں کہ بقول آزاد (آب حیات ص۱۸۰) ذوق نے اس شعر کی تعریف کی تھی۔ ہماری نظر میں حاتم۔ خود بہت بڑے شاعر اور ایک سو فی صدی شاعر کے استاد ہیں اور ان کی استادی کا حق اسی وقت ادا ہوتا کہ میر صاحب کم از کم پچیس شعر ان کے انتخاب کرتے لیکن اس کی کیا تدبیر کہ خدائے سخن حاتم کو "مرد جاہل و متمکن" سمجھتا تھا۔ یہ ایک شعر بھی ان کی طبع نازک پر گراں ہے۔

گلشن سخن، کی تالیف کا زمانہ آپ نے یوں معین کیا ہے "دیباچے میں مصنف نے آج پھولا سخن کا گلشن" مادۂ تاریخ لکھا ہے جس سے ۱۱۹۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ کتاب میں بھی جا بجا ہی سنہ اکنوں، یا 'الحال، کے ساتھ مذکور ہے اور مصنف کا دعویٰ بھی ہے کہ کتاب تھوڑے عرصے میں تصنیف ہوگئی تھی اس لئے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ایک سال کے اندر کار تالیف سے مبتلا فارغ ہوگیا تھا۔"

لیکن خاتمے کے صفحہ سنہ کے حاشیے میں آپ لکھتے ہیں" مبتلا در گلشن سخن (۴۲ ب) می گوید شیخ محمد حاتم موطنش دہلی و معاصر نجم الدین، آبرو بودہ، زبانش بازبان ولی دکنی مناسبت دارد، میر عبدالحی تاباں از تلامذۂ اوست، شاعر فصیح بیاں و سرآمد ریختہ گویاں (بود) دیوانش دو ہزار بیت بلکہ زیادہ" تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ آبرو کا انتقال ۱۱۶۱ھ کا مطابق سنہ عیسوی ۱۷۴۷ء ہے اور حاتم کا انتقال ۱۱۹۷ھ میں ہوا یعنی گلشن ہند کے اختتام کے تین سال بعد اس لئے سرآمد ریختہ گویاں کے بعد بریکیٹ میں (است) چاہئے نہ کہ (بود) ورنہ آپ کے اصول کے مطابق ماننا پڑے گا کہ تذکرے کا انجام ۱۱۹۷ھ کے بعد ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۶۴:۔ نواب صدر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں۔

"تذکرہ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں مثنوی رموز العارفین ہے۔ گلزار ارم نہیں ہے رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ھ ہے ۔

رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔"

تذکرے کا آغاز ۱۱۸۸ھ کے بہت بعد کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی تالیف کے زمانے میں رموز العارفین مشہور ہو چکی تھی اور اس مثنوی کو کسی پہلے کے کارنامے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں سے مشہور ہونا تھا۔ سحر البیان تو گیارہ سال بعد کی تصنیف ہے اور ۱۱۸۸ھ سے پہلے بھی اس کا آغاز ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ جب ۱۱۸۸ھ میں یہ مثنوی لکھی گئی اور مشہور ہو چکی تو اس کا کام بھی پہلے سے لکھے جانے والے تذکرے میں درج کر دیا گیا۔ لیکن ۱۱۹۲ھ کی تالیف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں گلزار ارم نہیں ہے یعنی یہ تذکرہ ۱۱۹۲ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اب نواب صاحب موصوف کی تحقیق کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ خود میر حسن نے خاتمۂ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ " در تاریخ ۱۱۹۱ھ باتمام رسید" اور اس تذکرے کے آغاز و انجام کے متعلق دیباچے کے چھ صفحوں کا خلاصہ یہ ہے کہ " میر حسن نے ۱۱۸۴ھ یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ میں ختم کر دیا تھا اور بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی ہے لیکن تاریخ انجام کے بارے میں آپ نے نواب صاحب کے صحیح تخمینے اور درست قیاس کی داد نہیں دی جو ضروری تھی۔

دیباچہ صفحہ ۹۰ :۔ مخزن الغرائب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں" دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۸ھ میں مصنف کو اس کی ترتیب و تالیف سے فراغت ہوتی ہے" چند سطروں کے بعد لکھا ہے :۔

"کتاب خانہ عالیہ رامپور میں اس کی جلد اول کے دو نسخے ہیں مگر دونوں ناتمام ہیں اس بنا پر اس کے آغاز و انجام وغیرہ کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔"

اس عبارت سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ (۱) مذکور نسخے جلد اول ہونے کے لحاظ سے ناتمام ہیں (۲) یا ان کے دیباچوں کے صرف اسی قدر حصے باقی رہ گئے ہیں جن سے تاریخ انجام مفہوم ہوتی ہے

آخر میں آپ لکھتے ہیں: "مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے"۔ جب یہ بات ہے تو جو کتاب حسب ایمائے بندگان ہمایوں اعلیٰ حضرت فرماں روائے رامپور دام اقبالہم وملکہم، تصحیح وتحشیے کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور یادگار عقد سعید نکاح حضور مرشد زادۂ آفاق نواب ولیعہد بہادر ہے اس کی تکمیل کے لئے ناممکن تھا کہ نواب صاحب موصوف اپنا نسخہ مستعار دینے میں دریغ فرماتے یا آپ خود حبیب گنج پہنچ کر اس کو دیکھ آتے۔ جو کتاب ہمارے ملک میں ہے اور جس سے آغاز وانجام کے متعلق ہم خود قطعی فیصلوں پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے آغاز وانجام کے بارے میں ڈاکٹر اسپرنگر اور ڈاکٹر لیٹے کے مشتبہ اقوال کیوں نقل کئے جائیں۔ مذکورۂ بالا جملے سے آپ کا مفہوم کچھ ہو لیکن قارئین بلا وجہ نواب صدر یار جنگ بہادر پر افسوس کریں گے اور دلیل یہ ہوگی کہ نواب صاحب موصوف مذکور تذکرہ کی کو بتانے تک کے روادار نہیں ورنہ محال تھا کہ ریاست رامپور ایک شخص کے سفر اور حبیب گنج میں چند ہفتوں کے قیام کے اخراجات برداشت نہ کرتی۔ اس لئے یا تو یہ آخری جملہ حذف ہو جانا چاہئے یا مکمل نسخہ دیکھنے کے بعد ہی اس کے متعلق رائے لکھی جائے۔

دیباچہ صفحہ ۶۹۔ تذکرۂ میر حسن قلمی کی عبارت یہ ہے: "از نجبائے امروہہ مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایست متصل" لیکن خاتمے کے صفحہ ۹۳ میں مولوی عبد القادر حیف رامپوری خود مصحفی کی زبانی فرماتے ہیں۔ "می گفت کہ مولد من بلم گڈھ است کہ متصل شاہجہاں آباد است"۔ ان میں سے کس کا قول مرجح ہے۔

دیباچہ صفحہ ۱۰۴۔ (مولوی عبد الغفور خاں نساخ نے سخن شعرا میں) داغ کا تذکرہ حالیہ صیغوں میں کر کے تحریر کرتے ہیں کہ ۱۲۸۸ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ کون داغ ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ (استاد اعلیٰ حضرت واقدس میر محبوب علی خاں) کا انتقال ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۱۸۴۔ انجمن ترقی اردو نے اسے (عقد ثریا از مصحفی) شائع کر دیا ہے۔ مگر کوئی سطر غلطی سے پاک نہیں۔ انجمن نے جو بعض نایاب قلمی کتابیں شائع کی ہیں ان میں یہ نقص موجود ہے خصوصاً دریائے لطافت کا جو فارسی نسخہ شائع کیا ہے وہ دریائے لطافت مطبوعہ مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد کا مہذب اور

مختصر ایڈیشن ہے میں نے اپنی تالیف "انشا" کے سلسلے میں ان دونوں کا مقابلہ کیا تو انجمن کے نسخے میں بیسیوں مقام غلط نکلے اور اس غلط فارسی نسخے کا مخدومی علامہ کیفی نے جو ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ اس پر آپ کا جملہ صادق آتا ہے۔ اس لئے کتاب کے اہم مطالب خبط ہو گئے ہیں۔ مثلاً صرف اردو ترجمے کی مدد سے آپ "در دانۂ اول در بیان کیفیت زبان اردو و حروف تہجی اردو" سے " حروفے کہ دریں زبان بہ تلفظ در می آید ہشتاد و پنج حروف است نزد فصیحان اہلِ تحقیق و نزد عوام و تحقیق ناآشنایاں نود و پنج حروف است" کے مطابق ۸۵ اور ۹۵ حروف شمار کرنے کی سعی کیجئے گا۔ آپ یقیناً پریشان اور ناکام ہوں گے اور اسی سے میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔ ترجمہ مذکور ہندوستان بھر کے اعلیٰ نصابوں میں داخل ہے اور طلبہ قواعد کی ایک ایسی کتاب جو انشا نے لکھی تھی مگر اب اس کے مطالب وہ نہیں رہے جو انشا نے بیان کئے تھے۔ تبرکاً و تیمناً پڑھے جا رہے ہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جن کتابوں کی تفصیل لکھی ہے وہ اگر نادر اور کمیاب قلمی کتابوں ہی تک محدود ہوتی تو دیباچے کا وقار قائم رہتا۔ آپ نے چند ایسی کتابوں کا تعارف کرانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے جو چھپ چکی ہیں، اور ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں ان کا صرف حوالہ دے دیا جاتا تو کافی تھا۔ موجودہ صورت میں یہ دیباچہ "تاریخ ادب و زبانِ اردو" پر کسی کتاب خانہ کی فہرستِ کتب معلوم ہوتا ہے۔

خاتمے کے حاشیوں میں جو نوٹ لکھے گئے ہیں وہ تعریف سے مستغنی ہیں۔ اس کی افادی حیثیت عدیم النظیر ہے۔ میری نظر سے تاریخ ادب یا زبانِ اردو کی اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں اس قدر سیر حاصل اور جامع حواشی مہیا کئے گئے ہوں۔ التجا ہے کہ مہجور کے مدائح الشعرا کا جو اقتباس آپ نے خاتمہ ص۱۰۶ پر دیا ہے اس میں " نواب سعادت علی خاں بہادر . . . . . . " کے بعد کی عبارت نقل کرا کے روانہ فرمائیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت
اسلامی تعلیمات اور نفسیات کی روشنی میں

سعید احمد

(۴)

والدین کی محبت کی پیچیدگیاں یوں تو محبت خواہ کسی سے بھی ہو بہر حال وہ ایک ایسی وادی ہے جس کی راہیں بڑی پیچیدہ اور مشکلات سے پُر ہیں۔ پھر بچہ کے ساتھ والدین کی محبت کا مسئلہ تو اور بھی پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے کیونکہ اس میں حسب ذیل صورتیں پیدا ہوسکتی ہے۔

(۱) والدین کو بچہ سے محبت خود اُس کے اپنے اندازہ اور توقع سے کم ہو۔

(۲) بچہ سے محبت بہت زیادہ ہو۔

(۳) ایک بچہ سے محبت بہ نسبت اس کے کسی اور بہن یا بھائی کے کم ہو۔

ان تینوں صورتوں میں نتائج و عواقب کے اعتبار سے بچہ کی آئندہ زندگی کے لئے بڑی مضرتیں اور نقصانات ہیں۔ بچہ کی آئندہ زندگی انھیں تین قسموں میں سے کسی ایک قسم کی محبت کے سایہ میں نشوونما پاتی اور پھلتی پھولتی ہے اور وہ اس سے جو نفسیاتی اور ذہنی تاثرات قبول کرتا ہے اس کی زندگی کا پورا نقشہ ان کا حامل ہوتا ہے۔ اس اہمیت کی بنا پر ہم ذیل میں محبت کی ان تینوں صورتوں پر نفسیات کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔

ہر بچہ کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے والدین اس کے ساتھ محبت کریں اور اُس سے اتنی دلچسپی لیں کہ اُس کی موجودگی میں وہ نہ مغموم ہوں اور نہ اس کے علاوہ کسی اور سے خواہ وہ اس کا بھائی یا بہن ہی ہو۔ اپنی دلچسپی ظاہر کریں۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا۔ ایک بچہ کسی بات پر ضد کرکے رو رہا ہے۔ آپ اُسے خاموش کرنے کے لئے کوئی چیز دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ نہیں لیتا۔ اب آپ فوراً اُس بچہ کے کسی بھائی یا بہن کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں کہ اچھا! اگر تم نہیں لیتے ہو تو ہم اسے (اس بہن یا بھائی کو) دیئے دیتے ہیں۔ یہ سنتے ہی بچہ فوراً رونا بند کر دیتا ہے اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ چیز آپ سے اُچک لیتا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ کی یہ حرکت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس چیز کو کسی اور بہن یا بھائی کو دینا نہیں چاہتا۔ حالانکہ اس کا اصل باعث یہ ہوتا ہے کہ بچہ جب آپ کی توجہ کو اُس سے ہٹ کر کسی اور کی طرف منتقل ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو طبعی طور پر اُسے ناگواری ہوتی ہے اور وہ اُس چیز کو آپ سے جھپٹ کر کسی اور کی طرف آپ کے التفات کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے۔

اب اگر روزمرہ کی زندگی میں بچہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے والدین اُس سے خاطر خواہ محبت نہیں کرتے تو اس میں ایک خاص قسم کا ضغطۂ دماغی پیدا ہو جاتا ہے۔ فرائڈ نے اس کے لئے ایک خاص اصطلاح (The Oedipus Complex.) وضع کی ہے۔

یونانی روایات کے مطابق اوڈیپس لاڑس (Laius) کا بیٹا تھا جو تھیبس Thebes کا بادشاہ تھا۔ اوڈیپس کی ماں کا نام جوکاسٹا (Jocasta) تھا۔ کسی نجومی نے لاڑس کو بتایا کہ جوکاسٹا سے اس کے جو بچہ پیدا ہوگا وہی اس کی موت کا باعث ہوگا۔ چنانچہ جب اوڈیپس پیدا ہوا تو پیشین گوئی کے ڈر سے لاڑس بڑا رنجیدہ ہوا اور اس نے بچہ کو کہیں باہر بھیجدیا۔ اتفاق سے اوڈیپس کسی چرواہے ...... کے ہاتھ لگ گیا۔ جس نے اس کو پالا پوسا اور وہ تنومند نوجوان ہوگیا۔ اس وقت اوڈیپس نہ لاڑس کو اپنا باپ جانتا تھا اور نہ جوکاسٹا اس کے علم میں اس کی ماں تھی۔ اس لاعلمی کا نتیجہ یہ ہوا

کہ ایک جنگ میں اوڈیپس نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے باپ لاٹوس کو قتل کردیا اور پھر اپنی ماں جو کاسٹا سے شادی کرلی۔ دیوتاؤں نے جب قاتل کی تحقیق کی اور اصل حقیقت کا انکشاف ہوا تو اوڈیپس کی ماں جوکاسٹا نے پھانسی کا پھندا ڈال کر خودکشی کرلی اور اوڈیپس کی آنکھیں نکال لی گئیں۔

والدین اور خصوصاً باپ کی محبت کی کمی کے احساس سے بچہ میں جو ضغطۂ دماغی پیدا ہوتا ہے، مذکورہ بالا واقعہ کی مناسبت سے ہی فرائڈ اس کو اوڈیپس کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس ضغطۂ دماغی کے پیدا ہوجانے کے بعد بچہ کے دل میں بسا اوقات اپنے باپ کی نسبت بری خواہشات اور تمنائیں پیدا ہوتی ہیں جن کا وہ اظہار تو کیا کرتا اور ان پر خود اپنے نفس کو لعنت ملامت کرتا ہے لیکن بہرحال یہ خواہشات موجوں کی طرح اس کے دل میں اُبھرتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں اور ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بچہ میں جرم (Sense of guilt) اور احساسِ کمتری (Sense of Inferiority) پیدا ہوجاتی ہیں اور مستقبل میں اُن کا انجام بڑا تباہ کن ہوتا ہے جو بچے ان دو حسوں کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں وہ بڑے ہوکر برے ساتھی، بے وفا دوست اور بدقسمت شوہر یا بیویاں ثابت ہوتے ہیں۔

مشرقی تخیل کے ماتحت ممکن ہے بعض لوگوں کو بیٹے کے دل میں باپ کی نسبت بری خواہشات کے پیدا ہونے پر حیرت و استعجاب ہو لیکن حقیقت یہی ہے جو علمائے نفسیات نے بیان کی۔ اگر ہم خود اپنی ہی تاریخ پڑھیں تو اس کی متعدد شہادتیں بآسانی فراہم ہوسکتی ہیں۔ غیاث الدین بلبن کے انتقال کے بعد کیقباد کا اپنے بیٹے بغرا خان کی بے عنوانیوں پر اس کو متنبہ کرنے کے لئے دہلی آنا اور بیٹے کا باپ کے خلاف صف آرا ہونا۔ اکبر کے خلاف جہانگیر کی بغاوت۔ جہانگیر کے خلاف شہزادہ خسرو کی سازباز اور پھر شاہجہاں بادشاہ کے خلاف اورنگ زیب عالمگیر کی سعی و کوشش یہ سب در اصل اسی ضغطۂ دماغی کے مظاہر ہیں جس کو فرائڈ *Oedipus Complex* کہتا ہے۔

انا فرائڈ (*Anna Frued*) نے یہ صحیح کہا ہے کہ بچہ کا باپ کی نسبت یہ رجحانِ تنفر

زیادہ تر امیر اور دولت مند گھرانوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امرا عیش پرستی میں مبتلا ہونے، نوکر چاکر کی افراط، اور بعض اور اسباب کی بنا پر بچہ سے ذاتی طور پر اتنا تعلق نہیں رکھتے جتنا کہ ایک غریب آدمی رکھتا ہے۔ عام طور پر ان لوگوں کے بچے آیاؤں اور گورنسس کے پاس رہتے ہیں خود ماں باپ سے علاقہ کم ہوتا ہے اور غالباً اسی طرزِ معاشرت کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں والدین اور اولاد میں محبت و اطاعت فداکاری و جاں نثاری کا وہ تعلق نہیں پایا جاتا جو مشرق کی اصل معاشرت کا طغرائے امتیاز ہے، علمائے نفسیات کے نزدیک بچہ میں ناپسندیدگی اور تنفر (Dislike and hostility) کے پیدا ہونے سے حسِ جرم پیدا ہوتی ہے اور اس کا سبب مافوق انا (Super Ego.) کا عمل ہوتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک بچہ جب دو برس کے قریب ہوتا ہے اس میں مافوق انا پیدا ہو جاتا ہے اور اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔[1]

میلنی کلین (Melanie Klein) جو بچوں کی نفسیات کی ماہر خاتون ہے اس نے فرائڈ سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا ہے کہ بچہ تو چھ مہینے کا بھی فوق انا کا اثر محسوس کرنے لگتا ہے۔[2]

بہرحال اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو ماں باپ بچہ کی شیرخوارگی کے زمانہ میں بھی اس کے ساتھ پورا اعتنا نہ کر کے اس میں ناپسندی کا احساس پیدا کر دیتے ہیں اور اس طرح اس میں حسِ جرم کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں وہ سوسائٹی کے سب سے بڑے مجرم ہیں کہ وہ اپنی بے پروائی، امارت کی اکڑ، دولت و ثروت کی نمائش اور اپنی تن آسانی و عشرت کوشی کے لئے بچوں کے ذہن میں حسِ جرم کا بیج بو دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بچوں میں آئندہ چل کر اگر کسی قوی خارجی

---

[1] Group Psychology and Analysis of the Ego. Chapter x.
[2] The Psycho- Analysis of Children. Ch. VIII

موثر کے ماتحت یکایک کوئی انقلاب پیدا نہ ہو تو یہ بڑے ہو کر خود غرض اور مطلب آشنا ہوتے ہیں۔

پروفیسر ماتھیو لکھتے ہیں۔

"جس طرح ایک بچہ اپنی جسمانی نشو و نما کے لئے اچھی خوراک اور اچھی غذا کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ معاشرتی اور جذباتی ارتقا کے لئے شفقت و محبت مادری و پدری کا ضرورتمند ہوتا ہے۔ اگر بد قسمتی سے کوئی بچہ بالکل یا کسی درجہ میں اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے تو جب وہ زندگی کے میدان میں مختلف دشواریوں اور مشکلوں سے دوچار ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور اکیلا پاتا ہے اب اس کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے، اس کی تاب مقاومت اور قوتِ مقابلہ کمزور ہو جاتی ہے۔ خود اعتمادی کا جوہر اُس سے مفقود ہو جاتا ہے۔ خوف و ہراس، مایوسی و ناکامی اور جبن و بزدلی اس پر غالب ہو جاتے ہیں بیکسی اور بے چارگی کا احساس اسے کسی کام کا نہیں رکھتا وہ گوشہ نشینی کو ترجیح دینے لگتا ہے اور عزلت پسند بن جاتا ہے۔ خارجی دنیا سے تعلق قائم رکھنے کی اسے جرأت نہیں ہوتی وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے تئیں کمزور اور حقیر و بے بس سمجھنے لگتا ہے پھر چونکہ اس قسم کے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ نے اُن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس لئے بڑے ہو کر وہ خود بھی زمانہ کے ساتھ کسی قسم کا انصاف یا رواداری برتنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایسے بچوں کو تباہ شدہ بچے Spoilt Chaildren کہنا چاہئے۔"[۵۱]

والدین کی غیر مساوی محبت کا اثر یہی حال بچہ کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے والدین اس کے کسی اور بہن بھائی سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور اُس سے کم اس احساس کی وجہ سے

---

۵۱ The Child and his upbringing P. 100.

بچہ میں ایک قسم کا چڑچڑاپن اور احساسِ کمتری پیدا ہوجاتا ہے اور وہ بسا اوقات اپنے مزاج کی اس خاص کیفیت کو چھپانے یا اس کا بدل کرنے کے لئے بعض ایسی حرکات کرنے لگتا ہے جو دوسروں کو ناگوار ہوتی ہیں مثلاً وہ زیادہ گفتگو کرتا ہے بات بات میں دخل در معقولات دیتا ہے، ہر کام میں اور بچوں سے پیش پیش رہنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی ان سب حرکات کا پس منظر یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی توجہات کا مرکز بننا چاہتا ہے اور اس طرح محبت والدین کی کمی کی مکافات کرنے کی کوشش کرتا ہے اس سلسلہ میں چند مثالیں دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

"آمینہ ایک ذہین لڑکی تھی جب وہ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ کلاس روم میں استاد کے سامنے بیٹھتی تھی تو سب سے زیادہ گفتگو کرتی تھی اور استاد خواہ کوئی سوال کسی لڑکی سے پوچھے آمینہ بہر حال سب سے پہلے اس کا جواب دینے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے اس شوق میں اس کی بھی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ در حقیقت اُسے سوال کا جواب آتا بھی ہے یا نہیں۔ استاد کو آمینہ کے اس رویہ سے بڑی کوفت ہوتی تھی لیکن دراصل اس کا باعث یہ تھا کہ آمینہ دو بہنوں میں سے بڑی بہن تھی۔ اس کی جب چھوٹی بہن پیدا ہوئی تو والدین نے اس سے محبت کم کردی۔ آمینہ غریب کے لئے یہی مصیبت کم نہ تھی کہ سمند ناز پر ایک اور تازیانہ یہ ہوا کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا اور باپ نے دوسری شادی کرلی۔ ان وجوہ سے آمینہ گھر کے ماحول میں جو بیچارگی محسوس کرتی تھی وہ زیادہ باتیں کرکر کے اسکول ماسٹر اور اپنی سہیلیوں کی توجہ کا مرکز بن کر اس کی مکافات کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ڈاکٹر واشبرون نے (Dr. Washburne.) جو ایک خاص تعلیمی اسکیم (Winnetka plan of Education.) کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں اپنی کتاب (Adjusting the School to the Child. . . .) میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ایک اسکول کی معلمہ جس کا نام مس نوکس Miss Knox تھا، اڈورڈ نامی ایک بچہ سے بڑی تنگ آگئی تھی۔ یہ بچہ اپنی ذہانت اور تیزی طبع کی نمائش موقع بے موقع کرتا رہتا تھا ان حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے استانی نے اس کو مارا پیٹا۔ لاکھ سمجھایا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر جب مس نوکس کا ناک میں دم آگیا تو ایک روز وہ اڈورڈ کے گھر پہنچ گئی، وہاں اُس نے دیکھا کہ اڈورڈ کی ماں نے اپنی تمام توجہ اور محبت اپنے ایک چھوٹے بچہ پر مرکوز کر رکھی ہے۔ باتوں باتوں میں اڈورڈ کی ماں نے مس نوکس کو بتایا کہ ابھی چند روز پہلے کی بات ہے اڈورڈ مجھ سے کہہ رہا تھا" اماں جان! کیا آپ کے پاس کوئی منٹ ایسا نہیں ہے جس میں آپ مجھ سے بھی تھوڑی بہت محبت کر سکیں" اب مس نوکس نے اڈورڈ کی ماں سے کہا کہ آپ کو بچہ کے ساتھ اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے ورنہ مستقبل میں اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ماں نے اسی مشورہ پر عمل کیا اور ادہر استانی نے بھی اس کے ساتھ اپنی روش بدل دی، نتیجہ یہ ہوا کہ بچہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس کی مشکلات باقی نہ رہیں"[۱]

والدین کی مفرط محبت | اب رہی مذکورہ بالا صورتوں میں سے . . . . ایک یہ صورت کہ والدین کو حد سے زیادہ محبت ہو تو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ محبت بھی مختلف صورتوں اور شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے اور ان کے اعتبار سے اس کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر اس محبت کا ظہور اس طرح پر ہو کہ والدین ہر وقت بچہ کو سامنے رکھیں کسی ایک لمحہ کے لئے بھی اسے اپنے سے جدا نہ کریں، کوئی کام اسے اپنے ہاتھ سے نہ کرنے دیں، کسی بات پر اس کی روک ٹوک نہ کریں۔ اگر اُس سے کوئی غلط اور نادرست کام بھی سرزد ہو تو اسے شاباش دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ آرام طلب اور عیش پسند ہو جاتا ہے وہ کسی کام کو اپنی ذمہ داری پر نہیں کر سکتا۔ اُس میں کسی حادثہ یا واقعہ کے مقابلہ کرنے کی ہمت بالکل نہیں ہوتی۔ ایسا شخص محبت کا ایسا بھوکا اور ندیدہ ہو جاتا ہے کہ ہر جگہ سے اس کی ہی تلاش اور جستجو رہتی ہے۔ اسکول میں استادوں سے۔

---

[۱] Depth Psychology and Education by Prof A V Mathew P. 332.

دفتر میں محکمہ کے لوگوں سے، گھر میں بیوی اور بچوں سے، محلہ میں آس پاس کے پڑوسیوں اور قرابت داروں سے
ہر ایک سے وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرے۔ اور اگر اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو وہ دوسروں
کو اپنا بدخواہ دشمن اور اُس سے بے پروا سمجھنے لگتا ہے بقول ای ویکسبرگ کے (E. Wexburg.)
اس قسم کے بچے بڑے ہو کر بھی ہمیشہ عہدِ طفولیت کی گشدہ جنت کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور بچپن میں وہ
جس زندگی کے عادی رہے ہیں اسی کو قائم رکھنے کی تمنا اور آرزو کرتے ہیں ڈاکٹر اسٹیکل (Dr. SteKel)
لکھتے ہیں" ان بچوں میں پیار کی آرزو اور تمنا کی ایک ایسی تشنگی پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی بجھتی ہی نہیں"۔
لڑکیوں کا حال اس معاملہ میں اور بھی بدتر ہوتا ہے کیونکہ جب وہ بیاہی جاتی ہیں تو بچپن میں
والدین کی بے پناہ محبت کی عادی ہو جانے کے باعث وہ شوہر کی بیوی نہیں بلکہ محبوبہ بن کر رہنا چاہتی
ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ہر بیوی محبوبہ نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر اُن کے زناشوئی تعلقات بگڑ جاتے ہیں اور دونوں
کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے"۔[1]

لڑکیوں کے سلسلہ میں ایک اہم بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے اور جس کا غالباً ہمارے گھروں میں
عام طور پر خیال نہیں رکھا جاتا یہ ہے کہ بہت سے باپ اپنی سادگی اور ناواقفیت کی وجہ سے سات
برس سے زیادہ کی عمر کی بچیوں کو بھی پیار کرتے ہیں، ان کا بوسہ لیتے ہیں انھیں چمٹاتے اور بدن سے دباتے
ہیں۔ حالانکہ نفسیاتی طور پر یہ نہایت خطرناک اور بیحد مضر فعل ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے غیر شعوری طور پر
بچی میں جنسی حس بیدار ہو جاتی ہے اور پھر بلوغ کے بعد باپ اسے پیار کرنا ترک کر دیتا ہے تو وہ دوسروں سے
اس کی متمنی ہوتی ہے کہ وہ اسے پیار کریں۔ اس طرح پہلے اس میں اشتیاق (Anxiety.) پیدا
ہوتا ہے اور پھر یہ اشتیاق اپنی تکمیل کی مختلف راہیں پیدا کر لیتا ہے اور اگر گھر کے ماحول اور اخلاقی تعلیمات کے
باعث وہ اس اشتیاق کو دبانے کی مصنوعی کوشش کرے تو اس سے مختلف ذہنی اور دماغی الجھنیں اور اعصابی

---

[1] بحوالہ Depth Psychology and Education by Prof. A.V. Mathew. P.54.

بیماریاں رونما ہو جاتی ہیں۔ فرائڈ تو خیر ماہر محبت کا سرچشمہ اور اُس کا اصل محرک جنسی خواہش کو ہی قرار دیتا ہے جس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم علمائے نفسیات جن میں بعض خواتین بھی شامل ہیں۔ اپنے تجربات کی بنا پر کہتے ہیں کہ متعدد آوارہ اور بدچلن لڑکیوں کے حالات کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کا اصل سبب اُن کے باپ، بھائی۔ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کی غیر محتاط محبت ہی تھی۔

ظاہر ہے نفسیات کا یہ باریک نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر فیض اثر سے کس طرح اوجھل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

مروا اولادکم بالصلوٰۃ وھم ابناء سبع	تم اپنی اولاد کو نماز کا حکم کرو جبکہ وہ سات برس
سنین واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر	کی ہو اور نماز نہ پڑھنے پر مارو جبکہ وہ دس سال
سنین وفرقوا بینھم فی المضاجع (ابوداؤد)	کی ہو۔ اور بستروں میں ان کو الگ الگ سلاؤ۔

ہمیں اس جگہ حدیث کے صرف اس آخری ٹکڑہ سے بحث ہے۔ غور کیجئے کس قدر صاف لفظوں میں اس کا حکم ہے کہ دس برس کی عمر کے بعد بچوں کو ایک ہی بستر پر نہیں سونے دینا چاہئے۔ علما نے اس میں کلام کیا ہے کہ آیا یہ حکم مطلق ہے یا مقید۔ یعنی ایک بہن اور بھائی کے لئے تو دس برس کی عمر کے بعد ایک جگہ لیٹنا ممنوع ہے ہی۔ لیکن اگر دو بھائی یا دو بہنیں اس طرح لیٹیں تو اس کا حکم کیا ہے؟ بعض فقہاء کے نزدیک یہ جائز ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں جب حدیث کے الفاظ میں عموم واطلاق ہے تو حکم بھی عام اور مطلق ہونا چاہئے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ایک ہی صنف کے دو افراد کا ایک جگہ لیٹنا شرعاً جائز ہو یا نہ ہو لیکن تہذیب اور شائستگی کے بہرحال خلاف ہے۔ اس بنا پر بچوں کو شروع سے ہی اس کا عادی بنانا چاہئے۔

مذکورۂ بالا حدیث کے علاوہ جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے ایک اور حدیث خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے ارشاد ہے۔

اذا اتی علی الجاریۃ تسع سنین فھی امرأۃ	لڑکی جب نو برس کی ہو جائے تو وہ عورت ہے۔

(کنز العمال ج ۸ ص ۲۷۶)

اس سلسلہ میں غالباً یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ اس غیر محتاط مفرط محبت کو علمائے نفسیات اپنی خاص اصطلاح میں "قابضانہ محبت" (Possessive Love) کہتے ہیں یعنی یہ ایک ایسی محبت ہے جس میں محبوب سے متعلق محب کی ذہنیت وہی ہوتی ہے جو ایک قابض کی اپنے مقبوض کی نسبت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے صرف اپنے جذبۂ خواہش کی تسکین ہوتی ہے وہ اس کو پیار کرتا ہے۔ اسے مس کرتا ہے اپنے ذوقِ محبت کی حظ اندوزی کے لئے اس وقت اسے اس کا بالکل خیال نہیں ہوتا کہ محبوب کا بھی اپنا کوئی مفاد ہے اور اس پر اس کی ان محبت پاشیوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

نفسیات میں اس کی تعبیر اس طرح بھی کی جاتی ہے کہ یہ محبت ایک خاص قسم کے ضغطۂ دماغ کی پیداوار ہے جسے (Nasrissus Complex) کہتے ہیں۔ نرسیس یونان کا ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا جو ایک مرتبہ دریا میں اپنی شکل دیکھ کر خود اپنے اوپر عاشق ہو گیا۔ اس ضغطۂ دماغی کو اس کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی اولاد کے ساتھ حد سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ گویا اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ان کی اولاد خود ان کی شخصیت کا ایک مظہر ہے۔ اس لئے ایک انسان کو جس قدر خود اپنا نفس اور اپنی شخصیت محبوب ہوتی ہے اتنی ہی محبت وہ اپنی شخصیت کے خارجی مظہر یعنی اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔

اب اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بھی قابضانہ اور مالکانہ محبت کی نفی کرتا ہے۔ اولاد کی نسبت اسلام کا تخیل یہ ہے کہ اولاد والدین کے پاس ایک امانتِ الٰہی ہیں اُن کی اپنی ایک مستقل شخصیت ہے اور اس بنا پر جس طرح والدین کے حقوق اولاد کے ذمہ ہیں۔ اسی طرح اولاد کے حقوق بھی والدین کے ذمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے بچہ کا انتقال ہونے لگا تو زبان وحی ترجمان سے ارشاد فرمایا۔

ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی بے شبہ اللہ کے لئے ہی ہے وہ سب کچھ جو اس نے لے لیا

وکُلٌ عندہ باجل — اوراس کے لئے ہیں وہ سب کچھ جو اس نے عطا فرمایا

مسمّٰی۔ — اور ہر چیز کے لئے اس کے نزدیک ایک مقررہ مدت ہے۔

پھر خود اپنے صاحبزادہ ابراہیم کی وفات پر آپ نے جو الفاظ کہے وہ بھی انھیں کے قریب قریب ہیں۔ ارشاد ہوا "آنکھ اشکبار ہے اور دل غمگین، لیکن ہم بہر حال وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہو"

یہی وہ اسلامی تخیل ہے جس نے ایک بوڑھے قیدی باپ (مولانا محمد علی مرحوم) کی زبان سے اپنی پیاری بیٹی آمنہ کی خطرناک علالت کی خبر سنتے ہی بے ساختہ یہ شعر ادا کرادیا تھا جو اسی بیمار کو خطاب کرکے کہا گیا تھا۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ والدین سے متعلق یہ سمجھنا شدید غلطی ہے کہ وہ ہمیشہ اولاد سے محبت ہی کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعدد وجوہ و اسباب سے والدین کو اپنے کسی ایک بچہ سے یا سب بچوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور کبھی یہ نفرت اتنی شدید ہوتی ہے کہ غیر شعوری طور پر ماں باپ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بچہ کی موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ اہلِ مشرق میں تو ایسا خال خال ہی ملے گا۔ مغربی اقوام میں یہ مرض بہت عام ہے۔ کیونکہ مغربی تہذیب نے مادی منفعت اور ذاتی راحت وآرام کو ہر شخص کا مطمح نظر بنادیا ہے۔ فرائڈ نے اس قسم کے رجحان کے لئے ایک خاص اصطلاح (Ambivalence) کی وضع کی ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں خون سپید ہو جانے کا ایک محاورہ ہے وہ اسی قسم کے موقع پر بولا جاتا ہے جب کہ باپ کو اولاد کے ساتھ۔ اولاد کو والدین کے ساتھ۔ بہن کو بھائی کے ساتھ وہ محبت نہ ہو جوان میں آپس میں قدرتی رشتہ کی بنا پر طبعی طور پر ہونی چاہئے۔ نفسیات کی کتابوں میں اس Ambivalence کی بڑی دلچسپ اور کثرت سے مثالیں ملتی ہیں لیکن یہاں ہم ذیل میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔

مسٹر اے ایس نیل (A. S. Neill) اپنی تصنیف "بچہ کی گتھی" The Problem Child. میں لکھتے ہیں "ایک عورت مجھکو بڑے بڑے طویل خطوں میں اپنی بچی کے متعلق ہدایات لکھتی تھی کہ اس کو کس وقت کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں کھانا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھ کو ان خطوط سے شبہ ہوا کہ یہ عورت غیر شعوری طور پر اپنی بیٹی کی موت چاہتی ہے۔ بعد میں مجھ کو اس کی تصدیق بھی ہوگئی اور وہ اس طرح کہ ایک روز یہ عورت مجھ سے ملنے آئی اور باتوں باتوں میں کہنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب اگر میری یہ بیٹی زندہ نہ ہوتی تو میں آزاد ہوتی اور جس سے میں محبت کرتی ہوں اس کے ساتھ جا سکتی تھی" موصوف اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اصل بات یہ ہے۔ ماں غیر شعوری طور پر بچی کی موت چاہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی تندرستی سے متعلق جو تشویش اور غیر معمولی فکر و تردد کا اظہار کرتی تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح اپنی غیر شعوری خواہش کا ازائد از ضرورت بدل ..... (Over-Compensation) کرنا چاہتی تھی۔

والدین کی محبت اور اسلامی تعلیمات

مذکورۂ بالا سطور سے یہ اندازہ ہوگا کہ والدین کو اولاد سے جو تعلق ہوتا ہے اس میں نفسیاتی طور پر کس قدر الجھنیں اور پیچیدگیاں ہیں اور یہ صاف ظاہر ہے کہ ان الجھنوں کے صحیح حل پر ہی بچوں کی اور اس طرح گویا پوری نسل کی فلاح و بہبود اور ان کو صحیح معنی میں "انسان" بنانے کا دارومدار ہے۔ علمائے نفسیات نے سالہا سال کے تجربات و تحقیقات کے بعد فطرتِ انسانی کی خام کاریوں کا سراغ لگایا اور ان کو دور کرنے کے لئے کامیاب حل کی جستجو کی۔ آپ کو گذشتہ بیانات سے اُن کا ایک اجمالی خاکہ معلوم ہوچکا۔ اب ذرا یہ بھی سُن لیجئے کہ اسلام نے کس طرح انسانی فطرت کی ان کمزوریوں کو پہلے ہی بھانپ لیا اور ان کا حل بتا دیا تھا۔ ماہرینِ نفسیات نے جو بات سالہا سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد ضخیم ضخیم مجلدات میں کہی ہے۔ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند فقروں میں ہی اس حقیقت کو آشکارا کر دیا اور زیادہ بہتر، محکم تر، اور قطعی تر طریقہ پر۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس رجحانِ سرد مہری" یا جذبۂ تنفر کو لیجئے جو والدین کے دل میں سب اولاد یا کسی ایک کی نسبت ہوتا ہے اور جیسا کہ ابھی مذکور ہوا۔ فرائڈ اس کو Ambivalence کہتا ہے۔ اولاد سے متعلق بیزاری کا یہ جذبہ زیادہ تر اس سے ہوتا ہے کہ ماں باپ معاشی اعتبار سے تنگدست ہوتے ہیں، انھیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ خود ہم دونوں میاں بیوی کی ہی گذر تنگی ترشی سے ہوتی ہے۔ اولاد ہوگی تو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ یا اس بیزاری کا سبب یہ ہوتا ہے کہ بالفعل تو انھیں اولاد کے ہونے سے کوئی دشواری اور تنگدستی پیش آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ البتہ مستقبل کے بارہ میں ان کو یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر اولاد یونہی بڑھتی رہی تو پھر ان کے ذرائع معاش کفالت نہیں کر سکیں گے۔ قرآن مجید میں ان دونوں اسباب کی طرف الگ الگ اشارہ فرما کر اولاد سے متعلق بیزاری کا جذبہ رکھنے کی صاف ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

ولا تقتلوا اولادکم من املاق — تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے ڈر سے قتل مت کرو۔

نحن نرزقکم وایاھم — ہم ان کو اور تم کو دونوں کو رزق دیتے ہیں۔

یہ آیت جو سورۂ انعام کی ہے اس میں لفظ "من املاق" کا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ افلاس بالفعل ہے اور موجود ہے۔ پھر یہی آیت بنی اسرائیل میں آئی ہے مگر وہاں لفظ "خشیۃ املاق" ہے۔ اس لفظ خشیۃ سے اشارہ اس طرف ہے کہ تنگدستی بالفعل نہیں ہے۔ البتہ اولاد کی پیداوار کے بڑھتے رہنے سے اندیشہ ہے کہ آئندہ حالات پریشان کن ہو جائیں تو قرآن نے اس سے بھی منع فرما دیا ہے۔

اولاد کے معاملہ میں سب سے زیادہ بدقسمت ہمیشہ بیٹیاں رہی ہیں۔ عہدِ جاہلیت میں اونچی ناک والے عرب تو ان غریبوں کو زندہ درگور ہی کر دیا کرتے تھے جس پر قرآن مجید نے انھیں یہ کہہ کر للکارا۔

واذ الموؤدۃ سئلت بای — اور جبکہ زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائیگا

ذنب قتلت۔ — کہ اُسے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔

اگرچہ عرصہ دراز ہوا یہ انسانیت سوز رسم مٹ گئی لیکن واقعہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے اس جگمگاتے

دور میں بھی بیٹوں کی نسبت عام انسانی ذہنیت مکمل طور پر درست نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ لڑکی کے پیدا ہونے پر اتنی خوشیاں نہیں منائی جاتیں جتنی کہ لڑکے کی پیدائش پر منائی جاتی ہیں۔ عام بول چال میں لڑکی ہوتی ہے تو باپ سے ازراہِ ہمدردی اس کے دوست احباب یہی کہتے ہیں کہ "آہ! غریب پر ڈگری ہوگئی" چونکہ یہ حد درجہ افسوسناک ذہنیت انسانی دماغوں میں بری طرح جڑ پکڑ چکی تھی۔ اس لئے قرآن نے اس پر خاص طور سے متنبہ کیا۔ دیکھئے! کس عجیب و غریب اور انتہائی بلیغ و موثر انداز میں ارشاد ہوتا ہے۔

واذا بُشّر احدھم بالانثیٰ ظلّ	ان میں سے کسی ایک کو بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری
وجھہ مسودًا وھو کظیم ہ	دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ فوراً کالا پڑ جاتا ہے اور وہ
یتوارٰی من القوم من سوءِ ما بشّر بہ	جی ہی جی میں گھٹنے لگتا ہے اب وہ اس بری خوشخبری کی
ایمسکہ علیٰ ھون ام یدسّہ	وجہ سے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے وہ نہیں جانتا کہ اس
فی التراب الا ساء ما یحکمون۔	مولود کو ذلیل ہوتے ہوئے زندہ رہنے دے یا اُسے مٹی میں
	داب دے۔ سنو! کتنا برا ہے یہ فیصلہ۔

غور کرنا چاہئے اس آیت میں کس بلاغت کے ساتھ ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اولاد کے معاملہ میں بیٹا اور بیٹی میں تفریق کرتے ہیں اور بیٹی کے پیدا ہونے پر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ [۱]

(باقی آئندہ)

---

[۱] اس موقع پر مجھے اپنی مرحومہ چھوٹی بہن کا جو نہایت ذہین اور قابل تھی ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک روز نا اسلام میں عورتوں کے مرتبہ و حیثیت پر گفتگو کے دوران میں کہنے لگی "بھائی! کفار عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے جب خدا نے ان کی تردید کی تو ان لوگوں کو خطاب کرکے فرمایا "تم اپنے لئے تو بیٹے رکھتے ہو اور خدا کیلئے بیٹیاں یہ کیسا حکم کرتے ہو" مرحومہ نے اس کو نقل کرکے کہا اس سے تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹیاں اللہ میاں کے نزدیک بھی بیٹوں سے فروتر ہیں"۔ میں نے جواب دیا "اسلام میں عورت مرد کی بہ نسبت صنفِ ضعیف و کمزور ضرور ہے لیکن فروتر بالکل نہیں ہے اور اس کا ضعیف ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آج کل کے تمام ماہرین طبیعات و عضویات اور تمام ڈاکٹر تسلیم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن میں مردوں کو "قوامون علی النساء" کہا گیا ہے یعنی عورتوں کے دیدبان و نگران۔ اب رہی آیت زیر بحث تو اس میں خدا نے اُن لوگوں کے دل کے کھوٹ کا پردہ چاک کیا ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتلاتے تھے۔ منشا یہ ہے کہ بیٹیاں تو تمہارے خیال میں ۴ بیٹوں سے کمتر اور فروتر ہوتی ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ اچھی چیز اپنے لئے ثابت کرتے ہو اور کم درجہ کی چیز کا انتساب خدا کی طرف کرتے ہو۔ ورنہ ظاہر ہے قرآن میں متعدد مواقع پر فرمایا گیا ہے کہ "اللہ کے لئے یہ بیٹے اور بیٹیاں تم نے گھڑ رکھی ہیں۔ اس کی ذات مستجمع الصفات تو ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے۔"

ادبیات

نقشِ دوام

از جناب ماہر القادری

یہ کہہ رہی ہے بہت دن سے میرے دل کی اُمنگ
حباب سے بھی ہے کمزور سطوتِ افرنگ

تری نظر ہے اسیرِ طلسمِ محسوسات
مری نگاہ، شہیدِ تجلّیِ بے رنگ

مری نگاہ میں پانی کی یہ لکیریں ہیں
نگارخانۂ بہزاد و صنعتِ ارتنگ[1]

تنزلات[2] کی بحثیں یہ فرق[3] و جمع[4] کا راز
یہی ہے خانقہی درس در زبانِ چنگ

فقیہِ شہر کی یہ رخصتیں یہ تاویلیں
جوازِ سود کے پردے میں ہے خدا سے جنگ

نہ سادگی، نہ صداقت نہ عصمتِ کردار
کہ سازِ دل جو زباں سے نہیں ہے ہم آہنگ

جو دل میں سوز نہیں دل ہے جنسِ ناکارہ
نہ ہو چمک تو ہے آئینہ ایک پارۂ سنگ

[1] ایران کے مشہور مانی کے مرقع کا نام۔ [2][3][4] تصوف کی مشہور اصطلاحیں۔

قطعات

از جناب رشید ذوقی

کیسے کیسے وقت گذرے ہیں، نہ پوچھ — جیسے میری زندگی تھی لازوال
جس ادا پر مسکرا دیتا تھا دل — ختم ہوتی تھی وہیں حدِ جمال

درد چمکا، آنکھ پُرنم ہو گئی — آ گئی ہونٹوں پہ جانِ بیقرار
دل بھی ڈوبا صبح کے تارے کے ساتھ — آہ، یوں ٹوٹا طلسمِ انتظار

تیرے جلووں کی فضا میں قدرتاً — زندگی بڑھتی ہے اہلِ درد کی
لطف دیتی ہے فغانِ نیم شب — بات بن جاتی ہے آہِ سرد کی

آہ، وہ راتیں وہ مدہم روشنی — تازہ آرائش، نئی رنگینیاں
میرے استقبال کو چاروں طرف — دور تک پھیلی ہوئی بےچینیاں

افتراقِ جان و تن ممکن سہی — غم فنا انجام ہو سکتا نہیں
برق شاید چھوڑ دے دامانِ ابر — دل متاعِ درد کھو سکتا نہیں

مدتیں گذریں کہ دیکھا ہی نہیں — چشمِ ویراں نے کوئی عالم نیا
اب کبھی مل بھی سکیں گے دیکھئے — چاندنی رات اور وہ جانِ حیا

یہ شبِ مہتاب، یہ ٹھنڈی ہوا — نور میں ڈوبی ہوئی ساری فضا
ان چھلکتے آئینوں میں آج پھر — جگمگا اُٹھی تری اک اک ادا

تبصرے

Muslim Conduct of State از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن تقطیع متوسط ٹائپ جلی اور روشن ضخامت ۳۵۲ صفحات قیمت معلوم نہیں۔ پتہ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ہمارے ملک کے اُن قابل فخر افاضل میں سے ہیں جو علوم جدیدہ میں اعلیٰ قابلیت رکھنے کے ساتھ اسلامی نظام سیاست واحکام میں محققانہ اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ دل اور دماغ کے اعتبار سے بھی پکے اور سچے مسلمان ہیں۔ آپ کی متعدد تصنیفات اور مقالات عربی۔ انگریزی۔ فرنچ اور اردو میں شائع ہوکر ہندوستان اور اس سے زیادہ بیرونی ممالک کے علمی حلقوں میں بڑی وقعت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں زیر تبصرہ کتاب ہیں جو در اصل کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے۔ موصوف نے امن۔ جنگ اور غیر جانبداری سے متعلق اسلام کے بین الاقوامی قوانین واحکام پر بڑی فاضلانہ اور محققانہ بحث کی ہے۔ کتاب چار حصوں پر تقسیم ہے اور ہر حصہ میں متعدد ابواب ہیں۔ پہلے حصہ میں بین الاقوامی قانون کی تعریف۔ ابتدائی مصطلحات موضوعات بحث۔ مقاصد اور اسلامی قوانین بین الاقوامی کے مآخذ اور اصول پر بحث ہے۔ دوسرے حصہ میں زمانۂ امن کے بین الاقوامی، اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور تجارتی معاملات وتعلقات پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ اُن بین الاقوامی مسائل وامور سے متعلق ہے جو بزمانۂ جنگ پیش آتے ہیں۔ اس میں جنگ کی تعریف اور اس کی قانونی شکلیں بیان کرنے کے بعد تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں جنگ قانوناً کب جائز اور بعض اوقات ضروری ہوتی ہے پھر جب جنگ چھڑ جاتی ہے

تو اس میں کن کن امور کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جن لوگوں سے جنگ لڑی جاتی ہے ان کے مختلف حالات اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے دورانِ جنگ میں اور اس کے بعد اُن کے ساتھ اور ان کے ملک کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں باغی مسلمان کافر راہزن۔ بحری ڈاکو۔ ذمی۔ حربی۔ غلامی۔ تاوانِ جنگ ٹیکس۔ صلح۔ قیدیوں کا تبادلہ وغیرہ یہ سب مسائل زیرِ بحث آگئے ہیں۔ حصۂ آخر غیر جانبداری کے شرائط اور اس کی قوانین واحکام کے لئے وقف ہے۔ اس کے بعد ضمیمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض خلفا و صحابہ کرام کے خاص خاص احکام سے متعلق نہایت قیمتی فرامین کی نقلیں ہیں اور پھر کتاب کے ماخذ کی فہرست اور اعلامیہ واشاریہ ہیں۔

کتاب میں جزئی اعتبار سے کہیں کہیں کلام کرنے یا اضافہ و ترمیم کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۰ پر لکھا ہے "اگر کسی خلیفہ راشد کا عمل کسی عام مروج حدیث کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہئے کہ خلیفۂ راشد کے پاس ضرور کوئی حدیث ہے"۔ اس کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ یہ نظری طور پر تو صحیح ہے لیکن مجھے اس سلسلہ کا کوئی قطعی واقعہ معلوم نہیں" گذارش یہ ہے کہ اس طرح کے متعدد واقعات کُتبِ حدیث میں موجود ہیں جن کی طرف موصوف کا ذہن منتقل نہیں ہو سکا۔ مثلاً فاطمہ بنت قیس رض کی حدیث دربارۂ مطلقہ کو حضرت عمرؓ کا رد کر دینا اور اقرع بن حابس کو تالیفِ قلب کی بنا پر زکوٰۃ دینے سے انکار کر دینا بہر حال اس میں شبہ نہیں کتاب بحیثیتِ مجموعی نہایت فاضلانہ اور محققانہ ہے اور مصنف کی آرزو اور غرض تصنیف کے مطابق اس لائق ہے کہ اس کو اسلام کی طرف سے یورپ کے سامنے پیش کیا جائے اور اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی جائے کہ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد مغرب کے بین الاقوامی قوانین میں جس تغیر و تبدل کی عام ضرورت محسوس کی جارہی ہے آیا اسلام کا یہ قانون اس ضرورت کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ فجزاہ اللہ عن المسلمین جزاءً خیراً۔

ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک | از مولانا مسعود عالم ندوی تقطیع متوسط۔ طباعت وکتابت بہتر
ضخامت ۱۷۵ صفحات قیمت درج نہیں پتہ:۔ دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن۔

ہندوستان میں حضرت سید احمد صاحب شہید اوران کے رفقائے کرام کی تحریک سب سے پہلی تحریک ہے جس کا اولین مقصد تبلیغ وجہاد کے ذریعہ اس ملک میں خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنا اوراس طرح کلمۃ اللہ کو سربلند وسرفراز کرنا تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ معرکۂ بالاکوٹ کے بعد بھی یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ نہایت منظم اور مرتب شکل میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک عرصۂ دراز تک مشرقی بنگال سے لیکر درۂ خیبر تک پھیلی رہی۔ تحریک کے بانی حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اوراس ضمن میں تحریک کے مختصر حالات میں تو چھوٹی بڑی کتابوں کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی کی سیرت سید احمد شہیدؒ پہلے سے موجود ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں خاص تحریک کے تاریخی تسلسل سے بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں فاضل مصنف نے ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی بھی کوشش کی ہے جو چند بیرونی اوراندرونی اسباب کی بنا پر بعض دماغوں میں پیدا ہوگئی ہیں مثلاً یہ کہ تحریک "وہابیت" نجد اور تحریک سید احمد شہید دونوں ایک ہی ہیں۔ یا موخرالذکر پہلی کا شاخسانہ ہے۔ اس ضمن میں مصنف کے قلم سے ہندوستان کی موجودہ جماعت اہلحدیث کی نسبت جو چند بیساختہ کلمات نکل گئے ہیں (ص ۴۹ و ۵۰) وہ ان کی اسلامی دلسوزی کا بیّن ثبوت ہیں۔ البتہ اس کا افسوس ہے کہ موصوف کے قلم تنقید کی زد میں ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر ایسے حق ناشناس واسلام ناآشنا لوگوں کے علاوہ مولانا عبیداللہ سندھی ایسا مفکر اسلام اور دقیقہ رس عالم بھی آگیا ہے واقعہ یہ ہے کہ حضرت سید احمد صاحبؒ اوراُن کی تحریک کا قدردان مولانا سندھی سے زیادہ اور کون ہوسکتا ہے لیکن جس طرح لائق مصنف نے مجاہدین کی کمزوریوں کا ذکر کرکے اُن پر تنقید کی ہے اوراگر تاریخ کا یہ فائدہ ہے کہ ماضی کے واقعات سے مستقبل کے لئے کوئی عبرت حاصل کی جائے تو بلاشبہ ایک مفکر کو اپنی تاریخ کا مطالعہ تنقیدی زاویۂ نگاہ سے کرنا چاہئے۔ اسی طرح مولانا سندھی نے بھی اپنے

علم اور فکر کے مطابق اس تحریک کے بعض متاخر علمبرداروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور چونکہ مولانا تقریر و تحریر پر اور بعض اوقات اپنے جذبات پر بھی قدرت نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کے قلم سے کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے تھے جو ان کے دل کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ علمائے صادق پور پر زیدیت اور شیعیت کا الزام اور دہلی کی سلطنت کے مضبوط بنانے کو تحریک کا مقصد بتانا یہ سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں جو قصور بیان سے پیدا ہوئی ہیں۔ بہر حال اگرچہ نفسِ تحریک کی اہمیت اور اس کی وسعت و اثر کے اعتبار سے جیسا کہ مصنف نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ یہ کتاب اب بھی تشنہ ہے۔ تاہم بڑی محنت اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ جملہ جملہ اور فقرہ فقرہ سے مصنف کا اسلامی درد اور سوز و گداز ٹپک رہا ہے اس کا مطالعہ دینی اور علمی دونوں حیثیتوں سے بہت مفید اور سرمایۂ عبرت و بصیرت ہو گا۔ لیکن املا اور کتابت و طباعت کی غلطیاں بے شمار ہیں جنھوں نے کتاب کو داغدار بنا دیا ہے۔

فکرِ جمیل | از جناب سید جمیل واسطی صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۲۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ:۔ بشیر احمد صاحب اینڈ سنز جونا مارکیٹ کراچی۔

پروفیسر سید جمیل صاحب واسطی ایم اے (کینٹب) سے قارئینِ برہان خوب واقف ہیں۔ موصوف جس طرح انگریزی اور اردو دونوں کے فاضل اور ادیب ہیں اردو زبان کے شاعر شیوا بیان بھی ہیں۔ آپ کی غزلیں اور نظمیں پنجاب کے وقیع ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کتاب موصوف کے ہی منظوم کلام کا مجموعہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس کے بلند اور معیاری ہونے میں شبہ نہیں۔ شاعر پر قنوطیت اور حزن و الم کا غلبہ معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی یہ غم پسندی میدان سعی و کوشش میں تگ و دو کرنے سے باز نہیں رکھتی۔ اُن کے اشعار میں عمیق تفکر، بلند تخیل، کیفیاتِ انسانی کا تجزیہ۔ احساساتِ دلی کا اثر آفریں پیرایۂ بیان یہ سب اوصاف پائے جاتے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ فکرِ جمیل صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے آج کل کی ترقی پسند شاعری کی گندگیوں سے محفوظ ہے۔ پیش لفظ سر شیخ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے جس میں انھوں نے شاعر کو دل کھول کر داد دی ہے۔ امید ہے ارباب ذوق اس کی قدر کرینگے

سنہ۴۲ء۔ قصص القرآن حصہ دوم قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا اقتصادی نظام۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے قیمت ۸ے مجلد للعہ

خلافتِ راشدہ:۔ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جس میں عہد خلفائے راشدین کے تمام قابلِ ذکر واقعات صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں قیمت سے مجلد ۱۲ے

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ ۱۲عہ

سنہ۴۳ء:۔ مکمل لغات القرآن جلد اول۔ لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ۸ے مجلد للعہ

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ ورفتہ ترجمہ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت:۔ صدیوں کے قانونی مطالبہ کا تاریخی جواب۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث۔ قیمت چھ روپئے مجلد سات روپئے۔

خلافتِ بنی امیہ:۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفائے بنی امیہ کے مستند حالات و واقعات ۱۲ے مجلد ۱۲ے

سنہ۴۴ء۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب، اندازِ بیان دلکش قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی۔ قیمت ۸ے مجلد للعہ

سنہ۴۵ء۔ قرآن اور تصوف۔ اس کتاب میں قرآن و سنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مقام عبدیت مع الالوہیت مذہب کا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کو اور اس طرح کے دیگر مسائل کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد سے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاءؐ کے حالاتِ مبارک کا بیان قیمت صہ مجلد ۸ے

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر قابلِ مطالعہ کتاب صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ۳ے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسن خاص:۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائیگا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مُرتّب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء: اسلام میں غلامی کی حقیقت:۔ جدید اڈیشن
جس میں ضروری اضافے کئے گئے ہیں۔ سے مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور
روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد سے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر
کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ۔ سے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۸؍

۱۹۴۰ء: نبی عربی صلعم:۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس
میں سیرتِ سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک
خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے جدید اڈیشن جس میں
اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ عہ

فہم قرآن جدید اڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے
کئے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے اس
موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب۔ عہ مجلد سے

غلامانِ اسلام:۔ اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے
کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی
بیان جدید اڈیشن۔ قیمت صہ مجلد سے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط
محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد ضروری
اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین
بنایا گیا ہے۔ قیمت صہ مجلد سے

۱۹۴۱ء: قصص القرآن حصہ اول:۔ جدید اڈیشن حضرت آدمؑ
سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک صہ مجلد سے

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب۔ عہ مجلد سے

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے
کے لائق ہے جدید اڈیشن جس میں نہایت اہم تازہ ترین اضافے
کئے گئے ہیں حجم پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے اور ۱۹۴۷ء تک کی
تمام بین الاقوامی معلومات آگئی ہیں۔ پانچ روپے۔

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور
مکمل خلاصہ جدید اڈیشن دو روپے

۱۹۴۲ء: قصص القرآن حصہ دوم:۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت
یحییٰؑ کے حالات تک۔ سے مجلد للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام:۔ وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
کیا گیا ہے۔ تیسرا اڈیشن للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا عروج و زوال۔ جدید اڈیشن للعہ مجلد صہ

جلد ہیزدہم　　　　شمارہ (۶)

جون ۱۹۴۷ء مطابق رجب ۱۳۶۶ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبرآبادی ایم۔ اے	۳۲۲
۲۔ موجودہ فرقہ وارفسادات اور اسلام	سعید احمد اکبرآبادی ایم۔ اے	۳۲۳
۳۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی	پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے	۳۵۴
۴۔ عربی ادب میں بہاریہ مضامین	مولوی حافظ رشید احمد صاحب ارشد ایم۔ اے	۳۶۹
۵۔ ادبیات:۔		
عرضِ شوق	جناب عامر عثمانی	۳۸۱
۶۔ تبصرے	م۔ ح	۳۸۲

حکومتِ ہند کی جدید پالیسی کے مطابق آج کل آل انڈیا ریڈیو پر خبروں کے بلیٹن میں اردو زبان کی جو گت بن رہی ہے اس پر کوئی شخص بھی ہندو ہو یا مسلمان جس کی مادری زبان اردو ہے بے چینی اور اضطراب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر ہندوستان کے نئے نظام کا نقشہ اسی نہج پر مرتب ہوا تو اُس کے اس آغاز سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں تک ہمارے ادب اور زبان کا تعلق ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں سے قطع نظر شمالی ہند کے ہندوؤں میں بھی ایسے کتنے ہیں جو اختیار، جلسہ، انتظام، دستور، سلسلہ، امن کے اصول، مطابق، نکتہ چینی وغیرہ ایسے عام اور متداول لفظوں کے مقابلہ میں ادھیکار، بیٹھک، پربندھ، ودھان، سمبندھ، شانتی کے اوپایوں انوسار اور آلوچنا وغیرہ نامانوس و اجنبی الفاظ کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہوں پھر لکھنے والے کے مقابلہ میں لکھیت، وزیر ہند کے مقابلہ میں بھارت منتری اور جاننے والے کے بالمقابل جان کار ایسے لفظوں میں کونسی خوشنمائی اور خوبی و سہولت ہے کہ پرانے لفظوں کو ترک کر کے ان نئے لفظوں کو خواہ مخواہ ٹھونسا جا رہا ہے۔

لیکن کوئی بتائے کہ اب ہم اس کی شکایت کریں تو کس سے کریں۔ اُس کمیٹی سے کریں جو ایک ہندو اور دو مسلمانوں پر مشتمل تھی اور جس کی متفقہ رپورٹ پر ہی حکومت ہند نے یہ پالیسی بنائی ہے اور جس نے اصولی اور بنیادی غلطی ہی یہ کی ہے کہ اردو، ہندی، اور ہندوستانی۔ ان تین مختلف زبانوں کا وجود تسلیم کر کے گویا خود یہ مان لیا کہ ار[دو] ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں ہے۔ یا اس کا الزام اس سیاستِ نافرجام کے سر لگائیں جس نے ہندوستان کو صحیح معنی میں "دوزخ نشان" بنا کر رکھ دیا ہے اور جس کے باعث زبان ایسی مشترک چیز کے بھی تناسب آبا[دی] کے معیار پر حصے بخرے کئے جا رہے ہیں۔ آہ! وہ ہندوستان "جنت نشان" جو کل تک اتفاق و رواداری کا سرسبز و شاداب چمن تھا، آج سرتاسر خارستان عداوت و منافرت بنا ہوا ہے۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں　　مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

موجودہ فرقہ وار فسادات اور اسلام

فاش می گویم واز گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

از

سید احمد اکبر آبادی ایم اے

نہایت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وار کشیدگی۔ دونوں فرقوں کے بڑے بڑے اور ذمہ دار لیڈروں کے مشترکہ اعلانات کے باوجود روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اس نے تمام ملک کو ایک جہنم کدۂ شر و فساد بنا کر رکھدیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس فرقہ وار کشیدگی یا آپس کی مار دھاڑ کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہے۔ ایک مسلمان کسی ہندو یا سکھ پر یا کوئی ہندو اور سکھ کسی مسلمان پر حملہ کرتا اور اسے مارتا ہے، یا کسی اور قسم کا اسے دکھ پہنچاتا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ حملہ آور مسلمان ہے یا ہندو یا سکھ ہے، اور اس کے برخلاف جس شخص پر حملہ کیا گیا ہے وہ حملہ آور کے مذہب کے برعکس کسی اور مذہب کا پیرو ہے، اگر مذہب کا یہ اختلاف درمیان میں حائل نہ ہوتا تو یقیناً حملہ آور اپنے حریف پر حملہ نہ کرتا۔ پس جب فرقہ وارانہ کشیدگی اور موجودہ تباہ کن صورتِ حال کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہے تو اب ہر فرقہ کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس پر غور کریں کہ فرقہ پروری کی جس راہ پر وہ آج گامزن ہیں اس کے

بارہ میں خود ان کے مذہب کے احکام کیا ہیں؟ کسی شخص کے لئے اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور بدقسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ مذہبی جذبہ سے ایک نہایت خطرناک کام کرے، حالانکہ خود مذہب اس کو ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے اور اُس کام کے کرنے پر اُس کو وعیدِ الٰہی اور عذابِ اخروی سے ڈراتا ہے قرآن مجید کی زبان میں اسی قسم کے لوگ ہیں جو خسرالدنیا والآخرۃ ذلك هو الخسران المبين۔ دنیا اور آخرت دونوں گنوائے اور یہی بڑا ٹوٹا ہے" کا مصداق ہیں۔

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے انھیں بتانا چاہیئے کہ اس باب میں اُن کے مذاہب کی تعلیمات کیا ہیں؟ انھوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے یا اب کر رہے ہیں کیا اُن کے مذاہب اس کو جائز قرار دیتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اُن کو اخلاقی جرأت سے کام لیکر صاف لفظوں میں اس کا اعلان کرنا چاہیئے۔ اور اگر واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اُن کے لیڈروں کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے ان کا مذہب اس نوع کے وحشیانہ اور غیر انسانی اعمال و افعال کو ایک لمحہ کیلئے بھی جائز نہیں ٹھہراتا تو اب اُن کا فرض ہے کہ وہ ماضی میں جو کچھ کر چکے ہیں ایک شریف اور سچے انسان کی طرح اس پر صاف دلی کے ساتھ اظہارِ ندامت و افسوس کریں اور عملاً اس کی مکافات کی سعی کریں۔

اب رہے مسلمان! تو جہاں تک ان کا تعلق ہے ہم چاہتے ہیں کہ ایک بار صاف صاف لفظوں میں بتا دیں کہ اس باب میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ تا کہ ان کی روشنی میں مسلمان یہ فیصلہ کر سکیں کہ جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کی نظر میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی موجودہ مسموم فضا میں آئے دن دونوں طرف سے اس قسم کے واقعات پیش آرہے ہیں جو دوسرے فرقہ کے لوگوں کے لئے حد درجہ اشتعال کا سبب ہوتے ہیں لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ وہ ہر لحاظ سے کامل

اور مکمل دین ہے۔ جنگ ہو یا امن، اپنوں کے ساتھ معاملہ کا سوال ہو یا غیروں کے ساتھ۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق کوئی قطعی روشنی اسلام کی تعلیمات میں موجود نہ ہو، اور ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اشتعال انگیز حالات اور شدید ترین ہیجانات کی موجودگی میں بھی وہی کام کرے جس کا اس کو خدا اور رسول نے حکم دیا ہے۔ پھر کسی شخص یا جماعت کے بلند کیرکٹر یا اعلیٰ مکارم اخلاق کا ثبوت بھی اُسی وقت ملتا ہے جبکہ وہ سخت ناساعد اور مخالف حالات میں بھی اپنے مخصوص نظامِ اخلاق پر سختی کے ساتھ قائم رہے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اُس کے جماعتی کردار یا ملی وقار کی پیشانی کا بدنما داغ ہو۔

اس بنا پر ہم چند بنیادی حقایق بیان کرتے ہیں، امید ہے اگر مسلمانوں نے ان کو پیشِ نظر رکھا اور اس پر عمل بھی کیا تو وہ اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے لئے فلاح اور عافیت کا سامان پیدا کرسکیں گے بلکہ اپنی اخلاقی عظمت کا دوسروں کے دلوں پر ایک ایسا نقش قائم کردیں گے جو مٹانے کی لاکھ کوشش کے باوجود مٹ نہ سکے گا۔ بقول اقبال مرحوم

سجدۂ تو برآورد از دلِ کافراں خروش
اے کہ دراز ترکنی پیش کساں نماز را

انسانی جان کا احترام اسلام چونکہ مذہبِ امن وعافیت ہے اور دنیا میں امن وعافیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ بنی نوعِ انسان اپنے سینکڑوں قسم کے باہمی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی انسانی زندگی کا احترام کرنا سیکھیں۔ تاکہ خدا کی یہ وسیع سرزمین ظلم وفساد کی آماجگاہ بننے سے محفوظ رہے۔ اس بنا پر قرآن مجید میں بڑے شدومد اور تکرار واصرار کے ساتھ انسانی جان کا احترام کرنے کی تاکید فرمائی گئی اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کیلئے شدید ترین عذابِ الٰہی کی وعید نازل کی گئی،

قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کے دو بیٹے قابیل اور ہابیل کا واقعہ بیان کرنے کے بعد جس میں ایک نے دوسرے کو بلا کسی وجہ کے قتل کیا تھا ارشاد فرمایا گیا ہے۔

من اجل ذالک کتبنا علی	اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے حق میں یہ لکھدیا کہ
بنی اسرائیل انہ من قتل نفساً بغیر	جو کوئی شخص کسی شخص کو قتل کرے بغیر اس بات کے
نفس او فساد فی الارض	کہ مقتول نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد
فکانما قتل الناس جمیعا ومن	کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا اور
احیاھا فکانما احیا الناس	جو شخص کسی کی جان بچائے تو گویا اس نے تمام
جمیعاً۔	انسانوں کی جان بچائی۔

انسانی زندگی کے احترام کے متعلق اسلام کا جو نقطۂ نظر ہے مندرجہ بالا آیتہ اس میں ایک بنیاد اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے پھر اسی آیتہ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

ولقد جاءتھم رسلنا بالبینات	ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر کھلی نشانیاں لیکر
ثم ان کثیرا منھم بعد ذلک فی	آئے لیکن اس کے بعد بھی ان میں ایسے بہت ہیں
الارض لمسرفون۔	جو زمین میں حد سے تجاوز کرتے ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ انسانی جان کے احترام کا فرض کسی خاص نبی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں ان کی تعلیمات میں یہ حکم امر مشترک کی حیثیت سے ہمیشہ قائم اور باقی رہا ہے ایک اور آیتہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاں شرک اور قتل اولاد کی ممانعت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم فرمایا ہے ارشاد ہے۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ	اور جس جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اس کو قتل
الا بالحق ذلکم وصاکم بہ لعلکم	مت کرو مگر ہاں اس وقت جبکہ حق کا تقاضا ہو اللہ

تعقلون۔ نے ان باتوں کی تمہیں تاکید کی تاکہ تمہیں عقل آئے۔"

علاوہ بریں ایک اور جگہ نیک بندوں کی صفات کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا۔

لا یقتلون النفس التی حرم اللہ وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر
الا بالحق ولا یزنون ومن یفعل حق کے قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو
ذلک یلق اثاما۔ کوئی ایسا کریگا پاداشِ عمل بھگتے گا۔

غور کیجئے ان آیات میں مطلق قتلِ نفس بغیر حق کی سخت ممانعت بیان کی گئی ہے۔ مسلم یا غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو بھی بغیر حق کے قتل کرے گا تو اس کو وہی سزا ملے گی جو کسی ایک مسلمان کے بلا وجہ قتل کرنے پر اس کو ملنی چاہئے، اہلِ عرب کے خمیر میں چونکہ قبائلی عصبیت جمی ہوئی تھی اور وہ انسانی جان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس بنا پر علاوہ قرآن مجید کی آیات کے احادیث میں بھی کثرت سے انسانی جان کے احترام اور اسکی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس طرح بار بار کی تکرار سے اسلام نے ان لوگوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ انسانی جان کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہے کہ کوئی شخص جب چاہے اپنے کسی جذبۂ ناراضگی سے متاثر ہو کر ہلاک کر دے۔ انھیں وجوہ سے جس طرح کسی انسان کو بغیر حق یعنی بغیر کسی شرعی اور قانونی وجہ کے قتل کرنا شدید ترین معصیت ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی صدمہ سے متاثر ہو کر یا کسی اور سبب کی بنا پر خودکشی کر لینا بھی عظیم ترین گناہ ہے۔ خودکشی کی ممانعت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی انسان کی زندگی اسلامی نقطۂ نظر کے ماتحت خود اُس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے جس کو وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے ہلاک اور برباد کر سکے۔ بلکہ درحقیقت وہ اس کے پاس خدا کی ایک امانت ہے جس میں وہ صرف خدا کے حکم کے مطابق ہی تصرف اور تغیر و تبدل کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ اپنے ذاتی اور نفسی احساسات و جذبات سے متاثر ہو کر حکم خداوندی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے، مثلاً

خودکشی کرکے اپنی زندگی ختم کرتا ہے یا کسی ایسے شخص کو قتل کرتا ہے جس کو قتل نہیں کرنا چاہئے تھا تو اُس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی امانت میں ناجائز تصرف کر رہا ہے اور اس طرح وہ گویا اپنے عمل سے خدا کو چیلنج دے رہا ہے۔

قومیت، وطنیت اور شعوبیت

اسلام سے پہلے عربوں میں قبائلی عصبیت کی بنا پر آئے دن لڑائیاں رہتی تھیں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا جانی دشمن تھا۔ آج کل کی تہذیب میں قومیت اور وطنیت نے قبائلی عصبیت کی جگہ لے لی ہے اور یہی وہ معصیتِ عظمیٰ ہے جس نے دنیا کے اسٹیج پر ہولناک ترین خونی ڈرامے کھیلے۔ اور آج بھی دنیا میں جو عام تباہی و بربادی، سفاکی و خونریزی اور وحشت و بربریت کا بازار گرم ہے اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ ایک قوم اپنے قومی خصائص کی وجہ سے جن کے عناصر سے اس کی قومیت کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے یا ایک بادی بادۂ وطنیت کے نشہ سے سرشار ہو کر صرف اپنے آپ کو آزادی اور خوشحالی کے ساتھ زندہ رہنے کا حقدار سمجھتی ہے اور اپنے سوا خدا کے دوسرے بندوں کو جو اُس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں اُنھیں اُن حقوق سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔ اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں میں تنازع للبقا کی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کشمکش منافرت عداوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور بالآخر آدمؑ و حوّا کی اولاد جنگل کے بھیڑیوں اور درندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کرنے پر تل جاتے ہیں۔

انسانیت عامہ کا تصور

اسلام جو مذہبِ امن و عافیت ہے اس صورتِ حال کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ اسی بنا پر قرآن نے جہاں قتلِ نفس بغیر حق کی صاف لفظوں میں ممانعت کی۔ ساتھ ہی ان تمام اسباب کی بھی نفی کر دی جو انسانی فطرت کی بے اعتدالیوں کے باعث عام طور پر اس نوع کے قتل کا سبب ہوتے ہیں اور زندگی کے محدود تصورِ قومی و وطنی کی بجائے انسانیت عامہ کا ایک اعلیٰ، بلند ترین اور ہمہ گیر تصور پیدا کیا۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبًا و قبائل لتعارفوا۔
اے لوگو ! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹا ہے کہ تم پہچانے جاؤ۔

بعض آیتوں میں "من ذکر و انثیٰ" کی جگہ "من نفس واحدۃ" آیا ہے یعنی ہم نے سب انسانوں کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے۔ غور کیجئے ان آیات میں خطاب صرف مومنوں یا مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں سے ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام تمام انسانوں کی پیدائش خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ ایک ہی نفس سے مانتا ہے اور جہاں تک مرتبۂ انسانیت کا تعلق ہے وہ اس میں سب انسانوں کو ایک ہی حیثیت دیتا ہے۔ رہا شعوب اور قبائل کا اختلاف تو یہ محض تعارف کے لئے ہے اور بس! ورنہ اس اختلاف کی بنا پر ایک گروہ یا ایک قوم کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے گروہ یا دوسری قوم کو انسانی حقوق سے محروم کردے یعنی اس کو قتل کرے، اس کا مال لوٹے، اس کے گھروں کو آگ لگائے۔ اس کو مذہب بدلنے پر مجبور کرے اور اسے زندگی کی ضرورتوں سے عاری و تہی مایہ بنادے۔ اسی مضمون کو بعض احادیث میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:" تم سب برابر ہو، تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا "کسی عربی کو عجمی پر، یا کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر، یا کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے"۔

البتہ ہاں! اسلام میں ایک انسان کی فضیلت کا دوسرے انسان پر دار و مدار اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ پر ہے چنانچہ فرمایا گیا۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔
اللہ کے نزدیک تم سب میں زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو تم سب میں زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔

لیکن اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "اکرمکم عنداللہ" فرما کر یہ بات صاف کردی گئی
کہ ایک نیک عمل کو بد عمل پر یا ایک دینِ حق کے ماننے والے کو باطل پرست پر جو فضیلت حاصل
ہے وہ اللہ کے نزدیک ہے۔ اور اس خوش نصیبی پر وہ جتنا مسرور ہو بجا ہے۔ لیکن بہرحال جہاں تک انسانی
حقوق کا تعلق ہے ایک نیک عمل کو یہ ہرگز نہ چاہئے کہ وہ اپنے لئے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حقوق
کا طلبگار ہو، بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ ایک پرہیزگار کو ایک فاسق کے مقابلہ میں اور اسی طرح ایک
مسلمان کو ایک غیر مسلم کے مقابلہ میں اس مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے کہ چونکہ وہ متقی ہے اور مسلمان
ہے اس بنا پر روٹی، کپڑا، پانی اور ہوا یہ چیزیں اس کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ اچھی اور عمدہ چاہئیں
خوب یاد رکھئے ان تمام چیزوں کا تعلق خدا کی شانِ ربوبیت و پروردگاری سے ہے اور جیسا کہ اس نے
خود فرمایا ہے وہ رب العالمین ہے اس کی اس شانِ ربوبیت کا فیض جمادات و نباتات اور حیوانات
کی طرح تمام انسانوں کو بلا تفریق مذہب و نسل یکساں طور پر پہنچ رہا ہے اور اس بنا پر کسی شخص کو
نیکی یا بدی۔ اسلام اور غیر اسلام کی بنیاد پر اس میں قطع و برید کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

آج بد قسمتی سے ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت و عداوت کی جو فضا قائم ہوگئی ہے
اس کا اصل سبب مذہب کا اختلاف ہی ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ حقیقت بالکل
واضح اور غیر مشتبہ ہے کہ اسلام ہرگز اس کا روادار نہیں ہے کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سے محض اس کے
غیر مسلم ہونے کے باعث دشمنی رکھے اور وہ اس کی جان و مال کے درپے ہو۔ اسلام انسانیتِ عامہ کے جس
بلند ترین تصور کا داعی و حامل ہے شیخ سعدیؒ نے اُسے نہایت بلیغ پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند	که در آفرینش ز یک جوہر اند

یعنی پوری انسانی سوسائٹی من حیث المجموع ایک جسم کی طرح ہے اور مختلف افرادِ انسانی
اس کے اعضا و جوارح ہیں جس طرح اعضا و جوارح میں آپ دیکھتے ہیں ایک عضو تندرست ہوتا ہے

اور دوسرا بیمار۔ ایک سڈول اور موزوں ہوتا ہے اور دوسرا ناہموار اور ناموزوں۔ ایک عضو خوبصورت ہوتا ہے دوسرا بدصورت۔ ایک قوی ہوتا ہے دوسرا کمزور، لیکن ان اختلافات کے باوجود بہرکیف وہ سب ہوتے ہیں ایک ہی جسم کے اجزا، جن کے باہمی تعاون واشتراک پر ہی جسم کے زندہ رہنے کا دارومدار ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح تمام افرادِ انسانی خواہ وہ مذہب۔ تمدن۔ رنگ ونسل اور قوت وضعف کے اعتبار سے کیسے ہی مختلف ہوں بہر حال وہ سب انسانی سوسائٹی کے جسم کے اعضا ہیں اور اس سوسائٹی کی خیریت اسی میں کہ یہ سب افراد باہم تعاون واشتراک سے رہیں۔ پھر جس طرح اگر ایک عضو تندرست اور مضبوط ہے تو وہ دوسرے بیمار اور کمزور عضو کا دشمن ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ ازراہِ خیر خواہی اور ہمدردی وغمگساری کے جذبہ سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ بیمار عضو کی بیماری اور کمزوری چلی جائے اور وہ بھی اسی کی طرح مضبوط اور تندرست ہو جائے۔ البتہ ہاں اگر بیمار عضو کو اپنی بیماری پر اصرار ہو اور وہ تمام خیر خواہانہ مشوروں کو اپنا دشمن جان کر اپنے فساد اور مرض کو دوسرے اعضا تک متعدی کرنے لگے تو اب اس وقت اعضائے صالحہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ جسم کی بقا و حفاظت کی خاطر اس عضو فاسد پر آپریشن کرائیں اور اگر دفع فساد کے لئے آپریشن بھی ناکافی ہو تو سرے سے اس عضو کا ہی خاتمہ کر دیں، آپریشن یا عضو بریدگی کے وقت تمام اعضا کو شدید کرب اور درد محسوس ہوگا لیکن بہر حال انھیں یہ انگیز کرنا چاہئے!۔

بس یہی حال انسانی سوسائٹی کا ہے جو افراد یا جو قوم دینِ حق پر قائم ہے، اعمالِ صالحہ کرتی ہے، دنیا میں نیکی کی زندگی بسر کرتی ہے وہ تندرست اور مضبوط وقوی عضو کی مانند ہے اور اس کے برخلاف جو قوم یا جو انسان ان صفات کا حامل نہیں ہے وہ بیمار اور شکستہ وخستہ عضو کی طرح ہے۔ پس اب سابق الذکر قوم کو دوسری قوم کے ساتھ ہمدردی اور غمگساری تو ہونی چاہئے اور اس بنا پر اسے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ بیمار وضعیف قوم کا مرض جاتا رہے لیکن اس کے ساتھ دشمنی

رکھنے یا اُس کے برخلاف اپنے دل میں جذبات عناد و منافرت کے پرورش کرنے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ آپ ذرا خود اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھئے! اگر آپ خوبصورت ہیں تو کیا اس بنا پر آپ کو بدصورتوں کے ساتھ دشمنی رکھنا اور ان کو اپنا دشمن سمجھنا جائز ہو گا! اگر آپ نیک ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بدعمل انسانوں کو اپنا دشمن سمجھیں اور ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو تبلیغِ اسلام کے لئے یمن بھیجا تو انھیں تاکید کی کہ دیکھنا! تم دونوں نرمی کرنا، سختی نہ کرنا، خوش کرنا اور نفرت نہ دلانا! غور کیجئے کیا یہ رویہ دشمنوں کے ساتھ ہو سکتا ہے؟

خوب اچھی طرح یاد رکھئے! اسلام اپنے پیروؤں کو ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ وہ خود کلمہ پڑھ کر دنیا بھر سے دشمنی مول لے لیں۔ غیر مسلموں کو اپنا دشمن سمجھیں اُن سے کسی قسم کا کوئی اشتراک نہ کریں۔ اگر اسلام واقعی ایک پارس کی پتھری ہے تو ایک مسلمان بشرطیکہ وہ سچا مسلمان ہے آپ اس کو ایک لاکھ غیر مسلموں کے حلقہ میں تنہا چھوڑ دیجئے وہ ایک تنہا سینکڑوں اور ہزاروں کو متاثر کر کے اپنے اندر جذب کر لیگا اور خود ذرا متاثر نہ ہو گا۔

قانونی مساوات اس عام انسانی مساوات و برابری کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ اسلامی قانون کی نظر میں ایک مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہوں اور کسی مسلمان کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر قانون سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے، چنانچہ اسلام میں یہی ہے اور اسی کا نام عدل ہے جس طرح اگر مسلمان باغی ہو جائے یا وہ کسی شخص کو بے گناہ قتل کر دے، یا وہ شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح اگر کسی غیر مسلم سے اس قسم کا کوئی فعل صادر ہو گا تو وہ بھی اسی سزا کا مستحق ہو گا اور جس طرح ایک مسلمان کے پُرامن اور غیر مجرم ہونے کی حالت میں اس کی جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت پر ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم اسلامی حکومت

کے ماتحت پُرامن طریقہ پر رہتا ہے تو اُس کی جان و مال کی حفاظت بھی حکومت کا فرض ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان بھی اس کو بے گناہ قتل کردے تو مسلمان سے اس کا قصاص لیا جائے گا ایک غیر مسلم اپنی حفاظت کا ٹیکس جس کو اصطلاح شرع میں جزیہ کہتے ہیں۔ اس کو ادا کرنے کے بعد جان و مال کے اعتبار سے بالکل ایسا ہی محترم ہوجاتا ہے جیسا کہ ایک مسلمان چنانچہ صاف لفظوں میں فرمایا گیا۔

دماءھم کدماءنا و ذمیوں کے خون ہمارے خون جیسے اور

اموالھم کاموالنا اُن کے مال ہمارے مال جیسے ہیں۔

تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں، ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، صحابۂ کرام کا طرزِ عمل، سلاطین اسلام کا اپنوں اور دوسروں کے ساتھ معاملہ، صوفیائے کرام اور بزرگانِ اسلام کا طور طریق کیا رہا ہے؟

اسلام اور عدل اگر پوچھا جائے کہ کیا کوئی لفظ ایسا ہے جس میں اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعتِ غرا کے تمام احکام و مسائل کی روح سمٹ کر آگئی ہو تو ہم کہیں گے کہ ہاں بیشک ایک ایسا لفظ موجود ہے اور وہ لفظ "عدل" ہے۔ عدل کے معنی وضع الشی فی محلہ کے ہیں یعنی کسی چیز کو اس کی اپنی جگہ پر رکھنا اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا جو ہونا چاہیے۔ اس کی ضد لفظ "ظلم" ہے جس کے معنی وضع الشی فی غیر محلہ ہے، عدل اور ظلم کے اس مفہوم و مطلب کی روشنی میں کسی مجرم کو بالکل سزا نہ دینا یا جرم کی نوعیت سے زیادہ سزا دینا ایسا ہی ظلم ہے جیسا کہ ایک بے گناہ انسان کو بلاوجہ زدوکوب کرنا اور اسے آزار پہنچانا۔ مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے خدا کے قانون عدل کو نافذ کرنے میں اپنے اور پرائے کی کبھی کوئی تمیز نہیں کی، انھوں نے اپنے ساتھ بھی انصاف کیا اور دوسرے کے ساتھ بھی! انھوں نے قانونِ عدل کے سامنے اپنی ذاتی وجاہت و شخصیت اور اپنے قلبی جذبات و

کیفیات کی ذرا پروا نہیں کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں اسلام کی بے پناہ اشاعت ایک بڑی حد تک اسلام کے اسی قانونِ عدل کی وجہ سے ہوئی۔

اسلام میں عدل کی کتنی اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ آپ کو قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوگا۔ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَلَا یجرمنکم شنآنُ قومٍ علیٰ	کسی قوم کا بغض تم کو اس پر مجبور نہ کردے کہ تم
ان لا تعدلوا اعدلو هو	انصاف ہی نہ کرو (نہیں) تم انصاف ہی کرو یہی
اقرب للتقوٰی۔	پرہیزگاری سے زیادہ قریب کرنے والا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:۔

ولا یجرمنکم شنآنُ قومٍ ان صدوکم	اور جس قوم نے تم کو مسجد حرام سے روکا ہے اس کا
عن المسجد الحرام ان تعتدوا	بغض تم کو اس پر مجبور نہ کردے کہ تم زیادتی کرو
وتعاونوا علی البر والتقوی ولا	اور نیکی اور پرہیزگاری پر تم ایک دوسرے سے تعاون کرو۔
تعاونوا علی الاثم والعدوان۔	اور گناہ اور زیادتی پر تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے
واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب	ڈرو۔ بیشک اللہ شدید عذاب والا ہے۔

اس دوسری آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی ایک جماعتِ کثیر کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو ظلم و زیادتی کا کوئی دقیقہ نہیں تھا جو اس وقت مشرکین مکہ نے فروگذاشت کر دیا ہو۔ انھوں نے اللہ کے شعائر کی بے حرمتی کی۔ نہ مسلمانوں کے احرام کا لحاظ رکھا اور نہ کعبہ کی حرمت کا خیال کیا اور مسلمانوں کو مکہ میں جا کر عمرہ ادا کرنے سے صاف روک دیا۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا صبر آزما اور اشتعال انگیز وقت ہو سکتا تھا۔ وہ اس حالتِ اشتعال میں جو کچھ بھی کر بیٹھتے

کم تھا۔ لیکن اسلام کا ڈسپلن اور اس کی سیاست دیکھئے ان حالات میں بھی مسلمانوں کو زیادتی کرنے اور اثم و عدوان پر باہمی امداد کرنے سے منع کیا گیا اور اس کی خلاف ورزی کرنے پر انھیں شدید عذاب خداوندی سے ڈرایا گیا۔ مفسرین نے " ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان " کا یہ بھی مطلب لکھا ہے کہ " اگر مشرکین مکہ عمرہ کرنا چاہیں تو چونکہ پہلے وہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک چکے تھے اس بنا پر اس کا انتقام لینے کے لئے اب مسلمانوں کو نہیں چاہئے کہ وہ مشرکین کو عمرہ کرنے سے باز رکھیں۔

عدل کے سلسلہ میں قرآن مجید میں ایک اور آیت بھی ہے جو مندرجہ بالا دونوں آیتوں سے زیادہ واضح اور مکمل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین	اے ایمان والو تم انصاف پر سختی کے ساتھ قائم رہو
بالقسط شھداء للہ ولو علیٰ	اور اللہ کے لئے گواہ بنو۔ اگرچہ وہ انصاف خود تمہارے
انفسکم او الوالدین و	اپنے یا والدین کے یا اعزہ اقربا کے خلاف پڑتا ہو
الاقربین ان یکن غنیاً	دیکھو! خواہ کوئی دولتمند ہو یا فقیر بہرحال اللہ
او فقیراً فاللہ اولیٰ بھما	ان دونوں سے زیادہ بہتر ہے۔ تم اپنی خواہشات
فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا	کی پیروی میں عدل و انصاف سے مت پھرو اگر
وان تلوٗا او تعرضوا فان	تم نے ایچ پیچ کی بات کی یا حق سے روگردانی کی
اللہ کان بما تعملون	تو سمجھ لو کہ جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس کو جاننے
خبیراً۔	والا ہے۔

عدل کے چند تاریخی واقعات مسلمانوں نے عدل و انصاف کرنے کے ان احکام پر کیونکر اور کس طرح عمل کیا اور ان کے اس عمل نے قوموں پر کیا اثر کیا۔ تاریخ کی کتابیں ان سے پُر ہیں، ہم ذیل میں بطور

مشتے نمونہ از خروارے صرف چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ ایک یہودی نے بعض صحابۂ کرام کی موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی۔ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا انھوں نے فوراً تلوار میان سے باہر نکال لی اور چاہا کہ یہودی کا سر قلم کر کے اس کو بارگاہِ نبوت میں گستاخی کی سزا دیں۔ لیکن سرکارِ دوجہاں نے فرمایا "عمرؓ! میں اس یہودی کا مقروض ہوں اور لصاحب الحق یدٌ۔ ایک صاحبِ حق کو اپنے حق کے مطالبہ کا ہر وقت اختیار ہے۔ اگر تم کو میرے ساتھ ہمدردی ہے۔ تو میری طرف سے قرض ادا کر دو۔ قرض خواہ پر بگڑنے کی کیا ضرورت ہے!

(۲) بنو مخزوم قبیلہ کی ایک معزز عورت فاطمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چوری کے الزام میں پیش ہوئی۔ قریش نے اُس کی سفارش حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ذریعہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حد درجہ عزیز اور محبوب تھے آپ کی خدمت میں پہنچائی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے زبانِ حق ترجمان سے ارشاد ہوا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ تم سے پہلے بڑی بڑی قوموں کے برباد ہونے کی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ کم درجہ کے لوگوں پر قانون جاری کرتے تھے اور ان میں سے اگر کسی معزز اور شریف آدمی سے جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے۔

(۳) جنگِ بدر میں قریش کے دوسرے سرداروں کے ساتھ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص گرفتار ہو کر آئے تو عام اسیرانِ جنگ کی طرح انھیں بھی قید کر دیا گیا۔ پھر زرِ فدیہ کا سوال سامنے آیا تو اس وقت اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ حکم ہوا کہ گھر سے مال منگا کر دو۔ ورنہ رہا نہیں ہو سکتے۔ اب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اور اپنی بیوی حضرت زینبؓ کے پاس پیغام بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے اس کے جواب میں اپنا وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے

نے اُن کو جہیز میں دیا تھا۔ ہار دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیساختہ اپنی اول رفیقۂ حیات کی یاد تازہ ہوگئی اور چشمِ مبارک سے آنسو نکل پڑے۔ تاہم عدل کا تقاضا ہے کہ خود اپنے اختیار سے اپنے داماد کا فدیہ معاف نہیں کرتے۔ عام مسلمانوں سے اجازت طلب کرتے ہیں کہ اگر وہ پسند کریں تو بیٹی کو اس کی ماں کی یادگار واپس کردی جائے پھر جب سب مسلمان اس کی اجازت دیدیتے ہیں تو ابوالعاص کو بغیر فدیہ کے رہا کردیا جاتا ہے۔

(۴) حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے گورنر تھے، اُن کے بیٹے عبداللہ نے ایک قبطی عیسائی کو بلاوجہ مارا تھا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع اور تصدیق ہوئی تو آپ نے باپ کے سامنے خود مضروب کے ہاتھ سے بیٹے کے کوڑے لگوائے اور کوئی دم نہ مارسکا۔

(۵) نجران کے عیسائیوں نے حضرت عمرؓ کے خلاف بغاوت و سرکشی کی تیاریاں کیں اور اس مقصد کے لئے چالیس ہزار آدمی اکٹھے کرلئے تو آپ نے صرف یہ حکم دیا کہ ان لوگوں کو عرب سے نکال کر دوسرے ممالک میں آباد کردیا جائے اور وہ بھی اس رعایت کے ساتھ کہ ان کی جائداد وغیرہ کی مناسب اور واقعی قیمت انھیں ادا کردی جائے۔ علاوہ بریں آپ نے عاملوں کو لکھ بھیجا کہ راستہ میں جہاں کہیں سے ان کا گذر ہو ان کے لئے راحت و آسایش کے سامان بہم پہنچائے جائیں اور جب کہیں یہ مستقل قیام اختیار کرلیں تو دو سال تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

(۶) حضرت عمرؓ کا ایک عیسائی غلام تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہوجائے لیکن جب اس نے مسلمان ہونے سے صاف انکار کردیا تو آپ چپ ہوگئے اور فرمایا "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

(۷) حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ ابوشحمہ نے ایکمرتبہ شراب پی لی تو باپ نے خود اپنے ہاتھ سے بیٹے کے کوڑے مارے۔ یہاں تک کہ وہ اسی صدمہ سے جان بحق ہوگئے۔ یہ واقعہ تاریخی

اعتبار سے اگرچہ کچھ زیادہ مستند نہیں ہے تاہم حضرت عمر فاروق رضؓ کی کلاہِ افتخار میں ایسے بہت سے گوہر ہائے شب چراغ ٹنکے ہوئے ہیں کہ اس ایک واقعہ کے کم ہوجانے سے ان کی جلالت و عظمتِ شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

(۸) جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم لاکھوں کی فوج جمع کر کے مسلمانوں کو شام و فلسطین سے باہر نکال دینے اور اُن کی قوت کو کچل دینے کا عزم بالجزم کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے انتظامات کے لئے ایک ایک پیسہ کی ضرورت تھی لیکن اسلام کی شانِ عدل ملاحظہ ہو۔ اس نازک گھڑی میں بھی انھوں نے حمص کے عیسائی باشندوں کو جمع کر کے اُن سے وصول کیا ہوا خراج یہ کہہ کر انھیں واپس کر دیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے

(۹) جنگ صفین کے موقعہ پر خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو جاتی ہے۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ زرہ دار الخلافت کے ایک یہودی کے پاس ہے آپ نے اس سے مطالبہ کیا تو اس نے جواب دیا" یہ میری اپنی ہے اور ہمیشہ سے میرے ہی قبضہ میں رہی ہے۔ حضرت علیؓ کو یقین تھا کہ یہودی جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ حاکمانہ اختیارات سے کام نہیں لیتے اور اور قاضی شریح کی عدالت میں ایک معمولی مدعی کی حیثیت سے پہنچتے ہیں، قاضی اُن سے گواہ طلب کرتے ہیں تو آپ اپنے ایک غلام قنبر اور اپنے صاحبزادہ حضرت حسنؓ کو پیش کرتے ہیں اس پر قاضی نے کہا" کہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں معتبر نہیں ہوتی۔ اس لئے امام حسنؓ کی گواہی آپ کے حق میں بالکل بے کار ہے۔ یہودی یہ منظر دیکھ کر بیساختہ کلمہ پڑھنے لگا اور بول اٹھا کہ جس دین میں عدل و انصاف کا یہ عالم ہو وہ کبھی جھوٹا دین نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) حضرت عمرؓ کے پاس جب ٹیکس اور محصولات کی رقمیں آتی تھیں تو آپ ذمہ دار افسروں کو جمع کر کے اُن سے بار بار قسمیں لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی ایک پیسہ بھی کسی مسلمان یا غیر مسلم سے

جبراً یا قطعاً وصول نہیں کیا ہے۔

(۱۱) فارس کے علاقہ میں مسلمانوں نے ایک شہر کا محاصرہ کیا۔ محصورین شکست کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے کہ اتنے میں اسلامی لشکر کے ایک غلام نے شہر والوں کے نام ایک امن نامہ لکھ کر تیر کے ذریعہ شہر میں پھینکدیا۔ محصورین یہ دیکھکر شہر کا دروازہ کھول باہر چلے آئے۔ حضرت عمرؓ کے پاس یہ معاملہ گیا تو آپ نے فرمایا" مسلمان غلام بھی عام مسلمانوں کی طرح ہے اس بنا پر اس کے امن دینے کی وقعت بھی وہی ہے جو عام مسلمانوں کے امن دینے کی ہے۔ پس امن نافذ کیا جائے۔

یہ چند تاریخی واقعات جو آپ نے پڑھے عہدِ نبوت اور خلافت راشدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے قطع نظر اگر آپ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی عدل و انصاف کے بیشمار حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ انتہا یہ ہے کہ سلطان محمد بن تغلق جیسا جابر و قاہر بادشاہ جس کو عام طور پر" خونی" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ابنِ بطوطہ خود اپنی آنکھوں دیکھا اس کے دربار کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے" ایک مرتبہ ایک ہندو امیر نے سلطان محمد بن تغلق پر دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے میرے بھائی کو بلا سبب مار ڈالا ہے۔ بادشاہ بغیر کسی ہتھیار کے پیدل قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا اور آداب تعظیم و تکریم بجالایا۔ پھر وہ کھڑا رہا اور قاضی حاکم کی حیثیت سے مقدمہ کی سماعت کرتا رہا۔ انجام کار فیصلہ یہ سنایا گیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اسے چاہئے کہ مدعی کو راضی کرلے۔ ورنہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔

علاوہ ازیں ایک دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے" ایک مرتبہ ایک امیر کے لڑکے نے بادشاہ پر دعویٰ کیا کہ اس نے بلا وجہ اس کو مارا ہے۔ معاملہ قاضی کے سامنے گیا تو اس نے باقاعدہ مقدمہ کی سماعت کرکے فیصلہ دیا کہ" یا تو بادشاہ لڑکے کو راضی کرلے ورنہ قصاص دے۔ یہ تو خیر ہو گیا لیکن اس واقعہ

میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ابن بطوطہ لکھتا ہے "میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے اس فیصلہ کے بعد دربار میں آکر لڑکے کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی دیکر کہا کہ "لے اب مجھ سے اپنا بدلہ لے" اور مزید برآں اس کو اپنے سر کی قسم دیکر کہا کہ جیسا میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھ کو اسی طرح مار۔ اب لڑکے نے بادشاہ کے اکیس چھڑیاں ماریں یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو اس کی ٹوپی بھی سر پر سے گر پڑی۔[1]

جنگ اور اسلامی اخلاق کسی قوم کے قومی اور جماعتی اخلاق و کردار کے لئے سب سے زیادہ آزمائش اور ابتلا کا وقت وہ ہوتا ہے جبکہ وہ کسی قوم سے برسرپیکار و جنگ ہوتی ہے۔ اسی موقع پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون درحقیقت بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر کا مالک ہے اور کون اس سے محروم ہے۔ مسلمان کا ہر کام یہاں تک کہ کسی کے ساتھ اس کی دوستی اور دشمنی، صلح اور جنگ یہ سب چونکہ محض احکامِ خداوندی کی تعمیل و بجا آوری کے لئے ہوتا ہے اور کسی چیز میں اس کے اپنے حظِ نفس اور ذاتی لطف و تلذذ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی شان یہ رہی ہے کہ جنگ کے نازک سے نازک موقع پر بھی انھوں نے اسلام کے قانونِ عدل و انصاف کا سررشتہ اپنے ہاتھ سے نہیں دیا۔ اُن کو اسلامی قانونِ عدل کی سچائی کا اس درجہ یقین تھا کہ اگر کسی وقت اس پر عمل درآمد کرنے میں انھیں بظاہر اپنی شکست کا اندیشہ یا کمتری و بے چارگی کا احساس پیدا ہوا بھی تو وہ اسے ہنسی خوشی انگیز کر گئے اور اپنے قدم کو سرِ جادۂ انصاف سے ایک لمحہ کیلئے نہیں ہٹنے دیا۔

قتل بغیر حق اور قتل بالحق کا فرق شروع میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ قتل بغیر حق کی سخت ممانعت کی گئی ہے "بغیر حق" کی قید ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ قتل بالحق نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ فتنہ و فساد اور جبر و ظلم کے قلع قمع کرنے اور دنیا میں حقیقی امن و امان قائم کرنے کے لئے واجب

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۰۔

اور ضروری ہے. قتل بالحق کب واجب ہوتا ہے؟ قرآن نے اس کو مبہم نہیں رکھا بلکہ اس کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک جزیہ کی تشریح کی ہے۔ یہاں اُن تمام تفصیلات کو بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ گنجایش۔ البتہ ہاں ایک بات بالکل صاف ہے اور وہ یہ کہ قتل بالحق کا اختیار کسی حالت میں بھی کسی فردِ واحد کو نہیں دیا جاسکتا۔ یعنی اگر فرض کیجئے کسی ایک شخص نے کسی کو بے گناہ قتل کردیا اور قاتل کو مقتول کے کسی وارث نے پکڑ لیا تو اب وارثِ مقتول کو خود یہ حق نہیں ہے کہ وہ قاتل کا سر قلم کردے اور اس طرح اُس سے قصاص لے لے۔ بلکہ اسے چاہیئے کہ حکومت کے سپرد کردے بہر حال خوب یاد رکھیے کہ کسی شخص واجب القتل کو قتل کرنے یا کسی قوم کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا اور پھر اسی کے مطابق اُس سے معاملہ کرنے کا حق کسی ایک مسلمان کو انفرادی حیثیت میں ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ حق ہے صرف اسلامی گورنمنٹ کا۔ اور اگر گورنمنٹ باقاعدہ طور پر موجود نہ ہو تو پھر اس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت جس کو عام نمایندگی حاصل ہو وہ اس کا اعلان کرسکتی ہے۔

جنگ میں ممنوع افعال | باقاعدہ طور پر اعلانِ جنگ ہوجانے کے بعد بھی مسلمانوں کو جن اخلاقی احکام پر کاربند ہونے کا حکم دیا گیا ہے. بے شبہ وہ جنگی اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں. جنگ کی حالت میں بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ صرف اُن لوگوں سے جنگ کریں جو اُن سے جنگ کررہے ہوں یعنی باصطلاحِ شرع مقاتلین ہوں، ان کے برخلاف وہ لوگ جو پُرامن شہری کی حیثیت رکھتے ہوں اور جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہ ہو مثلاً بوڑھے، عورتیں، بچے، مذہبی پیشوا اور عبادت گذار لوگ ان میں سے کسی کا قتل جائز نہیں ہے. علاوہ بریں درختوں کا کاٹنا، کھیتوں کو آگ لگانا، مکانوں کو منہدم کرنا، یا فریقِ مخالف کے کسی فرد کو غیرانسانی سزا دینا۔ مثلاً اُس کو زندہ آگ میں جلادینا۔ ہاتھ پاؤں کاٹ کاٹ کر مارنا یا اُسے بجبر مذہب کے تبدیل کرنے پر آمادہ کرنا۔ یہ تمام وہ اعمال و افعال ہیں جو اسلامی اصول و آداب... جنگ کے مطابق فریقِ متحارب کے ساتھ بھی نہیں کئے جاسکتے۔

جنگ میں معاہدہ کی پابندی

علاوہ بریں دورانِ جنگ میں اگر مسلمانوں اور فریقِ مخالف میں کوئی معاہدہ ہو جائے تو اسلام کا حکم ہے کہ مسلمان سختی سے اس کی پابندی کریں اور جب تک فریقِ مخالف ہی اس کی خلاف ورزی نہ کرے مسلمان برابر اس پر جمے رہیں۔ معاہدہ کی پابندی کی خو عجیب وغریب اور انتہائی حیرت انگیز مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر دکھائی ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخِ عالم کا پورا دفتر اس کی نظیر پیش کرنے سے یکسر عاری وقاصر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تقریباً ڈیڑھ ہزار جاں نثاروں کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مقام حدیبیہ پر آپ کو روک لیا جاتا ہے اور مشرکینِ مکہ مصر ہیں کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہو کر عمرہ ادا نہیں کرنے دینگے۔ آخر دونوں میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جو بظاہر مسلمانوں کے لئے مغلوبانہ ہے لیکن دراصل یہ معاہدہ ہی بعد کی تمام شاندار فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور اسی بنا پر خود قرآن نے اس کو فتح کے لفظ سے تعبیر کیا۔ اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر آئے گا تو مسلمانوں پر ضروری ہوگا کہ وہ اسے مشرکینِ مکہ کے حوالہ کردیں اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ادھر سے بھاگ کر مکہ میں پناہ لے گا تو اہلِ مکہ پر ضروری نہ ہوگا کہ وہ مفرور کو مسلمانوں کے حوالہ کریں۔

اتفاق دیکھئے کہ ابھی یہ معاہدہ لکھا ہی جارہا تھا کہ عین اس موقع پر ایک مسلمان ابوجندل بن سہیل کفار کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں پاؤں میں بوجھل بیڑیاں ہیں جسم پر زخموں کے نشان ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! مجھے بچائیے۔ ابوجندل کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اسی تاثر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی سخت کلامی کر بیٹھتے ہیں جس کا ان کو عمر بھر افسوس رہتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود چونکہ ابوجندل کو واپس نہ کرنا معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا تھا۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرماتے ہیں ابوجندل!

صبراور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ جو اور کمزور مسلمان ہیں اُن کے لئے کوئی راہ نکالیگا۔ اب صلح ہو چکی ہے اور ہم اُن لوگوں سے بدعہدی نہیں کرسکتے نتیجہ یہ ہوا کہ ابوجندل کو عہدنامہ کے مطابق اسی حالت میں پابزنجیر مکہ واپس جانا پڑا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک لمحہ کے لئے یہاں ٹھہر کر خوب اچھی طرح غور کرو کہ یہ جو کچھ ہوا آخر اس میں کیا حکمت ومصلحت تھی؟ اول تو بدر وحنین کے وہ فاتحین صف شکن جن کے جلو میں فرشتوں کے ان دیکھے لشکر (جنود لم تروھا) چلتے تھے ان کے لئے ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ صلح کرتے۔ سرورکائنات کا اس موقع پر اگر ذرا بھی اشارا ہو جاتا تو جن تلواروں نے اس واقعہ کے تین سال بعد ہی مکہ فتح کیا وہ اب بھی نیام سے باہر آکر اپنی خاراشگافی کا منظر دکھا سکتی۔ اور کفار مکہ کا قلع قمع کرسکتی تھیں۔ اچھا پھر معاہدہ ہوا بھی تو اب مغلوبانہ کہ حضرت عمرؓ ایسا شجاعت وحمیتِ اسلامی کا شیر عرب اس پر بل کھا کھا کے رہ گیا۔ پھر یہ سب کچھ کس کی موجودگی میں، اور کس کے حکم سے ہوا؟ اس نبی برحق اور پیغمبر آخرالزماں کے حکم سے کہ جس کا ایک اشارہ چشم وابرو گردشِ افلاک کے پورے نظام کو زیروزبر کردینے کے لئے کافی تھا! پھر آخر یہ کیا بات ہے کہ یہاں عہدنامہ بظاہر دب کر کیا جارہا ہے لیکن ادھر عالمِ غیب سے مژدہ سنایا جارہا ہے۔

انا فتحنا لک فتحاً مبینا ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

اگر غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس پورے واقعہ میں ڈسپلن۔ بہترین سیاست اور اعلیٰ ترین ضبط نفس وتعمیل احکام خداوندی کا سبق موجود ہے اس میں اس بات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو موقع محل دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ وہ جب چاہیں جذبات سے بے قابو ہو کر تلوار میان سے باہر نکال لیں۔ نیز یہ کہ اگر وہ کسی مصلحت سے کوئی معاہدہ کریں تو انھیں عواقب ونتائج سے بے پروا ہو کر اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہئے! اگر انھوں نے ایسا

توانجام کار فلاح و بہبود اور کامیابی و کامرانی انھیں کو ہوگی۔

اب اس سلسلہ میں ایک واقعہ عہدِ فاروقی کا بھی سُن لیجئے! ۲۳ھ میں مسلمانوں کی ایک فوج نے سیستان کے ایک شہر زرنج کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ محصورین چند روز کے بعد اس شرط پر صلح کرتے ہیں کہ اُن کی تمام زمینیں محفوظ رہیں گی۔ مسلمان اس شرط کو منظور کرلیتے ہیں اور پھر اس پر عمل اس طرح کرتے ہیں کہ جب کھیتوں کی طرف سے گذرتے ہیں تو جلدی سے گذر جاتے ہیں کہ زراعت چھو تک نہ جائے۔

معاہدہ کی پابندی کے حکم کی انتہا یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا کافروں کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو چکا ہو اور پھر مسلمانوں کی ہی کوئی جماعت معاہد مسلمانوں سے اُن کافروں کے خلاف کوئی مدد مانگے تو قرآن کا صاف حکم ہے کہ مسلمانوں کو معاہدہ کا خلاف کرکے کافروں کے مقابلہ میں اپنے دینی بھائیوں کی بھی مدد نہیں کرنی چاہئے۔ ارشاد ہے۔

وان استنصروکم فی الدین	اور اگر تم سے تمہارے بھائی دین کے معاملہ میں مدد
فعلیکم النصر الا علی قوم	طلب کریں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی مدد کرو۔ مگر
بینکم و بینھم	ہاں اس قوم کے خلاف اُن کی مدد نہ کرو جن میں اور
میثاق۔	تم میں کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل اس عام غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی آیت میں صحابہؓ کرام کی شان یہ بیان کی گئی ہے "اشداء علی الکفار رحماء بینھم" بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اشداء علی الکفار کے معنی کافروں پر سختی کرنے والے ہیں۔ حالانکہ عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جان سکتا ہے کہ اشداء جمع شدید کی ہے اور شدت سے مشتق ہے جو ضعف کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ پھر شدید کے صلہ میں "علی" کا آنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں شدید کے معنی مضبوط

مستحکم اور قوی کے ہیں نہ کہ تشدد اور سختی کرنے والے کے اس بنا پر مفہوم یہ ہوا کہ صحابۂ کرام آپس کے
معاملات میں بڑے رحمدل، ملنسار اور نرم خو ہیں، لیکن جب حق اور باطل کا اسلام اور کفر کا معاملہ
آجاتا ہے تو وہ پہاڑ کی طرح مضبوطی کے ساتھ امر حق پر جمے رہتے ہیں اور اس وقت کسی قسم کی کوئی
مداہنت نہیں دکھاتے اور اس طرح کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں اور درحقیقت یہی وہ صفت
ہے جو اُن کے اعتدال قوٰی اور توازنِ فکر و عمل کی دلیل ہے۔ یہی شدید کا لفظ قرآن مجید میں ایک
اور مقام پر بھی آیا ہے "اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِیۡد" یہاں بھی شدید کے معنیٰ مضبوط کے ہیں نہ کہ
تشدد اور بے جا سختی کے۔ کیونکہ اِنَّ اللہ لیس بظلام للعبید فرما کر خود بے جا سختی کی جس کا
دوسرا نام ظلم ہے نفی کر دی گئی ہے۔

موجودہ فرقہ وارانہ معاملات | سطورِ بالا میں آپ نے جو کچھ پڑھا اُس سے ایک اجمالی اندازہ اس بات
کا ہو گیا ہوگا کہ حالتِ امن ہو یا حالتِ جنگ دونوں صورتوں میں اسلام کا نظامِ اخلاق و معاملات
اس قدر اعلیٰ اور بلند رہتا ہے کہ اس پر کاربند ہونے سے انسانی شرف و مجد نہ صرف یہ کہ پست
نہیں ہوتا بلکہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حق کے لئے مسلمانوں نے تلوار اٹھائی اور
شجاعت و بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دنیا آج تک ان پر حیران ہے لیکن چونکہ ان کی جنگ
بھی خالصۃً لوجہ اللہ ہوتی تھی اور سخت غیظ و غضب کے عالم میں بھی خدا اور رسول کے احکام کی
پابندی کرتے تھے اس بنا پر جو قومیں ان کی تلوار کی زخم خوردہ ہوتی تھیں وہی ان پر پروانہ وار فدا
ہونے لگتی تھیں۔ گویا وہی مثل ہوئی "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا"

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہاں
قیام کیا، پھر جب وہ عراق واپس بلا لیا گیا تو اس کی محبت و عقیدت اہلِ سندھ کے دلوں میں اس درجہ
جڑ پکڑ چکی تھی کہ یہ لوگ بے ساختہ روتے تھے اور انھوں نے مقام کیرج میں اس کا ایک اسٹیچو

بطور یادگار بنا کر رکھا۔

اب آیئے اس پر غور کریں کہ ملک کے موجودہ حالات کی روشنی میں مسلمانوں کا معاملہ برادرانِ وطن کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے اور انھیں کس زمانہ کے نظامِ اخلاق پر عمل کرنا چاہئے! اس سوال کا فیصلہ اس امر کی تنقیح پر موقوف ہے کہ موجودہ حالت حالتِ امن ہے یا حالتِ جنگ؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کل دونوں قوموں میں کشیدگی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور متعدد مقامات پر اس کشیدگی کا بخار سخت ترین خونریزی اور شدید قسم کی سفاکی و بربریت کی شکل میں ظاہر بھی ہو چکا ہے! لیکن یہاں معاملہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایک قوم نے من حیث القوم دوسری قوم کے خلاف باقاعدہ و باضابطہ اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور اب اشتراک و تعاون کے تمام تعلقات یکقلم منقطع ہو گئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ بحالتِ موجودہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے محکوم ہیں۔ خود مختار حکومت نہ ان کے پاس ہے نہ اُن کے پاس۔ اس بنا پر نہ اعلانِ جنگ اور اس پر آزادی کے ساتھ عمل نہ ادھر سے ہو سکتا ہے اور نہ ادھر سے۔ پھر جنگ کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں متحارب فریق دو الگ الگ کیمپوں میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں، اور یہاں ایسا نہیں ہے ہندو اور مسلمان سب محلہ بمحلہ، بلکہ خانہ بخانہ اور کوچہ بکوچہ رہتے ہیں۔ ملازمتوں میں ایک افسر ہوتا ہے دوسرا ماتحت، دفتروں میں ساتھ بیٹھتے ہیں۔ تجارت میں دونوں ایک دوسرے کے شریک ہیں، ملوں میں اور کارخانوں میں، دکانوں پر اور بازاروں میں دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں میں دونوں شریک ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی انسان بصحتِ ہوش و حواس یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ و پیکار ہیں اور ان کا حکم متحارب قوموں کا ہے۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ گاندھی جی

اور مسٹر جناح دونوں اپنے مشترکہ اعلان میں صاف صاف باہمی خانہ جنگی اور آپس کی مار دھاڑ کی شدید مذمت کرچکے اور اس کو ہندوستان کے روشن نام کی پیشانی پر ایک بدنما داغ بتا چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ دونوں لیڈر اور ان کے علاوہ اور دوسرے چھوٹے بڑے لیڈر بھی مسلسل اپلیں کر رہے ہیں کہ دونوں قوموں کو رواداری اور سہار کے ساتھ پر امن طریقہ پر رہنا چاہئے۔ اور اپنی قوم کے لیڈروں کی نسبت یہ سمجھنا شدید ترین غلطی ہے کہ یہ لوگ زبان سے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اُن کے دل میں نہیں یا خلاف واقعہ ہے۔ ایسا سمجھنے کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ خدانخواستہ ہمارے لیڈر بزدل اور کمزور بھی ہیں اور منافق بھی۔ ایسی صورت میں جبکہ کوئی اپنی گورنمنٹ قائم نہیں، کسی قوم کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں کہ وہ اپنے لیڈروں کی رہنمائی پر اعتماد کرے اور اُن کے کہنے پر چلے۔

علاوہ بریں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر خدا نے مسلمانوں کو صلح کرلینے اور جنگ نہ کرنے کا جو حکم دیا تھا۔ خود خدا نے قرآن مجید میں اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ مکہ میں اس وقت کچھ مسلمان مرد اور عورتیں ایسی تھیں جن کا علم مسلمانوں کو نہیں تھا ایسی صورت میں اگر جنگ کا حکم دیدیا جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ان مسلمانوں کی بے خبری میں مکہ ہی میں رہنے والے قلیل التعداد مسلمان مرد عورت برباد ہوجاتے چنانچہ ارشاد ہے۔

ولولا رجالٌ مومنون ونساءٌ	اور اگر مومن مرد اور عورتیں جن کو تم نہیں جانتے تھے
مومناتٌ لم تعلموھم ان	جن کو تم پامال کردیتے اور ان کی وجہ سے تم کو نقصان
تطؤھم فتصیبکم منھم معرۃ	پہنچ جاتا بغیر علم کے (اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا تم کو
بغیر علم۔	جنگ کا حکم کردیتا)

اس آیت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی ایک مقام کے مسلمانوں کے جنگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ کسی دوسری جگہ کے مسلمان تباہ و برباد ہوجائیں تو مسلمانوں کو ہرگز جنگ نہ کرنی چاہئے

بلکہ صلح کرلینی چاہئے۔ اب اس آیت کو پیش نظر رکھکر ہندوستان میں مختلف قوموں کی آبادیوں کی پوزیشن پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کہیں ہندو اکثریت میں ہیں اور کسی جگہ مسلمان۔ پس ایسی صورت میں اگر بالفرض اکثریت والے صوبہ کے مسلمان جنگ کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیت والے صوبہ کے مسلمانوں پر اس کی زد پڑیگی اور انھیں شدید ترین خطرہ لاحق ہوجائے گا اس کو ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کی جان اتنی ہی قیمتی اور رفیع ہے جتنی کہ دس پچاس سو مسلمانوں کی۔ اس بنا پر آیت بالا سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ جب تک اقلیت والے مسلمانوں کی حفاظت وبقا کا بندوبست نہ ہو اکثریت کے مسلمانوں کے لئے جنگ کرنا یا جنگ کے اسباب پیدا کرنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ یہ بھی واضح ہوگیا کہ کوئی اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لئے اکثریت کا اقلیت کو بالکل نظر انداز کردینا، ان کے مفاد کا خیال نہ رکھنا، یا بالفاظ صحیح تر سیاسی اعتبار سے اقلیت کو غیر مسلم حکومت کا محکوم بنا دینا۔ شرعاً اس کو بھی کیونکر گوارا رکھا جا سکتا ہے؟

تقریر مذکورۂ بالا کی روشنی میں اب اس حقیقت کے واضح اور مبرہن ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ موجودہ حالات میں ہندو اور مسلمان دو متحارب قومیں نہیں البتہ ہاں دو متخاصم قومیں ضرور ہیں یعنی دونوں نے ارباب خصومت کی حیثیت سے اپنا مقدمہ برطانوی اقتدار اعلیٰ کی عدالت میں پیش کر رکھا ہے دونوں طرف کے وکیل اور نمایندے اپنی اپنی قوم کی طرف سے وکالت کر رہے اور مقدمہ اپنے حق میں جیت لینے کی سعی کر رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ از روئے فقہ اسلامی، متخاصم اشخاص یا گروہ کا وہ حکم نہیں ہوتا جو متحارب اشخاص و گروہ کا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں آئینی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ آئینی جنگ کا تعلق عوام سے نہیں ہوتا بلکہ صرف سیاسی لیڈروں اور نمایندگانِ قوم کے ساتھ ہوتا ہے اس بنا پر موجودہ حالات میں خود عوام کے آپس میں لڑنے کی کوئی سعی ہی نہیں۔ انھیں باہم شانتی اور امن سے رہنا چاہئے

سطورِ بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے حسب ذیل نتائج و تنقیحات برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) ہندو اور مسلمانوں کے درمیان حالتِ جنگ نہیں بلکہ حالت امن ہے، اس بنا پر جنگ کے احکام پر عمل کرنا قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔

(۲) چونکہ آبادیاں مخلوط ہیں اور مجموعی اعتبار سے مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس بنا پر مسلمانوں کا فرض ہے کہ جنگ سے حتی الوسع باز رہیں اور جن اسباب سے اشتعال پیدا ہوتا ہو مثلاً گالی گلوج دینا۔ کسی کی تہذیب اور مذہب کو برا کہنا اور اُس کا مذاق اڑانا۔ کسی قوم کے بڑے آدمی کی تضحیک کرنا، ان سب چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اسلامی شرافتِ اخلاق بھی اس کی مقتضی ہے اور موجودہ حالات بھی اس کے داعی ہیں۔

(۳) جو مسلمان بلا وجہ کسی غیر مسلم پر حملہ کرتا ہے اس کو صاف اور کھلے دماغ کے ساتھ مفسد اور خود مسلمانوں کا دشمن سمجھنا چاہئے اور اس بنا پر کسی مسلمان کو اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس کے اس ایک فعل کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ایک مضروب کے بدلہ میں کئی جگہ دو مسلمان مارے جائیں گے۔

(۴) گھروں میں آگ لگانا، تبدیلِ مذہب پر جبر کرنا۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا، زنا کرنا، یہ تمام چیزیں تو خود حالتِ جنگ اور قتالِ شرعی کی صورت میں بھی ناجائز اور شدید معصیت ہیں۔ اس بنا پر حالت امن میں اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کیونکر گوارا کیا جاسکتا ہے!

مدافعت کے لئے تیار رہنے کا حکم

اس میں شک نہیں کہ آج حالات بڑے صبر آزما اور حوصلہ فرسا ہیں، غنڈے اور بدمعاش مذہب کا نام لیکر شہری امن کو تباہ و برباد کرنے کی مساعی میں لگے ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ چونکہ دونوں قوموں کے ارباب حل و عقد نے امن کی اپیلیں کر رکھی ہیں اس بنا پر غنڈوں کی ایک یا متعدد جماعتوں کے فعل کی وجہ سے یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ ایک قوم من حیث القوم متحارب ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حملوں کی صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے! تو اس کا صاف اور کھلا جواب یہ ہے کہ جو لوگ یا جو افراد بلا وجہ مسلمانوں پر اس طرح کے حملے کریں، وہ بے شبہ مفسد، فتنہ پرداز، ظالم اور دشمنِ انسانیت و شرافت ہیں۔ ان کا ہر نوع مقابلہ کرنا چاہیئے اور اس پامردی، استقلال اور جوانمردی سے کرنا چاہیئے کہ جب تک ظالم اپنے کیفر کردار کو نہ پہنچ جائے دم نہ لیا جائے۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اسلام اور کمزوری دو ایسی متضاد و متناقض چیزیں ہیں جو اک ساتھ جمع نہیں ہوتیں مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے کسی سے رحم و کرم کی بھیک نہیں مانگتا بلکہ اپنی حفاظت خود کرتا اور دوسروں کی حفاظت کا فرض بھی انجام دیتا ہے کہ قرآن نے اسے قوامون بالقسط کا منصب سپرد کیا ہے۔ اسی قسم کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے قرآن مجید کا حکم ہے۔

وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ	اور جو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ تم اُن (اپنے
وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ	دشمنوں) کیلئے مہیا کر سکتے ہو وہ مہیا کر رکھو تاکہ ان
عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ	کے ذریعہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے
مِن دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ	علاوہ دوسرے لوگوں کو جنھیں تم نہیں جانتے
يَعْلَمُهُمْ۔	مگر اللہ جانتا ہے۔ ڈرا سکو۔

پھر اسی آیت میں آگے چل کر یہ بھی فرمادیا گیا کہ اس تیاری کے سلسلہ میں مسلمان جو کچھ خرچ کریں گے وہ سب اللہ کے راستہ میں ہوگا جس پر آخرت میں ان کو ثواب ملے گا اور دنیا میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن پر ظلم نہیں کیا جا سکیگا۔

وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يُوَفَّ	اور جو کچھ تم اللہ کے راستہ میں خرچ کروگے وہ تم کو پورا پورا
اِلَيْكُمْ وَاَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (الانفال)	دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جا سکے گا۔

اس کے علاوہ سورۂ نسار کی ایک آیت ہے۔

یاایہاالذین اٰمنوا خذوا ـــ اے ایمان والو تم اپنے بچاؤ کی تمام تدبیریں
حذرکم فانفروا ثبات اوانفروا ـــ کرلو اور سامان لیلو پھر جدا جدا ہوکر نکلو
جمیعاً۔ ـــ یا اکٹھے ہوکر۔

غور کیجئے! پہلی آیت میں دو چیزوں کے تیار رکھنے کا حکم ہے ایک "قوۃ" اور دوسرا "رباط الخیل" ان میں سے اول الذکر چیز سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ اور حفاظت کیلئے وہ تمام چیزیں تیار اور آمادہ رکھنی چاہئیں جو ان کے لئے قوت و طاقت کا ذریعہ ہوں۔ مثلاً آج کل تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، علم اور سائنس، سیاسی دوراندیشی اور سمجھ بوجھ یہ وہ تمام آلات و اسباب ہیں جن سے ایک قوم مضبوط اور طاقتور قوم بنتی ہے۔ اور ہمارے زمانہ میں تو یہ اس درجہ کارگر اور موثر حربہ ہیں کہ انہیں کے ذریعہ ایک قوم دوسری قوم کو فتح کر رہی ہے۔

اب رہا "من رباط الخیل" تو اس سے مراد اسلحۂ جنگ ہیں۔ پس اب آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لئے "بسطۃً فی الجسم" کے ساتھ بسطۃ فی العلم بھی حاصل کرنا چاہئے تاکہ کوئی قوم ان پر جبر و ظلم اور عدوان و زیادتی نہ کر سکے۔ یہی حال دوسری آیت میں لفظ "حذر" کا ہے۔ حذر کے معنی بچنے کے ہیں اور حذر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے بچاؤ کیا جا سکے۔ چنانچہ اس کے مفہوم میں عقل و خرد، سیاست۔ ڈسپلن۔ اقتصادی و معاشی خوشحالی۔ آلات و اسلحۂ جنگ یہ سب داخل ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں کو ان چیزوں کے فراہم رکھنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے اس کا مقصد کسی کو ستانا، لوٹنا، کھسوٹنا اور قتل و غارت کرنا نہیں بلکہ خود اپنی حفاظت اور بچاؤ کرنا اور اپنے سے دفاع کرنا ہے۔ ایک مسلمان کی شان سے جس طرح یہ بعید ہے کہ وہ ظالم اور مفسد ہو، اسی طرح اس کے لئے یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ مظلوم و

مقہور اور نشانۂ شر و فساد بنے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کو عام طور پر حکم دیا کرتے تھے۔

وعلموا اولادکم العوم والرمایۃ ۔ تم اپنی اولاد کو تیرنا اور تیر چلانا سکھاؤ۔

بات چونکہ بالکل بے لاگ ہو رہی ہے۔ اس بنا پر یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر اکے دکے حملے ہونے لگیں تو ان کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان بھی اسی طرح جواب ترکی بترکی دینا شروع کر دیں۔ ورنہ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو حملہ آور قوم کے لوگ شیر ہو جائیں گے اور وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر اُن کو اور زیادہ ستائیں گے۔ ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام ایک دینِ حق ہے۔ اس کا نظام ہر جہت کامل و مکمل ہے اس کے احکام بالکل صاف اور کھلے ہیں جن میں کوئی ایچ پیچ یا کسی قسم کا کوئی گنجلک نہیں ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ جس شخص نے کسی ایک راہ چلتے مسلمان پر حملہ کیا ہے وہ بے شبہ ظالم اور مفسد ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہیئے جو ظالمین و مفسدین کے ساتھ ازروئے قانون کرنا چاہیئے — مسلمانوں کو سعی کرنی چاہیئے کہ ایسا فتنہ پرداز پکڑا جائے اور اس کو قرار واقعی سزا ملے۔ لیکن اگر بالفرض وہ گرفتار نہیں ہوتا تو اب اس کے اس فعل کا انتقام کسی دوسرے شخص سے لینا حالانکہ وہ بالکل پرامن ہے اور اس سے کسی مسلمان کو کوئی آزار نہیں پہنچا ہے، شرعاً عقلاً یا اخلاقاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے اگر مسجد میں کسی نے آپ کے جوتے چرا لئے ہیں اور اصل چور کا پتہ نہیں لگتا تو کیا آپ کے لئے یہ جائز ہے کہ آپ چوری کی واردات کو روکنے اور اس کا سدباب کرنے کی غرض سے کسی دوسرے شخص کا جوتہ چرا لیں۔

Ends Justify Means. آج کل کا مغربی طریقِ فکر یہ ضرور ہے کہ یعنی کسی عمدہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن خوب یاد رکھئے کہ اسلام اس طریقِ فکر سے کلی طور پر اِبا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک اعلیٰ اور

جائز و بلند مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کے لئے وسائل و ذرائع بھی نیک اور جائز اختیار کئے جائیں۔ اگر ایک طاقتور اور تندرست نوجوان شادی کے اخراجات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اسلام صحت و تندرستی کی خاطر اس نوجوان کو زنا کرنے کی یا ایک غریب آدمی کو اپنے بال بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے علاج معالجہ کے لئے چوری کر لینے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ پھر ایک مسلمان پر انفرادی حملہ کے جواب میں کسی ایک غیر متعلق غیر مسلم پر انفرادی حملہ کرنے سے آپ کا مقصد بھی تو حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس سے اور اشتعال بڑھے گا اور اب اور دوسرے مسلمانوں پر حملے ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مجرم تو بچ جائے گا اور دوسرے بے گناہ لوگ طرفین سے خواہ مخواہ تیغِ ستم کا نشانہ بن جائیں گے۔ بہرحال جب تک ایک قوم من حیث القوم شرعاً متحارب قرار نہیں پاتی فاقتلوھم حیث ثقفتموھم پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کل کے انتہائی صبر آزما حالات اور عقل و جذبات کی شدید ترین کشمکش کے زمانہ میں توازنِ فکر و عمل پر قائم رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے "جام و سنداں باختن" کا پہلے بھی مظاہرہ کیا ہے اور اب پھر کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس یقین کے پیدا کرنے کی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود اور دینی و دنیوی کامیابی و کامرانی کا دارومدار صرف قرآن کی تعلیمات اور اسلامی فضائل اخلاق پر کاربند ہونے اور ان پہ جمے رہنے پر ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو قرآن کی بشارت اُنھیں کے لئے ہے۔

لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی

علماء و مشائخ کا اجتماع

از جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ ایم۔ اے

دہلی، اسلامی ہند کی ابتداء سے صوفیاء اور علماء کا مرکز رہی ہے۔ دجلہ و فرات سے علم و عرفاں کی جو موجیں اٹھی ہیں وہ جمنا ہی کے کناروں سے آکر ٹکرائی ہیں۔ بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے ہیں، وہ یہیں آکر ٹھہرے ہیں۔ اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاہیں تھیں، قدم قدم پر مدرسے[1] تھے، کوچہ کوچہ میں مسجدیں تھیں، دور دور سے شائقین علم و فضل یہاں آکر جمع ہوتے تھے۔ تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے اور یہاں پہنچتے تھے۔ ہندوستان کا یہ دار السلطنت "رشکِ بغداد و غیرتِ مصر"[2] بنا ہوا تھا۔ یہاں کے شاعر اس طرح اس کی عظمت اور بلندی کا اعلان کرتے تھے ؎

حضرتِ دہلی کنفِ دین و داد ‏ ‏ ‏ ‏ جنتِ عدن است کہ آباد باد

ہست چو ذات ارم اندر صفات ‏ ‏ ‏ ‏ حرسہا اللہ عن الحادثات

---

[1] چودہویں صدی عیسوی کا ایک مورخ شہاب الدین العمری لکھتا ہے کہ صرف دہلی میں ایکہزار مدرسے، دو ہزار کے قریب خانقاہیں اور شفاخانے ہیں۔ (مسالک الابصار۔ ص ۲۹ - (انگریزی ترجمہ ۱۹۴۳ء مطبوعہ لاہور)

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ از ضیاء برنی۔ ص ۲۴۱ - (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی سر سید ایڈیشن)

ملک ز دروازۂ او فتح یاب سیزدہ دروازہ وصد فتح باب
نام بلندش رہِ بالا گرفت تا بہ ختن شدرہِ یغما گرفت
گر شنود قصۂ ایں بوستاں مکہ شود طائفِ ہندوستاں[1]

(امیرخسرو)

انیسویں صدی میں جبکہ سلطنتِ مغلیہ پرنزع کا عالم طاری تھا اور زوال وانحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، دہلی اپنی دیرینہ شان وشوکت کو خیرباد کہہ چکنے کے باوجود انتہائی بارونق تھی ابھی کچھ نقوش باقی تھے جن سے "کاروانِ رفتہ" کی عظمت وشوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی اگر کسی نے یہاں کے علما سے دہلی کی حالت کے متعلق سوال کرلیا تو بے اختیار کہہ اٹھے ؎

إِنَّ البِلَادَ إِمَاءٌ وهي سَيِّدَةٌ وَأَنَّهَا دُرَّةٌ والكلُّ كالصَّدَفِ

(دوسرے شہر لونڈیاں ہیں اور دلی ملکہ۔ یہ موتی ہے اور باقی سب سیپیاں)[2]

اور اس میں واقعی کوئی مبالغہ بھی نہ تھا یہاں اب بھی علم وعرفان کے ایسے چشمے ابل رہے تھے جن سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ ہند بھی مستفیض ہورہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ اسلامی ہند نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانہ میں دنیا کے مسلمانوں کو مشعلِ راہ دکھائی۔ ایک ایسے نازک دور میں جبکہ تمام دنیائے اسلام حدیث وسنت کو بھول چکی تھی ۔ دہلی ہی نے اس کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا جس کا اعتراف مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا نے اس طرح کیا۔

---

[1] ایک مجلس میں خسروؒ کے یہ اشعار پڑھ کر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرمانے لگے۔

"درد قتیکہ خسرو گفتہ دہلی ہم چنیں بود کہ ہیچ نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ موجود بود کہ می گویند چوں آدم داخل غیاث پور می شد حالش دگرگوں می شد"

(ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ (مطبوعہ میرٹھ) ص ۶۳)

[2] یہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا شعر ہے۔ سرسید نے آثارالصنادید ص ۲۰ پر نقل کیا ہے۔ میرے پیشِ نظر آثار کا سب سے پہلا نسخہ ہے بعد کے نسخوں میں باب چہارم نہیں ہے۔

ولولا عنایۃ اخواننا علماء الھند	"ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر
بعلوم الحدیث فی ھذا العصر	حدیث کے علوم کے ساتھ اُن کی توجہ نہ ہوتی
لقضی علیہا بالزوال من امصار	تو شرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ
الشرق فقد ضعفت فی مصر الشام	مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں صدی ہجری
والعراق والحجاز منذ القرن العاشر	سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا اور چودہویں
للھجرۃ حتی بلغت منتھی الضعف فی	صدی کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل
اوائل ھذا القرن الرابع عشر۔"	پہنچ گیا تھا۔"

چند نفوسِ قدسیہ کی موجودگی نے دہلی کو تمام ممالکِ اسلامیہ کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ میں شام، مصر، چین اور حبش کے لوگوں کے جھمگٹے لگے رہتے تھے تو دوسری طرف شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے خرمنِ کمال کے خوشہ چین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے اور علوم دینی کا چرچا کر رہے تھے[۵]۔ سلطنت دم توڑ رہی تھی، سیاسی زوال و پستی کی آخری منزلیں طے ہو رہی تھیں، لیکن "ذہنی شعور" ابھی مردہ نہ ہوا تھا۔ کچھ بیدار مغز انسان تجدید و احیاء کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اس سیاسی زوال کو مذہبی اور ذہنی زوال کا پیش خیمہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ اللہ کے یہ فرماں بردار بندے حوادث کا مقابلہ کر رہے تھے اور ملت کو مذہبی انتشار اور ذہنی تنزل سے بچانے میں مصروف تھے۔ اُن کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سلطنت کا جاہ و جلال ختم ہونے کے بعد بھی مذہب کی رونق کم نہ ہوئی۔ مذہب میں لوگوں کی دلچسپی اسی طرح برقرار رہی۔ مسجدوں کی وہی شان تھی۔ رمضان کے مہینے میں چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں دو دو تین تین جگہ تراویح

۵۔ شاگردان دے در اقالیم دور و دراز رسیدہ باب علوم دینی بروے خلق کشادند۔
خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۸۸۔

ہوتی تھی[1]۔ جامع مسجد کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ وہاں جتنی جگہ تراویح ہوتی تھی اس کی تعداد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبانی سن کر حیرت ہوتی ہے۔[2]

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے یک دم دہلی کی بساط الٹ دی، پرانی مجلسیں درہم برہم ہوگئیں علمی ومذہبی محفلیں سرد پڑ گئیں۔ گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہوگئے ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغباں وکفِ گلفروش ہے

یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور وشور نہ جوش خروش ہے (غالب)

مسجدیں مسمار ہوگئیں، خانقاہیں تباہ وبرباد ہوگئیں، مدرسوں میں کھیتی ہونے لگی۔ مسجد اکبرآبادی" جس کی رفعت وشان کے آگے گنبدِ اخضر پست[3] معلوم ہوتا تھا ایسی تباہ وبرباد ہوئی کہ نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ مدرسہ رحیمیہ جہاں سے ولی اللٰہی حکمت کا چشمہ ابلا تھا اور جہاں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ نے قرآن وحدیث کے درس دیئے تھے وہاں "مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس" کا تختہ لگ گیا۔[4] "میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑ و دیدی۔ کاغذ کا پرزا، سونے کا تار پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مقبرہ اجڑ گیا۔ کیا اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"[5]

بڑے بڑے گھرانے تباہ وبرباد ہوگئے، عزت وناموس کا بچانا محال نظر آنے لگا۔ جب مصائب ناقابلِ برداشت ہوگئے تو بڑے بڑے بزرگ اور عالم دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

---

[1] آثار الصنادید ص ۱۳۳۔ [2] ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ (مطبوعہ میرٹھ)

[3] آثار الصنادید ص ۲۷

[4] واقعات دار الحکومت دہلی" مولوی بشیرالدین ج ۲ ص ۱۶۷

[5] غالب کا خط سید احمد حسن مودودی کے نام۔ اردوئے معلیٰ (آگرہ ۱۹۱۲ء) ص ۱۸۴-۱۸۳۔

میاں کالے صاحب کے بیٹے میاں نظام الدین نے حیدرآباد کا رخ کیا۔[1] اور شاہ فخر الدین رح کی خانقاہ سونی پڑ گئی۔ شاہ احمد سعید صاحب مجددی رح نے حرمین الشریفین کی راہ لی۔ اور شاہ غلام علی صاحب رح کی خانقاہ کا چراغ گل ہو گیا۔ ہر طرف حسرت اور مایوسی چھا گئی۔ جو اس ہنگامۂ دار و گیر سے بچے وہ "کافور و کفن"[2] کی تمنا کرنے لگے۔ زندگی وبال معلوم ہونے لگی۔ جب کسی نے ان گذشتہ محفلوں کا ذکر چھیڑا تو بے اختیار دل کو پکڑ کر کہنے لگے ؎

تذکرہ دلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز (حالی)

اس مضمون میں ہم ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اُن مشائخ و علماء کا ذکر کریں گے جنھوں نے اس طوفانی دور میں اسلامی سوسائٹی کو ابتری اور انتشار سے بچایا اور حدیث و قرآن کا وہ چرچا کیا کہ مذہب، سیاسی زوال کے خطرناک اثرات سے بچ گیا۔ اس زمانہ میں علماء و صوفیاء کی کوشش تھی کہ عوام کو سنت و شریعت کا پابند بنایا جائے۔ وہ اسی میں مسلمانوں کے مرض کا علاج اور آئندہ ترقی کا راز پاتے تھے۔ چنانچہ خانقاہوں میں شریعت و سنت کی تلقین ہوتی تھی اور مدرسوں میں حدیث و کتاب کا درس۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب رح حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۴۰-۱۱۵۶) کی خانقاہ[3] اس زمانہ میں دلی کی سب سے زیادہ شاندار خانقاہ تھی۔ شاہ صاحب رح نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ کے

[1] غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "حال میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگ گئے تھے وہ بھی بھاگ گئے۔ بردوہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے۔ حیدرآباد میں ہے۔" اردوئے معلی ص ۲۳۱۔

[2] "مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے" (غالب ص ۲۱۳) دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں" (ص ۶۰) جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں "زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے" (ص ۶۰)

[3] خانقاہ کے محل وقوع کے لئے ملاحظہ ہو۔ واقعات دارالحکومت دہلی۔ جلد دوم ص ۱۵۳

مشہور بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے۔ علم و فضل، زہد و ورع میں یکتائے عصر اور یگانۂ روزگار تھے۔ ان کی خانقاہ بقول حالی "دین دار مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھی"[۵۱] اُن کے ایک ہزار کے قریب خلیفہ اور لاکھوں مرید تھے[۵۲]۔ اور مرید بھی اس مرتبے کے کہ ان کی علمیت و فضیلت کے شہرہ سے مصر و ہندوستان گونج رہا تھا[۵۳]۔ دور دور سے لوگ شاہ صاحبؒ کی خدمت میں عقیدت و ارادت کی نذر لیکر حاضر ہوتے تھے سرسید[۵۴] کا بیان ہے۔

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم و شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادتِ ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امڈے تھے"۔[۵۵]

غلام محی الدین قصوری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ صاحب خود فرمانے لگے کہ" ہمارا فیض دور دور پہنچ گیا ہے۔ حضرت مکہ معظمہ میں ہمارا حلقہ بیٹھتا ہے۔ حضرت مدینہ منورہ میں ہمارا حلقہ بیٹھتا ہے۔ بغداد شریف، روم و مغرب میں ہمارا حلقہ جاری ہے"۔[۵۶]

---

[۵۱] "حیاتِ جاوید" از حالی (رعد ایڈیشن سنہ ۱۹۰۱ء) جلد دوم۔ ص ۹

[۵۲] "جواہر علویہ" از مولانا محمد رؤف احمد خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ (مطبوعہ لاہور) ص ۲۴۱۔

[۵۳] شاہ صاحبؒ کے ایک عظیم المرتبت مرید شیخ خالد کردی تھے۔ جن کے مناقب میں علامہ شامیؒ نے ایک مستقل رسالہ "سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد نقشبندی" لکھا تھا۔

[۵۴] سرسید اور اُن کے گھرانے کو شاہ صاحبؒ سے خاص عقیدت تھی۔ شاہ صاحبؒ بھی ان پر خاص التفات فرمایا کرتے تھے۔ سرسید کا نام شاہ صاحب ہی نے رکھا تھا (حیات جاوید ج ا ص ۳۴) اور ان کی بسم اللہ بھی شاہ صاحب ہی نے پڑھائی تھی۔ (حیات جاوید ج ا ص ۴۱)

[۵۵] آثار الصنادید۔ ص ۱۸ (باب چہارم)

[۵۶] مشائخ نقشبندیہ مجددیہ از مولوی محمد حسن۔ ص ۳۰۹

شاہ صاحبؒ کی خانقاہ میں بڑی رونق رہتی تھی۔ پانچ پانچ سو فقیر[۵۱] ان کی خانقاہ میں ہوتا تھا اور وہ اُن کے کھانے اور پہننے کا بندوبست کرتے تھے، توکل کا یہ عالم تھا کہ کوئی نواب یا رئیس جاگیر پیش کرتا تو قبول نہ کرتے بلکہ جواب میں فرما دیتے اللہ تعالیٰ کے وعدے ہماری جاگیریں ہیں[۵۲]۔ ایک مرتبہ امیر محمد خاں والی ٹونک نے وظیفہ قبول کرنے کی درخواست کی۔ مولانا رؤف احمد مصنف جواہر علویہ کو حکم ہوا کہ جواب میں یہ شعر لکھدو ؎

ما آبروے فقر و قناعت نمی بریم | با میر خاں بگو کہ روزی مقرر است[۵۳]

قناعت اس قدر تھی کہ زبان پر شیخ ابن یمین کے یہ شعر رہتے تھے ؎

نانِ جویں و خرقۂ پشمین و آب شور | سیپارۂ کلام و حدیث پیمبری
ہم نسخۂ دو چار ز علمے کہ نافع است | در دیں نہ لغو بوعلی و ژاژ عنصری
تاریک کلبۂ کہ پئے روشنئ آں | بیہودہ منتے نبرد شمع خاوری
با یک دو آشنا کہ نیرزد بہ نیم جو | در پیش چشم ہمت او ملکِ سنجری
ایں آں سعادت است کہ حسرت برو برد | جویائے تختِ قیصر و ملک سکندری[۵۴]

شاہ صاحبؒ حدیث کے بڑے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے حدیث کی سند امام المحدثین حاجی محمد افضل صاحبؒ سے جو مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے بھی استاد تھے حاصل کی تھی[۵۵]۔ وہ خود نہایت پابندی سے فجر اور ظہر کے بعد طلباء کو تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے[۵۶]۔ فرمایا کرتے تھے

---

[۵۱] آثار الصنادید ص ۱۸، جواہر علویہ ص ۱۴۲ - میں فقیروں کی تعداد دو سو لکھی ہے۔
[۵۲] جواہر علویہ ص ۱۴۶
[۵۳] جواہر علویہ ص ۱۴۶، آثار الصنادید ص ۱۸، مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۱۳
[۵۴] جواہر علویہ ص ۱۵۳ - خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۶۹۷
[۵۵] جواہر علویہ ص ۱۴۳ [۵۶] ایضاً ص ۱۴۳ و ۱۴۴۔

کہ میں کتابیں ایسی ہیں جن کی نظیر نہیں۔ کلام اللہ، بخاری۔ اور مثنوی مولانا روم[1]

شاہ غلام علی صاحبؒ کو اتباع سنت و شریعت کا خاص خیال رہتا تھا۔ وہ اپنے مریدوں اور مخلصوں کو برابر نماز کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نماز تمام عبادات کی جامع اور تمام طاعتوں پر حاوی ہے[2]۔ خلاف شرع و سنت لوگوں سے وہ بہت خفا ہوتے تھے اور اپنی مجلس میں ان کا آنا تک گوارہ نہ فرماتے تھے[3]۔ غرض شاہ صاحب نے اپنی عمر شریعت و سنت کی تلقین میں بسر کی۔ جب وصال کا وقت آیا تو وصیت نامہ میں بھی سنت نبویؐ پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی[4]۔ رسول مقبولؐ سے ان کو عشق تھا۔ زبان پر نام آتا کہ ایک کیفیت طاری ہو جاتی[5]۔ رسول پاکؐ سے ان کی عقیدت اور اتباع سنت کا عالم دیکھ کر سرسید بے اختیار پکار اٹھتے ہیں " اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور از خود رفتگی کے سرمو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا۔ اور جو کام تھا بہ اتباع سنت تھا۔"[6]

شاہ صاحبؒ سے آخری زمانہ میں جو فیض جاری ہوا وہ عدیم النظیر تھا۔ ان کے مریدین کا جال تمام عالم اسلام میں پھیل گیا تھا۔ ہندوستان میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں ان کے مرید و عقیدت مند نہ ہوں۔ ان کے مشہور خلیفہ خالد کردیؒ نے ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

امام اولیا سیاح بیدائے خدا بینی	ندیم کبریا سباح دریائے خدا دانی
مہین رہنمایاں شمع جمع اولیائے دیں	دلیل پیشوایاں قبلۂ اعیان روحانی

---

[1] جواہر علویہ۔ ص ۱۵۲۔ مثنوی کے متعلق تو صحیح کہا گیا ہے " ہست قرآں در زبان پہلوی "

[2] " " " ۱۵۵۔　[3] آثار الصنادید ص ۲۱۔　[4] جواہر علویہ ص ۲۳۶

[5] " " " ۱۴۷۔　[6] آثار الصنادید ص ۲۰۔

چراغ آفرینش مہر برج دانش و بینش کلیدِ گنج حکمت محرمِ اسرارِ سبحانی
امینِ قدس عبداللہ شہ کز التفاتِ او دہد سنگِ سیہ خاصیت لعلِ بدخشانی

حضرت شاہ ابوسعید | حضرت شاہ ابوسعید صاحبؒ (۱۱۹۶-۱۲۵۰) حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے مرید اور خلیفہ تھے اور اُن کے بعد سجادہ پر بیٹھے وہ بڑے جید عالم اور بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے غلام سرور نے لکھا ہے۔

"جامع بود میاں علومِ ظاہری و باطنی و فقہ و حدیث و تفسیر" [۱]

علوم ظاہری میں وہ مفتی شرف الدین صاحبؒ دہلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور مولانا سراج احمد صاحبؒ [۲] سے فقہ و حدیث کی سند حاصل کی تھی [۳] کلام اللہ حفظ تھا۔ علم قرأت میں یکتائے روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمال قرأت سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے تھے۔ [۴]

شاہ صاحبؒ کے رات دن علومِ دین کے درس میں صرف ہوتے تھے۔ وقت بچتا تو کلام اللہ لکھ کر وقف کرتے تھے [۵]۔ اتباع سنتِ نبویؐ کا خاص اہتمام تھا۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کے بعد ۹ یا ۱۰ سال تک سجادہ پر بیٹھے اور ہمیشہ اتباع سنت کی تلقین کرتے رہے۔ آپ کی شکل بے حد نورانی تھی اور بے اختیار آپ کی صحبت میں حاضر رہنے کو جی چاہتا تھا [۶]۔ اخلاق کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ہر ملنے والا یہ سمجھتا تھا کہ جس قدر خصوصیت مجھ سے ہے کسی سے نہیں۔ مولوی محمد حسین مصنف مشائخ نقشبندیہ لکھتے ہیں "چونکہ آپ کے مزاج میں ایثار بدرجہ غایت تھا اس سبب سے تلخی و سختی

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۷۰۱ — [۲] مولانا سراج احمد صاحب بڑے عالم فاضل اور عابد تھے، آپ نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں۔ مثلاً ترجمہ صحیح مسلم، صحیح ترمذی، شرح صعدہ، شرح بنو سافرہ، برہان التاویل وغیرہ جواہر علویہ ص ۲۰۵ — [۳] خزینۃ الاصفیاء۔ ج ا ص ۷۰۱
[۴] آثار الصنادید۔ ص ۳۳ — [۵] ایضاً۔ ص ۲۴ — [۶] ایضاً

فقر و فاقہ کہ حسن درویشی ہیں بہت جھیلیں۔ تحمل و بردباری و شکست و مسکنت آپ کے مزاج میں اس قدر تھی کہ جو شاہ صاحب قبلہ کے منکر تھے وہ بھی آپ کے مرید ہو گئے۔ [۱]

شاہ صاحبؒ کا گھر بار بھی تھا اور بال بچے بھی۔ ان علائق کے باوجود وہ ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ شاہ غلام علی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے "مجھ کو ابو سعیدؒ پر فخر ہے۔ میں نے اگر فقیری کی تو کسی کا غم نہیں رکھتا۔ ابو سعیدؒ کو دیکھو کہ باوصف علائق دنیاوی کے اپنے معبود کی عبادت میں مصروف ہے کہ گویا مطلق کوئی تعلق نہیں رکھتا۔" [۲]

شاہ ابو سعیدؒ سے ہزاروں آدمیوں نے فیض حاصل کیا۔ [۳] انھوں نے تمام غیر ممالک سے جہاں سلسلہ مجددیہ جاری تھا اپنا رابطہ قائم رکھا۔ شیخ خالد کردیؒ کے خطوط برابر آتے جاتے تھے۔ ایک خط جس سے سلسلہ کی اشاعت کا پتہ چلتا ہے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"مرکز دائرہ غربت و مہجوری خالد کردی شہر زوری بعرض مقدس عالی مخدومی جناب ابی سعید مجددی معصومی میرساند اگرچہ بیمن ہمت حضرت قبلہ عالم روحی فداہ فیوض خاندان عالیہ آباء واجداد کرام آں مخدوم عالی مقام کہ بیروں از حیز تحریر و خارج از حوصلہ تقریر است اما بمحوائے مالایدرک کلہ لا یترک کلہ بمقام شکر گذاری برآمدہ عرض حضور می نماید کہ یک قلم تمامی مملکت روم و عربستان و دیار حجاز و عراق و بعضے از ممالک قلمرو عجم و جمیع کردستان انجذابات و تاثیرات طریقہ علیہ سرشار ذکر و محامد حضرت امام ربانی" [۴]

آخر عمر میں آپ کو حرمین الشریفین کی زیارت کا شوق ہوا۔ راستے میں بمقام ٹونک وصال فرمایا آپ کو دہلی لاکر حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

---

[۱] مشائخ نقشبندیہ مجددیہ۔ ص ۳۳۲ - [۲] آثار الصنادید۔ ص ۴۴ - [۳] ایضاً ص ۲۵ -
[۴] " " " " ۳۰۹ -

شاہ احمد سعید صاحبؒ | شاہ ابو سعید صاحبؒ کے چار صاحبزادے تھے۔ آپ کے بعد بڑے لڑکے شاہ احمد سعیدؒ مجددی (۱۲۷۷ - ۱۲۱۷) سجادہ نشین ہوئے۔ شاہ احمد سعید صاحب حافظ تھے اور اپنے والد ماجد کی طرح عالم و فاضل تھے۔ حدیث و فقہ میں نہایت مہارت رکھتے تھے[1]۔ مولوی فضل امام صاحب اور مفتی شرف الدین صاحب سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کئے تھے۔ اور مولوی رشید الدین صاحب سے جو شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے علم حدیث کی سند حاصل کی تھی[2]۔ درس و تدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ دور دور سے طلباء آپ کے پاس آتے تھے۔ علم دین پر پورے عبور اور کامل واقفیت کی وجہ سے استفتا آپ کے پاس بھیجے جاتے تھے اور آپ کے فتوی کو نہایت عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

شاہ صاحب اپنے بزرگوں کی طرح سنت و شریعت کی تلقین میں مشغول رہتے اور مریدوں کو اتباع سنت کی ہدایت فرماتے رہتے تھے۔ شاہ غلام علی صاحب فرمایا کرتے تھے "ابو سعید، رؤف، بشارت اللہ اور احمد سعید، اس زمانہ میں ستون دین محمدی ہیں۔"[3]

شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ کی شان و شوکت برقرار رہی، اُن کے یہاں ہندوستان و خراساں سے لوگ آتے تھے اور اُن کے خلفاء قندھار و کابل میں موجود تھے[4] انھوں نے شاہ غلام علی صاحبؒ کے سلسلہ کے بین الاقوامی نظام کو قائم رکھا۔ ہندوستان سے باہر بھی ان سے عقیدت و ارادت کا یہی عالم تھا۔ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے روایت ہے "شاہ احمد سعید مجھ سے پہلے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے جب میں وہاں پہنچا تو آپ بہت مریض تھے۔ ترک لوگ قلعہ میں معالجہ کے لئے اٹھا لے گئے تھے۔ ترک ان کی بہت تعظیم و توقیر کرتے تھے۔[5]

---

[1] آثار الصنادید، ص ۵۔ [2] خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۷۰۹۔ [3] خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۷۰۹۔ [4] ایضاً [5] ایضاً

[5] شمائم امدادیہ، ترجمہ امداد غوثات مکیہ۔ از حاجی محمد مرتضیٰ خاں (مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ ۱۳۱۲ھ) ص ۱۷۶۔

غدر کے ہنگامہ میں شاہ صاحبؒ اپنے اہل وعیال کو لیکر مجبوراً حرمین الشریفین چلے گئے تھے۔ ان کے ہندوستان سے چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدت وارادت کا ایک ایسا مرکز ٹوٹ گیا جس کے ذریعہ ہندوستان کے سلمانوں کا تمام ممالکِ سلامیہ سے قوی روحانی رشتہ بندھا ہوا تھا اُن کے ہندوستان میں قیام کے زمانہ میں عجم وعرب کے بہت سے لوگ دلی کی طرف ہی رجوع کرتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ۱۲۷۷ھ میں وصال پایا اور حضرت عثمانؓ کے روضہ کے قریب مدفون ہوئے۔ [1]

شاہ عبدالغنیؒ | شاہ عبدالغنی صاحبؒ (۱۲۹۶-۱۲۳۴) شاہ احمد سعید صاحبؒ کے چھوٹے بھائی تھے اور اُن کے بعد سجادہ پر بیٹھے تھے۔ ان کا علمی تبحر بے مثال تھا۔ انھوں نے حدیث کی کچھ کتابیں اپنے والد ابوسعید صاحبؒ سے پڑھی تھیں اور کچھ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے۔ شاہ اسحاق صاحبؒ اور شاہ ابوسعید صاحبؒ دونوں محدث زماں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ اس طرح ہر دو سلسلہ سے آپ کی اسنادِ حدیث تیسری پشت پر حجۃ اللہ البالغہ سے جا ملی ہے۔ مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ صاحب نے شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا مخصوص اللہ صاحب کو پڑھ کر سنائی تھی اور بعد ہجرت مدینہ میں بخاری شریف کا کچھ حصہ تبرکاً شیخ محمد عابد الانصاری السندی ثم المدنی کو سنایا تھا۔ مدینہ منورہ ہی میں مقدونیہ کے مشہور عالم شیخ اسمٰعیل بن ادریس الرومی نے خود اپنی خوشی سے صحاح کی اجازت آپ کو عطا کی۔ ان سب اساتذہ کی اسانید بالتفصیل ایک مستقل کتاب کی صورت میں طبع ہو چکی ہیں جن کا نام "الیانع الجنی" ہے۔ [2]

غرض شاہ عبدالغنیؒ صاحب حدیث میں یگانۂ روزگار تھے۔ اپنے عہد کے پانچ بہترین اساتذہ

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی۔ ج ۲ ص ۱۵۴

[2] تذکرۃ الخلیل۔ مولانا عاشق الٰہی مرحوم (مطبوعہ میرٹھ) ص ۱۸-۱۷ نیز واقعات ص ۱۵۴

سند حدیث حاصل کر چکے تھے۔ علمی تبحر سے قطع نظر اُن کا تقدس اور تقویٰ بے مثال تھا۔ سرسید نے اسی وجہ سے ان کو "فنافی السنت" لکھا ہے[1]۔ شریعت کے معاملہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ صرف اس خیال سے کہ "ہندوستان میں جو طریق بیع وشرا بعض بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ہے وہ از روئے شرع درست نہیں ان چیزوں کے مزہ سے واقف نہیں"[2] شریعت کے اس احترام کی مثال قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں ہیں مل سکتی ہے۔ شاہ صاحبؒ کی اس احتیاط کو دیکھ کر حضرت امام حنبلؒ کا وہ اہتمام یاد آجاتا ہے جو انھوں نے بغداد میں قیام کے زمانہ میں موصل سے آٹا منگانے کے سلسلہ میں کیا تھا۔ بغداد کو حضرت عمرؓ نے نمازیوں پر وقف کیا تھا اس لئے امام صاحب وہاں کا آٹا کھانا ناجائز تصور کرتے تھے اور موصل سے آٹا منگاتے تھے۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ شریعت کو مذہبی زندگی کا مرکز تصور کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمان کے لئے سوائے اتباع شریعت، دین ودنیا میں کوئی راہِ فلاح ونجات نہیں اسی لئے وہ مذہبی معاملات میں نہایت سختی برتتے تھے وہ فرمایا کرتے تھے "سوائے انحراف از حکمِ شریعت کے سخت سے سخت کوئی مصیبت نہیں"[4]

شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے فیض یاب ہونے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ سے طلبار آتے تھے اُن کی خانقاہ سینکڑوں علمار کا مرکز بن گئی تھی۔ اُن کے فیض تعلیم نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے عالم اور بزرگ پیدا کئے جو فقہ حنفی کے ایک راسخ القدم امام اور مجتہد تھے۔[5]

---

[1] آثار الصنادید، ص ۲۷۔ [2] ایضاً۔ [3] احیاء العلوم۔ امام الغزالیؒ۔ باب چہارم

[4] آثار الصنادید۔ ص ۲۷۔

[5] میں نے مولانا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راسخ القدم امام اور مجتہد پایا۔ آپ اپنے استاد مولانا عبدالغنی کے طریقۂ فکر کے بڑی سختی سے پابند تھے اور اس راہ میں پہاڑ کی طرح غیر متزلزل تھے۔"

— مولانا عبیداللہ سندھی (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص ۲۵۸)

غدر کے بعد شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر گئے اور مدینہ منورہ میں قیام فرمالیا۔ ۱۲۹۶ھ میں وصال فرمایا اور وہیں شاہ ابوسعید صاحبؒ کے قریب مدفون ہوئے [۱]

شاہ محمد آفاق صاحبؒ | شاہ محمد آفاق صاحب (۱۱۶۰-۱۲۵۱) مجددیہ سلسلہ کے بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ آپ شاہ ضیاء اللہ صاحب نقش بندیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے [۲] خواجہ میر درد کی صحبت میں بھی رہے تھے۔ اور اُن سے فوائدِ باطنی اخذ کئے تھے [۳]۔ آپ کے فیضانِ صحبت سے بہت لوگ مستفید ہوئے۔ ایک چشمۂ فیض تھا جو جاری تھا اور جہاں سینکڑوں تشنگانِ معرفت جمع ہوتے تھے۔ دلی میں آپ کا بڑا رعب اور احترام تھا شاہ غلام علی صاحبؒ نے کتاب "سید المرشدین" کے حاشیہ پر لکھا ہے۔

"حضرت شاہ محمد آفاق سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ضیاء اللہؒ سے جو حضرت خواجہ محمد زبیرؒ کے خلفا میں ہیں اس خاندان کی نسبت [۴] سرگرمی کے ساتھ حاصل کی ہے اور اس وقت حلقہ اور مراقبہ اور افادہ نسبت میں ممتاز ہیں" [۵]

یہ ایک معاصر بزرگ کی رائے ہے اور لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ حقیقتاً آپ کا آستانہ مخزن فیض و برکت بنا ہوا تھا۔ اور دور دراز سے لوگ آتے تھے اور فیض پاتے تھے [۶]۔ شاہ غلام علی صاحبؒ آپ کے علم و فضل زہد و ورع سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے مریدوں کو بعد تعلیم آپ کی خدمت میں تکمیل کیلئے بھیجتے تھے [۷] شاہ صاحبؒ جب کابل تشریف لے گئے تو زماں شاہ بادشاہ کابل آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہوا۔ [۸]

---

۱ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۴۔ ۲ آثار الصنادید ص ۲۸۔ ۳ واقعات ص ۵۰۳ ج ۲۔
۴ مزارات اولیائے دہلی از محمد عالم شاہ فریدی (مطبوعہ دہلی) ص ۱۴۱۔
۵ "نسبت" کا لفظ صوفیاء میں ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کی تشریح شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کی زبانی سنئے۔ صاحب نسبت وہ ہے جسے "جاگتے سوتے کسی حال میں غفلت نہیں ہوتی اور جس امر کی طرف متوجہ ہوتا ہو اس کی طرف سے اس کا القا ہو جاتا ہے ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں"۔ ارشاد رحمانی "مطبوعہ دلی ۱۳۱۱ھ ص ۳۰۔
۶ بحوالہ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۰۳۔ ۷ ایضاً۔ نیز مزارات اولیائے دہلی ص ۱۴۱۔
۸ واقعات۔ ج ۲ ص ۵۰۳۔ مزارات ص ۱۴۱

آپ میں زہد و اتقا اس درجہ تھا کہ ہر شخص صحبت میں رہ جاتا تھا ساتھ ساتھ کسرِ نفسی بے حد تھی آپ کے ہزاروں مرید اور بیشمار خلفا تھے۔ بعض مرید نہایت ذی مرتبت عالم اور بزرگ تھے اور اپنے زمانہ میں یگانہ و یکتا سمجھے گئے مثلاً شاہ فضل رحمان صاحبؒ جن کے خرمنِ کمال سے سینکڑوں ہزاروں نے فیض حاصل کیا[1]۔ اور شاہ نصیر الدین دہلوی جو شاہ رفیع الدین صاحب کے نواسہ اور شاہ اسحٰق صاحب کے داماد تھے ان دونوں بزرگوں نے شاہ محمد آفاقؒ کے نام کو شہرۂ آفاق کر دیا۔ ۱۲۵۱ھ میں حضرت شاہ محمد آفاق صاحب نے وصال فرمایا۔ منڈی کے قریب مغل پورہ میں ایک چھوٹی سی مسجد کے عقب میں آپ کا مزار ہے[2]۔

حاجی علاء الدین صاحب حاجی علاء الدین صاحبؒ، شاہ محمد آفاقؒ کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے اُنھوں نے بڑا مجاہدہ کیا تھا۔ تمام وقت عبادت میں صرف کرتے تھے آخر عمر میں گو آپ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے اور پاؤں نہیں اُٹھ سکتے تھے لیکن صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا وہی عالم تھا[3] ایک لمحہ بھی طاعتِ حق سے غافل نہیں ہوتے تھے، اُن کے زہد و اتقا نے شاہ محمد آفاقؒ کی خانقاہ میں عقیدتمندوں کے ہجوم کو برقرار رکھا۔

مولانا شاہ قطب الدین صاحب چشتیہ سلسلہ میں اس وقت سب سے زیادہ شہرت اور عزت حضرت شاہ فخر الدینؒ کے خاندان کو حاصل تھی۔ شاہ صاحب نے دلّی میں جو مقبولیتِ عامہ حاصل کی تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ شاہ و گدا، عارف و عامی، سب ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان سے فیض حاصل کرتے تھے شاہ فخر الدین صاحبؒ کے بعد اُن کے فرزند مولانا شاہ قطب الدین صاحبؒ مسند نشین ہوئے، ان میں اپنے باپ کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ اس لئے وہ بہت جلد مرجع خلائق بن گئے۔ بادشاہ نے بھی اُن سے بیعت کی۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے "حضرت ظل سبحانی محمد اکبر شاہ بادشاہ صاحبقران ثانی ادام اللہ سلطنتہ وارفع درجتہ، باعتقاد تمام مرید آں فرزند رشید حضرت فخر صاحب گشتند و بعضے فرزندان و متعلقان خود را نیز مرید کنانیدند و بہجت تمام خود را داخل سلسلہ فخریہ نمودہ بادشاہ کونین گشت"[4]۔

۱۲۳۹ھ[5] کو آپ نے وصال فرمایا اور حضرت قطب صاحب کے جوار میں آسودہ ہوئے۔

(باقی آئندہ)

[1] الحرف الصوارغ، حصہ اول ص ۱۱۱ - ۱۱۷۔ [2] واقعات، ج۲ ص ۵۰۶۔ مزارات ص ۱۲۱۔ [3] آثار الصنادید ص ۳۰ [4] شجرۃ الانوار (قلمی نسخہ آخری صفحہ) [5] واقعات (ج۲ ص ۳۴۶) میں آپ کا سنہ وفات ۱۲۰۰ھ لکھا ہے جو کسی طرح غلط معلوم ہوتا ہے۔ مزارات میں ۱۲۳۹ھ ہے اور یہی غالباً صحیح ہے۔

عربی ادب میں بہاریہ مضامین

(جناب مولوی حافظ سید رشید احمد صاحب ارشد ایم۔اے)

بہت سے لوگوں کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ عرب کے صحرا نشین اور بدو شاعروں کے اشعار میں بھی موسم بہار کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عرب کی جغرافی حیثیت کی مطابقت میں عرب کی قدیم جاہلیت کی بہاریہ نظمیں ان رنگینیوں اور رعنائیوں سے خالی ہیں جو عجمی اور فارسی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانہ کے عرب صحرا نشین اور خانہ بدوش تھے اور شہری زندگی کے تکلفات اور آرائشوں سے آلودہ نہیں ہوئے تھے عرب کے لق ودق بیابانوں اور ریگستانوں کی تند وگرم اور آتشیں بگولوں میں موسم بہار کی دھندلی سی جھلک اگر نظر آتی تھی تو وہ ان قدرتی نخلستانوں میں دکھائی دیتی تھی جو قدرتی آب وہوا سے پرورش پاتے تھے اور جہاں چند دنوں کے لئے ان بادیہ نشینوں کے خیمے گڑ جاتے تھے۔ یہی ان کے خوشگوار دن تھے جسے بہار سمجھ لیجئے اور ان ہی خوشگوار دنوں کی یاد عرب کے ان فطرتی شاعروں کو ہمیشہ تڑپاتی تھی۔ چنانچہ عرب کی حقیقی شاعری کے بانی اور نامراد شاعر امرءالقیس کی شاعری انہی خوشگوار ایام اور مٹے ہوئے آثار کا مرثیہ ہے۔

جاہلیت کی شاعری | عرب کا شاعر ہمارے ان اردو شاعروں کی طرح نقال نہ تھا جو اپنے ہندوستانی ماحول کو چھوڑ کر ایرانی شاعری کی تقلید میں گل وبلبل کے فسانے سناتے ہیں اور اس طرح ان کی شاعری حقیقت اور ماحول سے کوسوں دور ہو کر ہمارے جذبات اور زندگی کی

ترجمانی نہیں کرتی ہے۔ برخلاف اس کے عہدِ جاہلیت کے انہی شاعروں کے کلام سے ہم ان کی طرزِ معاشرت، جذبات وخیالات ومشاغل، یہاں تک کہ ان کے عارضی پڑاؤ، درختوں، پھلوں، پھولوں، پرندوں اور جانوروں تک کے نام معلوم کرسکتے ہیں۔ ان کا موسم بہار بہت مختصر اور سادہ ہوتا تھا جس کی تفصیلی کیفیات آپ ان کی زبان سے خود سن سکتے ہیں، یہ بہار آفریں ایام ان کے دلوں پر جو نقش چھوڑ گئے ہیں، ان کا کلام ان سے بھرا ہوا ہے۔ تپے ہوئے ریگستانوں میں کسی وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انھیں بغداد، بصرہ، شیراز وکشمیر کے چمنستانوں سے زیادہ لطف دیتے تھے خاردار جھاڑیاں اور درخت ان کے سبزہ زار تھے، گھوڑے اور اونٹنیاں ان کے رفیق اور محبوب تھے جو اس "بحرِ خشک" میں ان کیلئے سفینہ اور جہاز کا کام دیا کرتے تھے۔ محبوب کے فراق اور گذشتہ ایام وصال کی یاد کے نغمے ان کی موسیقی تھی۔

اسلامی دور | اسلامی دور کے عربی شاعروں کے برخلاف جاہلیت کی شاعری میں موسمِ بہار کے مخصوص پھل اور پھولوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ گلاب، یاسمین، گل لالہ۔ گل لاجورد، بنفشہ، گل خیری، اور پھلوں میں سے کسی مشہور پھل کی روئیدگی اور خوبصورتی کی تعریف نہیں کی گئی بلکہ چند ایسے غیر مشہور درختوں، پھل اور پھولوں کا تذکرہ آتا ہے جن میں سے کسی ایک کی بھی شہرت آج کل کے مہذب زمانے میں بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہوگی لیکن ہم ان کی قوتِ مشاہدہ اور صحیح قوتِ متخیلہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان دعووں کی صداقت کے لئے قدیم شعراء کا نمونۂ کلام پیش کریں لیکن چونکہ اس سے ہم اپنے اصلی موضوع سے دور چلے جاتے ہیں اس لئے ہم مختصر اشارات کے ساتھ قدیم اور اسلامی دور کے عربی شعراء کے بہاریہ اشعار کا نمونہ پیش کریں گے جو ہمارے خیال میں اس موضوع پر پہلی کوشش ہے۔

بہارِ نجد | قدیم زمانے میں سرزمین نجد عرب کا بہار آفریں اور حسن خیز خطہ رہا ہے، یہیں قیس عامری کا وجود بیان کیا جاتا ہے جو مجنوں، لیلیٰ کے لقب سے آج تک عربی، فارسی اور اردو کی محبوب ترین شخصیت سمجھا جاتا ہے اور اسی نے ان زبانوں میں نجد کے نام کو روشن کر رکھا ہے۔ اسی سرزمین میں سے ایک دفعہ ایک بادیہ نشین شاعر بہار کے ایام میں اپنے دوستوں کے ساتھ سوار ہو کے گذر رہا تھا کہ اس "جنت ارضی" کی عطر بیز ہواؤں نے اس کو سرمست بنا کر بے اختیار یہ اشعار اس کی زبان سے برآمد کرا دیئے

تمتع من شمیم عرار نجد فما بعد العشیۃ من عرار

الا یا حبذا نفحات نجد وریا روضۃ بعد القطار

"یعنی اے دوست تو سرزمین نجد کی خوشبودار گھاس "عرار" سے جلد لطف اندوز ہو کیونکہ بعد از شب عرار کی یہ خوشبو نہیں رہیگی (کیونکہ ہم وہاں سے کوچ کر جائیں گے) نجد کی ہوا کے خوشگوار جھونکے کیا ہی نشاط انگیز ہوتے ہیں۔ خصوصاً بارش کے بعد گلشن نجد کی عطر بیز ہوا نہایت لطف دیتی ہے"

آگے چل کر یہی شاعر کہتا ہے کہ جس وقت ہمارا قبیلہ نجد میں فروکش ہوتا ہے تو ہمارے خاندان کی رہائش اس لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اس وقت ہمیں زمانے کی بالکل شکایت نہیں ہوتی عیش و سرور کی گھڑیاں اس قدر جلد گزر جاتی ہیں کہ ہمیں کسی مہینے کے نہ نصف کا پتہ چلتا ہے اور نہ آخری دنوں کا

کیفیت ابر و باراں | مشہور شاعر امرء القیس اپنے مشہور قصیدہ "معلقہ" کے آخری حصہ میں مناظر بہار کا نقشہ کھینچتے ہوئے ابر و باراں کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے۔

"اے دوست! تم بجلی کو دیکھ رہے ہو۔ اس کی چمک ابر آلودہ آسمان میں ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے دونوں ہاتھوں کی چمک سے حرکت پیدا ہو رہی ہو اسے بجلی کی چمک کہئے یا یوں سمجھئے کہ وہ راہب کے چراغ ہیں جنھیں تیل ڈال کر اس نے اور روشن کر دیا ہو۔

اس قسم کی تشبیہ علامہ اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے ایمانِ کامل کے بارے میں استعمال

کی ہے جس سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے وہ فرماتے ہیں۔

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی

آگے چل کر امرء القیس کہتا ہے:۔

"آسمان اور بجلی کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابر دائیں سمت قطن تک چھایا ہوا ہے اور بائیں طرف ستار اور یذبل تک اس کی وسعت ہے۔ اتنے میں یہ ابر موضع کتیفہ کے اردگرد پانی برسانے لگا۔ بارش کے آغاز میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بزرگ آدمی دھاری دار کمبل لپیٹے بیٹھا ہو۔ اس کے بعد صحرائے غبیط میں بارش نے اپنا مال ومتاع پھینک دیا (جس سے پھل پھول نکل آئے) اور رنگا رنگ پھل پھول اور برگ وگیاہ سے یہ وادی ایسی معلوم ہوتی تھی) کہ ایک یمنی سوداگر بھاری بھاری گٹھریاں لاد کر آیا ہے اور اس نے نہایت خوبصورت پوشاکیں اس وادی میں پھیلا رکھی ہیں۔ وادی کے مکاء پرندے اس صبح ایسے مست اور بیخود تھے کہ گویا انھیں تیز شراب پلائی گئی ہے"۔

طرفہ اور لبید | امرء القیس کے بعد طرفہ بن العبد عرب کا جواں مرگ شاعر بھی "چھائی ہوئی گھٹا" کا بیحد دلدادہ تھا۔ اس نے نوجوانوں کی تین مسرت انگیز خصائل میں اس کو بھی شمار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب ببھکنۃ تحت الطراف المعمد

"یعنی خوشگوار ابر آلود دن کو ایک نازک اندام اور خوش اخلاق پری پیکر کی صحبت میں ایک وسیع خیمہ کے اندر گذار دیا جائے"۔

"سبعہ معلقہ" کے شاعروں میں سے "لبید بن ربیعہ العامری" مشہور شاعر تھے جنھیں مسلمان ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا وہ بھی "سبعہ معلقہ" کی مشہور نظم کے آغاز میں دیارِ محبوب کے آثار اور نشانات کے محو ہونے پر نوحہ کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

"ان مقامات اور آثارِ شکستہ کو موسم بہار کی خوشگوار عمدہ اور ہلکی بارش نے سیراب کیا تھا جس میں بجلی کی کڑک کی آمیزش تھی۔ ان مقامات پر صبح و شام اور شب متواتر بارشیں برستی رہی تھیں اور بڑے زور کی گرج بھی تھی۔"

اسلامی دور میں جب عربی شاعری نے ترقی کی تو عربی زبان میں اس وقت کے بلند اور نازک تخیلات سے ایک عجیب قسم کی لطافت، لچک اور سلاست پیدا ہوگئی اور چونکہ عربی زبان کو عراق، ایران، ترکستان، شام اور مصر میں بھی فروغ حاصل ہوگیا تھا اور عربی النسل نوجوان ایسے علاقوں میں آباد ہوگئے تھے جہاں قدرت کی فیاضی نے بہشت کا نمونہ پیش کر رکھا تھا اس وجہ سے خلافتِ بنی امیہ اور خلافت عباسیہ میں عربی زبان کی بزمیہ بہاریہ اور عاشقانہ شاعری کو بہت عروج حاصل ہوا اور اس دور کی شاعری میں ایران کی بہار آفریں شاعری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم آگئیں۔ لہذا ہم تمام تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے عربی زبان کی ان تین نظموں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو دورِ متوسط میں خاص موسم بہار پر لکھی گئی ہیں اور جس میں بہار کی سحر کاریوں کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کی بدذوقی کی وجہ سے ہم محض ان کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس سے اصل خوبی کا اندازہ پورے طریقے سے نہیں کیا جاسکتا۔

بدیع الزماں ہمدانی | عربی ادب کی مشہور کتاب "مقاماتِ بدیعی" کے مصنف بدیع الزماں ہمدانی نے جو عربی نثر و نظم دونوں میں ید طولیٰ رکھتا ہے موسمِ بہار کا نقشہ اپنی نظم میں اسی طرح کھینچا ہے۔

"موسم بہار پوری رونق کے ساتھ ہم پر نمودار ہوگیا ہے۔ دیکھو زمین اور آسمان کیسے دلکش دکھائی دیتے ہیں۔ موسم بہار کی آب و ہوا اور دلکشی سے خاک مشک عنبر بن گئی ہے۔ پانی صندل اور کافور کی طرح صاف اور خوشبودار ہے۔ اس موسم میں پرندے مطرب دلنواز کی مانند گیت گا رہے ہیں۔ موسم بہار کے چھینٹے جب گلاب کے پھول پر پڑتے ہیں تو وہ اپنی

خوشبو سے ہمارے دماغ کو معطر کر دیتا ہے۔ موسم نے کیا ہی اچھا ہمارے لئے سامانِ تفریح مہیا کر دیا ہے اور مناظر قدرت کے دلدادگان کے لئے یہ عجیب منظر ہے۔"

مقری الوحش | مشہور شاعر "مقری الوحش" اپنی بہاریہ نظم کی ابتدا اس طرح کرتا ہے۔

"آسمان میں ابر گریاں ہے اور وہ قطراتِ شبنم کے آنسو سے کام لے رہا ہے باغوں میں پھول مسکراتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے فرش پر زبرجد چمک رہا ہو، یہ خداوند تعالیٰ ہی کے کام ہیں جو اپنی صنعت کاری میں لاثانی اور یکتا ہے۔ باغیچوں میں گل لالہ اور گل آس اپنی بہار دکھلا رہے ہیں اور پرندے خدا کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں، پانی کبھی اچھل رہا ہے اور کبھی مسلسل بہتا ہے۔ بادِ نسیم چل رہی ہے جس کی وجہ سے درخت رقص کر رہے ہیں گلاب اور یاسمین کے پھول ابھی بند تھے کہ یکایک غنچے شگفتہ ہو گئے۔ گلِ نسرین تبسم کناں ہے اور اس نے چمن کو تازہ خوشبو سے مہکا دیا ہے۔ گل اقحوان اپنی تلوار اور ڈھال کے ساتھ شمشیر بے نیام کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ تشنہ لب نرگس، ہجراں نصیب غمگین عاشق کے مشابہ ہے جو گم کردہ راہ ہو۔ یہ چمنستان ایک جامع مسجد کی مانند ہے جس میں پھولوں کے تختے فرش کا کام دے رہے ہیں۔ اور ترنج کی قندیلیں اس میں آویزاں ہیں۔ پرندے اس چمن میں شاخوں کے منبروں پر خطبہ پڑھ رہے ہیں (چہچہا رہے ہیں) اور ہزار حمد و ثنا کے گیت گا رہے ہیں۔

ابوالحسن زنباع | فقیہ ابوالحسن زنباع موسم بہار کی رنگینیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

"موسم بہار نے شگفتگی اور تر و تازگی کا لباس پہن لیا ہے۔ ویرانی کے بعد اب زمین سرسبز ہو گئی اور خشک سالی کے بعد ہی سرزمین نعمتِ الٰہی کا مظہر بن گئی ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ زمین بڑھاپے کے بعد از سرِ نو جوان ہو گئی ہے اس کی حالت زار پہ

ترس کھا کر بادلوں نے اپنی آنکھوں سے گریہ وزاری شروع کردی تھی (برسنے لگے تھے) مگر مجھے ان پھولوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ گریۂ ابر سے کیسے شگفتہ ہوگئے ہیں اور اس کی ترشروئی (گرجنے اور کڑکنے کی آواز) سے وہ کیوں خوش ہیں۔ دراصل پھولوں کی شگفتگی اس طرح سے ہوئی کہ بادل ان کی بلند زمینوں پر برسے اور تمازت آفتاب نے انھیں پیدا کیا۔

کیا تم پھولوں کو نہیں دیکھتے ہو کہ ہر ایک پھول (کثرت کی وجہ سے) ایک دوسرے پر سوار ہے تاآنکہ وہ ایک دوسرے کی شاخیں معلوم ہوتی ہیں۔ پرندے ان کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے طرح طرح کے نغمے الاپ رہے ہیں۔ جب وہ چہچہاتے ہیں تو شاخیں جھومنے لگتی ہیں گویا کہ وہ ان نغموں سے مسرور ہو کر رقص کر رہی ہیں۔"

یہاں نظموں کا نمونہ ہے جو خاص طور پر موسم بہار پر تحریر کی گئی ہیں ورنہ بہار کا تذکرہ ان کی عشقیہ شاعری اور فارسی کے قصائد کی طرح عربی قصائد کی "تشبیب" میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کا اثر ان کے کلام پر اس قدر ہے کہ بہار کے لوازم پھول اور پھلوں کی تعریف اور ان کے بارے میں نادر اور لطیف تشبیہوں سے نازک خیال شعرائے عرب کا کلام بھرا پڑا ہے اور محبوبہ کے سراپا کی تعریف میں اس قسم کی نادر و پاکیزہ تشبیہیں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں کہ بے اختیار ان کی تخیل آرائی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس قسم کے اشعار کا نمونہ ہم شمالی افریقہ اور جزیرۂ سسلی کے مشہور شاعر اور نقاد ابن رشیق کے کلام سے پیش کریں گے۔

ابن رشیق اور بہار ابن رشیق نے شعر کی ماہیت اور تنقید شعر پر کتاب العمدہ کے نام سے عربی میں ایک زبردست کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ حقیقت شعر سے متعلق اس کے نتائج افکار کو اہل یورپ نے بھی تسلیم کیا ہے اور اس کے خیالات کی داد دی ہے مگر افسوس ہے کہ جزیرۂ صقلیہ کے

اس بے مثل شاعر کا کلام مکمل حالت میں موجود نہیں ہے تاہم جو مختصر مجموعہ اس کا دستیاب ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ باغ و بہار پھل اور پھولوں کی توصیف میں ابن رشیق نے اپنی لطیف قوتِ متخیلہ کی مدد سے نہایت نادر اور عمدہ تشبیہیں سپرد قلم کی ہیں جن کی مثالیں مغربی ادب میں بھی بہت کم ملتی ہیں۔ شاعر موصوف انار کے ایک گنجان باغ کی توصیف میں اس طرح رقمطراز ہے۔

"میں نے باغ میں کیا اچھے مناظر دیکھے (باغوں میں درخت اس قدر تھے) کہ درختوں کی شاخوں نے مشرق کے آفتاب کو چھپا رکھا تھا۔ انار کے پھلوں کے جوڑے ایسے نظر آتے تھے کہ گویا کہ وہ مضبوط طلائی قندیلیں ہیں"۔

ایک خوبصورت لڑکے کے ہاتھ میں سیب دیکھ کر شاعر موصوف یوں تخیل آرا ہے:-

"شامی سیب سرگیں چشم والے آہو (لڑکے) کے ہاتھ میں ہے اُس کے سیب کی سرخی شرم آلود رخسارے کی سرخی سے مشابہ ہے"۔

موسم بہار میں بنفشہ کی روئیدگی کو دیکھ کر شاعر پکار اٹھتا ہے۔

"بنفشہ ایسے وقت میں نمودار ہوا ہے کہ جب نہ موسم گرما ہے اور نہ سردی کی شدت ہے جب ہم اس کے قریب آئے تو وہ لاجوردی لباس پہنے ہوئے تھا"۔

گلِ لالہ کو ابن رشیق کی قوتِ متخیلہ اس طرح پیش کرتی ہے۔

"میں نے گلِ لالہ کی سرخی کو ملاحظہ کیا جس کے ارد گرد سیاہی کی آمیزش تھی یہ سرخ پھول اس سیاہی کی آمیزش کے ساتھ ایسا نظر آتا ہے جیسے کسی بچے کے ہونٹوں پر روشنائی لگ گئی ہو"۔

ابر کے برسنے اور اس میں بجلی کے چمکنے کی شاعرانہ توجیہ صرف ایک شعر میں اس طرح بیان کی ہے:

خلیلیّ ھل للمزن مقلۃ عاشق   ام النار فی احشاءھا وھی لا تدری

یعنی اے میرے دوستو! کیا بادل عاشق کی آنکھ ہے؟ (جو ہر وقت ابر کی طرح آنسو بہاتی ہے اور غم آلود ہے) یا اس کے اندر آگ ہے جس کی اُسے خبر نہیں (مگر وہ بجلی کی شکل میں اس کے اندر موجود ہے)"۔

شاعر موصوف نارنگی کے درختوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

"نارنگی کے درختوں کا روماں انگیز منظر دیکھ کر ہم مبہوت رہ گئے جبکہ ان کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور شاخوں پر نارنگیاں لٹکی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ زبرجد کے آسمان پر عقیق کے ستارے درخشندہ ہیں"۔

ابن المعتز کا انداز بیان | نارنگیوں کے رنگوں کی تشبیہ وتوجیہ کے سلسلے میں مشہور عباسی شہزادہ عبداللہ بن المعتز نے (جس کے شاعرانہ کارناموں کا تذکرہ ہم کسی گذشتہ اشاعت میں کر چکے ہیں) اس سے بہتر تخیل آرائی کی ہے۔ ابن المعتز کہتا ہے۔

کانما النارنج لما بدت　　صفر تہ فی حمرۃ کاللہیب

وجنۃ معشوق رای عاشقًا　　فاصفر ثم احمر خوف الرقیب

یعنی "نارنگی ایسے موقع پر جبکہ اس کی سرخی میں زردی شعلہ کی طرح نمودار ہوجاتی ہے اس محبوب کے رخسار کی مانند ہے جو عاشق کو دیکھ کر رقیب کے ڈر سے زرد ہوجاتا ہے اور اس کے بعد ہی رخسار سرخی مائل ہوجاتا ہے"۔

ایک ہی چیز میں زردی اور سرخی کی شاعرانہ توجیہ کو اس نوجوان شاعر نے نہایت بے مثل انداز میں بیان کیا ہے۔ نارنگی کے بارے میں اسی شاعر عباسی کی دوسری نادر تشبیہ ملاحظہ ہو۔

وکانما النارنج فی اغصانہ　　من خالص الذہب الذی لم یخلط

کرۃ رماہا الصولجان الی الہوا　　فتعلقت فی جوہ لم تسقط

یعنی "شاخوں پر نارنگیاں خالص سونے کی گیندیں معلوم ہوتی ہیں جنھیں گیند کے بلے نے اوپر
ہوا میں پھینک دیا ہو اور وہ وہیں خلا میں لٹک کر رہ گئی ہوں اور وہاں سے نہیں گرتیں"
کیا مغربی شاعروں کا آرٹ اس سے بہتر تخیل پیش کر سکتا ہے؟
ابنِ رشیق کی زبان سے خیام کا فلسفۂ مسرت بھی سن لیجئے جو موسم بہار میں ہر نوجوان کے دل میں موجزن ہوتا ہے۔

"اے دوست صبح سویرے ہی خوشیوں سے لطف اندوز ہو جاؤ اور مسرت انگیز گھوڑے پر سوار
ہو کر جلد پہنچو اس سے پیشتر کہ چاشت کا آفتاب صبح برسنے والے بادلوں کو جذب کر لے"

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابنِ رشیق کے رفیق باصفا ابن شرف قیروانی کے دو شعر پیش کر دیں جو اس نے بانسری کی تعریف میں لکھے ہیں۔ ابن شرف کہتا ہے۔

"خدا اس زمین کو سیراب کرے جہاں تیرے چوب کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے شاخیں اور
درخت بھی پاکیزہ ہو گئے ہیں، جب اس بانسری کی چوب سرسبز تھی تو اس وقت اس پر بیٹھ کر
طیورِ خوش نوا گیت گاتے تھے مگر جب یہ چوب خشک بن گئی تو اس پر حسینانِ نازک اندام
ترنم ریز ہیں"

عربی نثر میں بہاریہ مضامین | عربی شعرا اور ادیب مغربی اور فارسی شعرا سے کم مناظرِ قدرت کے دلدادہ نہ تھے وہ موسم بہار میں محوِ گلگشت چمن رہتے تھے اور کھلی فضا میں ان قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونا ان کا خاص شیوہ تھا ایسے موقع پر ان کے شاعرانہ تخیل کو جو چیز اپنی طرف مائل کر لیتی تھی اس پر بے ساختہ ان کی زبان سے اشعار موزوں ہو جاتے تھے اور مختلف شعرا و ادبا موازنہ اور محاکمہ کے طور پر ایسے موضوع پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس قسم کا ایک واقعہ شاعر مذکور ابنِ رشیق کے بارے میں کتب ادب میں مذکور ہے کہ شاعر موصوف اپنے ہمعصر شاعروں کے ساتھ شہر سے باہر

کھلی فضا میں محو گلگشت چمن رہا اور ابر آلودوں میں گلِ لالہ کے باغ میں نازک اور لطیف اشعار سے مختلف شعرا طبع آزمائی کرتے رہے۔ ہم اس بزم سخن کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ اور موسم بہار میں شاعروں کی سیر و تفریح کا حال مشہور عربی نثر نگار ابوالقاسم الحریری نے اپنی مشہور کتاب "مقامات حریری" کے چوبیسویں مقالہ "قطیعیہ" میں نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے صاحب موصوف فرضی راوی حارث بن ہمام کی زبانی رقمطراز ہیں۔

"موسم بہار میں مجھے بغداد کے مشہور و معروف محلہ "قطیعۃ الربیع" میں چند ایسے نوجوانوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جن کے چہرے موسم بہار سے زیادہ شاداب اور خنداں تھے ان کے اخلاق گلہائے بہار سے زیادہ شگفتہ تھے اور ان کی گفتگو بہار کی نسیم سحری سے زیادہ شیریں تھی چنانچہ میں نے ان کے فیضِ صحبت سے وہ لطف اٹھایا جس نے رنگین اور حسن افروز بہار کو بھی مات کر دیا اور چنگ و رباب کے نغموں سے زیادہ ہمیں محظوظ کیا۔ ہم نے پیمانِ رفاقت کو اس قدر مستحکم کر رکھا تھا کہ ہر ایک کو اس بات سے منع کر رکھا تھا کہ وہ تن تنہا کسی چیز سے لطف اندوز ہو خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ ایک دن جبکہ گھٹا چھاری تھی اور دن نہایت ہی خوشگوار تھا (فضا ایسی مست کر دینے والی تھی) کہ بہار کی گھٹائیں شراب صبوحی پی لینے پر مجبور کرتی تھی، ہم نے کسی سبزہ زار کی طرف گلگشت کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ہم پُر فضا چمنوں کو "جنت نگاہ" بنائیں اور اپنے دل و دماغ کو ابر و باراں کے نظاروں سے تر و تازہ کریں۔ لہٰذا ہم سب احباب نے جو سال کے بارہ ماہ کی تعداد پر مشتمل تھے اور شاہ حیرہ جذیمہ الابرش کے ہمنشینوں کی طرح مودت و اخلاص میں کامل " ... ایک ایسے چمنستان کی طرف رخ کیا جو اپنی خوبی میں لاجواب تھا اور گلہائے رنگ رنگ سے مزین تھا (اس سیر میں) شراب ارغوانی

بھی ہمارے ساتھ تھی۔ حسین ساقی اور ایسے مطرب دلنواز بھی ہمراہ تھے جن کے نغمے

"فردوسِ گوش" کا حکم رکھتے تھے"

عربی نثر کا یہ نمونہ "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر پیش کیا گیا ہے ورنہ اگر ان بہاریہ مناظروں اور مضامین کا ترجمہ کیا جائے جو عربی ادب کی کتابوں میں موجود ہیں اور جن پر عربی ادیبوں نے اپنی تمام فصاحت و بلاغت صرف کی ہے تو اس کے لئے یقیناً ایک طویل دفتر درکار ہوگا لہذا وقت کی کمی اور طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ہم نے دیدہ و دانستہ قدیم عربی ادب سے مثالیں پیش کی ہیں کیونکہ جدید عربی ادب تو مغربی ادب کی پیروی میں ہر قسم کے بہاریہ مضامین اور قدرتی مناظر کشی سے مالا مال ہے صرف قدیم عربی پر ناواقفیت کی بنا پر مغربی اور مشرقی نقادوں کی طرف سے بار بار یہ اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ وہ بہاریہ مضامین اور مناظر قدرت کی صحیح عکاسی سے خالی ہے اس لئے ہماری یہ ابتدائی کوشش صرف اس لئے ہے کہ ہم ان اعتراضات کو رفع کریں۔ امید ہے کہ ہماری یہ خامہ فرسائی دیگر اہلِ قلم کو اس طرف متوجہ کریگی کہ وہ زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

ادبیات

عرضِ شوق

جناب عامر عثمانی

شرریادِ سحر چمن میں نہ جانے کیا چال چل رہی ہے
ٹپک پڑے ہیں گلوں کے آنسو کلی کلی آنکھ مل رہی ہے

یہی خموشی جو آج آغوشِ یاس و حرماں میں پل رہی ہے
کسی کی جرأت نوازیوں سے کبھی سراپا غزل رہی ہے

غرور کہتا ہے دور رہیے، مگر تمنا مچل رہی ہے
نہ صرف میں مضطرب ہوں تنہا اُدھر بھی آپس میں چل رہی ہے

رہِ محبت میں ہر قدم پر حیات کروٹ بدل رہی ہے
بھڑک رہے ہیں جنوں کے شعلے، خرد کی زنجیر گل رہی ہے

یہی محبت جو نور بن کر دلوں کے سانچے میں ڈھل رہی ہے
ظہورِ بزمِ جہاں سے پہلے شریکِ حسنِ ازل رہی ہے

کبھی توجہ کبھی تغافل، کبھی تقاضا کبھی تساہل
ہے سب کا در پردہ ایک حاصل مگر سیاست بدل رہی ہے

بلا سے مٹ جائے نوجوانی ہے گرمیٔ عشق غیر فانی
اسی قدر بڑھ رہی ہے تابش یہ دوپہر جتنی ڈھل رہی ہے

جنابِ زاہد کی سلطنت میں بجا کہ میخانے ٹوٹ جائیں
مگر اُسے کیا کرینگے حضرت جو آنکھوں آنکھوں میں چل رہی ہے

وہ اولیں دیدِ بے ارادہ وہ ان کی پہلی نگاہِ سادہ
وہی تو ارمان و آرزو کی حیات کا ماحصل رہی ہے

تمام تر عمرِ نامرادی کٹی ہے ان خود فریبیوں میں
کہ آج ہے درد کی جو شدت نہ کل رہیگی نہ کل رہی ہے

شراب سادہ کے پینے والو شرابِ کوثر کا فرق سمجھو
یہ جام و ساغر میں ڈھل رہی ہے وہ انکھڑیوں سے اُبل رہی ہے

ہجومِ اشکِ رواں سے پہلے جو آگ روشن تھی صرف دل میں
یہ اور اشکوں نے قہر ڈھایا وہ آگ آنکھوں میں جل رہی ہے

ہزار پروانے جان دیدیں ہزار فانوس ٹوٹ جائیں
مگر ہمیں تو یہ غم ہے عامر کہ شمع خود بھی پگھل رہی ہے

تبصرے

نظامِ نو | از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔اے تقطیع خورد ضخامت ۹۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:۔ مکتبہ نشأۃ ثانیہ حیدر آباد دکن۔

لائق مصنف کا ایک مقالہ "نیا نظمِ عالم" کے نام سے رسالہ جامعہ میں ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا اب اسی کو جدید اضافوں اور نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے پہلے مغربی تمدن کا تجزیہ کرکے اس کے عناصر ترکیبی پر ناقدانہ گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اس تمدن کا خمیر ہی ایسے زہریلے اجزا و عناصر سے تیار ہوا ہے جو کبھی دنیا میں امن واماں اور عافیت و سکون کو قائم نہیں رہنے دے سکتے۔ اس کے بعد عہدِ حاضر کی مختلف تحریکات قومیت، مذہب انسانیت اشتراکیت اور بین الاقوامی وفاق پر ناقدانہ نظر ڈال کر ان کی اصل حقیقت کو عریاں کرکے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ ان تحریکات کا مقصد مغربی تمدن کی ہلاکت آفرینیوں کا سدباب تھا لیکن یہ بھی اپنے مقصد میں ناکامیاب رہی ہیں اور انسانی زندگی کے کرب و اضطراب کو دور کرنے کی بجائے خود اس میں اضافہ و ترقی کا باعث بنی ہیں۔ اس بحث سے فارغ ہو کر مصنف نے اصل موضوعِ سخن کو چھیڑا ہے اور اس سلسلہ میں یہ بتانے کے بعد کہ ایک عالمگیر نظامِ نو کی بنیاد کن چیزوں پر قائم ہوئی اور اس کے خصوصیات و امتیازات کیا ہونے چاہئیں۔ مدلل اور موثر پیرایۂ بیان میں یہ بتایا ہے کہ در اصل اسلام ہی ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں کی کامیابی و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے پُرزور اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس نظام کو عالم کا ہمہ گیر نظام بنانے کے لئے ان تھک عملی جدوجہد کریں۔ ورایک نہایت وسیع معنیٰ میں اس کی

تبلیغ کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے اور اس میں گفتگو بھی صرف اصولی حیثیت سے کی گئی ہے تاہم اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس کا مطالعہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے فائدہ کا موجب ہوگا۔

مقاصد قرآن | از مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری۔ تقطیع خورد ضخامت ۸۶ صفحات قیمت ۲ار پتہ:۔ مکتبۂ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

مصنف نے چند مضامین اسی عنوان سے ماہنامہ ترجمان القرآن میں جبکہ وہ حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ لکھے تھے۔ اب انھیں مضامین کو کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے اس میں لائق مصنف نے قرآن مجید کی دو آیتوں کو بنیاد بنا کر اس پر گفتگو کی ہے کہ قرآن مجید کا اصل مقصد دوسری الہامی کتابوں اور انبیائے کرام کی تعلیمات کی طرح صرف تین چیزیں ہیں۔ ایمان باللہ۔ ایمان بیوم الآخرت۔ اور اعمال صالحہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر مفصل گفتگو کی ہے جس کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ توحید، دوسرے مذاہب میں خدا کا تصور، عبادات و معاملات، یوم آخرت پر ایمان کی حقیقت ان تمام مسائل و امور پر کلام ہوگیا ہے۔ مصنف کا اندازِ بیان اگرچہ اقناعی ہے استدلالی اور منطقی نہیں تاہم عام مسلمانوں کو اس کے مطالعہ سے فائدہ ہوگا۔

سدرۃ المنتہیٰ | از مولانا سیماب اکبرآبادی تقطیع کلاں ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد للعہ پتہ:۔ مکتبۂ قصر الادب آگرہ

مولانا سیماب اکبرآبادی ہمارے ملک کے اُن چند اکابر شعر و ادب میں سے ہیں جو ادبی جدت طرازیوں کے اس دور میں عہدِ قدیم کے اساتذۂ فن کی یادگار سمجھے جاتے ہیں۔ موصوف صرف شاعر و ناظم نہیں بلکہ فنِ شعر و ادب کے تمام گوشوں پر ماہرانہ نگاہ رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کے ہاں حسنِ تخیل۔ بلندی فکر، نکتہ سنجی، اور حقیقت شناسی کے ساتھ صحت زبان و بیان اور قواعد و ضوابط

فن کی پابندی کا پورا اہتمام پایا جاتا ہے۔ قدرتِ کلام کا یہ عالم ہے کہ شاعری کی ہر صنف پر یکساں قوت و روانی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ موضوعاتِ فکر میں اس درجہ توسع ہے کہ مضامینِ حسن و عشق سے لیکر قومی و اخلاقی اور سیاسی و معاشی افکار تک سب ہی موضوعِ فکر بن چکے ہیں۔ اس طرح آپ اسلوبِ بیان اصولِ شاعری اور طریقِ فکر کے اعتبار سے بالکل طرزِ قدیم کے حامل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی جدید رجحانات و افکار کی ترجمانی میں جدید اسکول کے کسی بڑے سے بڑے شاعر سے بھی پیچھے نہیں۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ موصوف کی شاعری کا مقصد وقتی اور ہنگامی طور پر محض حظِ نفس اور تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچانا نہیں بلکہ زندگی کی گوناگوں دشواریوں اور الجھنوں کو حل کرنے کے لئے ایک پیغام دینا ہوتا ہے جس کی بنیاد حکمت و اخلاق پر قائم ہوتی ہے۔ اسی بنا پر آپ نے نہ صرف خود اس کا التزام کیا ہے بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں اس کی کافی تبلیغ بھی کی ہے کہ اردو شاعری کا دامن رندانہ مضامین سے یکسر پاک و صاف ہو جائے۔ اس میں آپ نے اس درجہ غلو کیا ہے کہ "ساقی، ساغر و شراب، اور پیمانۂ و سبو" ایسے الفاظ کو ہی مملکت شاعری سے خارج قرار دیدیا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

لیکن مولانا نے "بادۂ و ساغر" کے بغیر ہی "مشاہدۂ حق" پر اس سیر حاصلی سے گفتگو کی کہ جو کام ناخدائے سخن غالب سے بھی نہ بن پڑا تھا وہ آپ نے کر دکھایا۔ زیر تبصرہ کتاب آپ کا دوسرا دیوان ہے جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک یعنی چھ سال کی غزلوں پر مشتمل ہے اور صاحبِ دیوان کی تمام خصوصیات شاعری کا بدرجۂ اتم حامل ہے۔ امید ہے اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے اور اس کے مطالعہ سے دل و دماغ کی ضیافت کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

خلافتِ راشدہ: تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جدید اڈیشن
قیمت ۸؎ مجلد ۱۲؎ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ
سنہ ۱۹۴۳ء: مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول
لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ۸؎ مجلد للعہ
سرمایہ:- کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ
ورفتہ ترجمہ، جدید اڈیشن۔ قیمت عہ۱۲
اسلام کا نظامِ حکومت۔ اسلام کے ضابطہ حکومت
کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث ۶؎ مجلد عہ
خلافتِ بنی امیہ: تاریخِ ملت کا تیسرا حصہ ۸؎
مجلد ۱۲؎ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ۔
سنہ ۱۹۴۴ء:- ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت
جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب للعہ مجلد صہ
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت
جلد ثانی للعہ مجلد صہ
قصص القرآن حصہ سوم۔ انبیاء علیہم السلام
کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی۔ للعہ مجلد صہ
مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی ۸؎ مجلد للعہ

سنہ ۱۹۴۵ء: قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف
پر جدید اور محققانہ کتاب عہ مجلد سے
قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان صہ مجلد ۸؎
انقلابِ روس۔ سے
سنہ ۱۹۴۶ء: ترجمان السنہ:- ارشاداتِ نبوی کا جامع
اور مستند ذخیرہ جلد اول عہ مجلد ۱۲؎
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم
للعہ مجلد صہ
مسلمانوں کا نظمِ مملکت للعہ مجلد صہ
تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابنِ بطوطہ
قسم اعلیٰ ۳؎ قسم دوم دو روپے آٹھ آنے۔
مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر
نتیجہ خیز اور دلچسپ کتاب۔ دو روپے۔
مفصل فہرستِ کتب دفتر سے طلب فرمائیے
اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل
بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered. No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسنِ خاص - جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین - جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین - جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا - نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے، وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کیلئے ۱۰ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا۔

جلد نوزدہم　　　　شمارہ (۱)

جولائی سنہ ۱۹۴۷ء مطابق شعبان سنہ ۱۳۶۶ھ

فہرست مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد	۲
۲۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلی	پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ ایم۔ اے	۵
۳۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے لکھے ہوئے قرآن کریم	جناب ڈاکٹر محمد عبد اللہ صاحب چغتائی ڈی لٹ (پیرس)	۳۷
۴۔ انڈونیشیا میں سیاسی کشمکش	جناب مظفر شاہ خاں صاحب ایم۔ اے	۴۳
۵۔ اقبال اور فسطائیت	محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ	۵۵
۶۔ تبصرے	م۔ ح	۶۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

آخر وائسرائے کے اعلان مورخہ ۳ رجون کے مطابق ہندوستان تقسیم در تقسیم ہو کر دو مختلف مستعمراتی حکومتوں کی شکل میں بٹ گیا۔ یہ ہندوستان کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً برا ہوا یا اچھا! اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ البتہ جہاں تک ان اسباب کا تعلق ہے جن کے باعث یہ صورتِ حال پیش آئی ہے، اُن کے پیش نظر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں حکومتوں کو خوشحالی اور امن وعافیت کے ساتھ ترقی کرنا ہے تو انھیں اُن اسباب کا خاطر خواہ تدارک کرنا ہوگا اور اس کی کوشش کرنی ہوگی کہ اب دوبارہ ان چیزوں کا اعادہ نہ ہونے پائے جنھوں نے ہمارے ماضی قریب کے زمانہ کو تلخ کامیوں، ناگواریوں اور صبر آزما مصائب وآلام کا افسوسناک مرقع بنا کر رکھدیا ہے۔

اگر زندگی کی بنیاد فضائل اخلاق، شرافتِ نفس، باہمی رواداری اور عدل وانصاف پر قائم ہو اور خود غرضی، اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا جذبہ اور ظلم وعدوان سے دامن پاک ہو تو دو شخص مل جل کر رہیں یا الگ الگ، بہرحال کسی صورت میں بھی امن کو نقصان نہیں پہنچ سکتا ہندو اور مسلمانوں میں چولی دامن کا جو رشتہ قدرتی طور پر صدیوں کی سعی رفوگری کے بعد پیدا ہو چکا ہے وہ ہندوستان میں دو یونین بن جانے کے بعد بھی نہیں مٹا اور نہ مٹ سکتا ہے۔ مختلف صوبوں میں ان دونوں قوموں کی جو پوزیشن پہلے تھی اب بھی ہے۔ ایک یونین میں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں اور دوسری یونین میں مسلمانوں کو غالب اکثریت

حاصل ہے اور ہندو اقلیت میں ہیں۔ جس طرح ایک یونین میں اقلیت اکثریت کے ساتھ شریکِ حکومت ہوگی دوسری یونین میں بھی یہی ہوگا۔

موجودہ زمانہ میں کسی ایک قوم کے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ کسی اقلیت پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرے اور اس کے جائز شہری حقوق کا کوئی خیال نہ رکھے یہ سب باتیں دورِ جاگیرداری (Age of feudalism.) کی یادگار ہیں جو فنا ہوتی جارہی ہے اور دنیا کے نظامِ نو میں اب اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جرمنی، اٹلی، جاپان اور سب سے آخر میں برطانوی شہنشاہیت۔ ان سب کا عبرت انگیز انجام سب کے سامنے ہے۔ ان سے سبق لینا چاہئے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد تمام معاملات سلجھ جائیں گے اور ملک پر بدقسمتی و تیرہ نصیبی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں وہ چھٹ جائیں گے تو سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک زندگی کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیدا نہیں ہوتا جس کا دونوں جگہ فقدان ہے ہماری مشکلات رفع نہیں ہوسکتیں۔ اس وقت جو کچھ ہوا ہے اسے انقلاب کا صرف ایک رخ سمجھنا چاہئے۔ عوام روز بروز بیدار ہوتے جارہے ہیں۔ ان میں اپنی مشکلات اور اپنے حقوق کا احساس روز افزوں ترقی پر ہے۔ دوسری جانب اقتدار و اختیار، جن ہاتھوں میں آہستہ آہستہ منتقل ہورہا ہے ان کا حال یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ان کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا، اور قومی عصبیت نے ان کو حقائق کی طرف سے اندھا بنا دیا ہے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ ایک شدید تصادم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس وقت تک کی کشمکش و نزاع کا سبب مذہب کا اختلاف اور قومیت کا فرق و امتیاز تھا۔ لیکن موجودہ صورتِ حال کی تہ میں شدید ترین انقلاب کی جو موجیں کروٹیں بدل رہی ہیں وہ اس بات کا کھلا اعلان ہیں کہ ملک میں دو مستقل حکومتوں کے قائم ہونے کے فوراً بعد اقتصادی اور معاشی بنیاد پر نئی نئی پارٹیاں ابھریں گی اور ان کے

اثر و نفوذ کے باعث ہندوستان اور پاکستان ایک شدید ترین طبقاتی جنگ میں مبتلا ہو جائیں گے اس بنا پر شیوۂ دانشمندی یہ ہے کہ دونوں حکومتیں مستقبل قریب میں پیش آنے والے واقعات کا ابھی سے جائزہ لیکر ان کی روک تھام کی کوشش کریں اور اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے تعلقات میں حقیقی طور پر خوشگواری پیدا کی جائے۔ اور مذہب کے نام پر ہرگز کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے اشتعال پیدا ہو اور نوبت خون خرابہ تک پہنچے۔ پھر ملک کو اقتصادی طور پر خوشحال بنانے کی ہر ممکن سعی کرنی چاہئے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ ملک کے سرمایہ کو کسی خاص ایک طبقہ کے اندر محدود کرنے کے بجائے اس کو تمام افراد پر تقسیم کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ پلان کو دونوں پارٹیوں کا قبول کر لینا دونوں کی کھلی شکست اور صرف انگریزی سیاست کی جیت ہے۔ اس واضح اور الم نشرح حقیقت کے باوجود لیگ کا اس پر خوشی کے شادیانے بجانا اور دوسری جانب سردار پٹیل اور پنڈت نہرو جیسے ذمہ دار ہندوؤں کا اس اسکیم کی مدح میں رطب اللسان ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ارباب سیاست حقائق پذیری سے کتنے دور ہیں۔

جہاں جذبہ یہ ہو کہ میں نے کیا پایا اور دوسرے کو کیا ملا۔ اور جہاں آپس کے معاملات کو طے کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کو پنچ بنا کر اس کے فیصلہ کو بخوشی قبول کر لیا جاتا ہو جو دونوں کا جانا پہچانا دشمن ہو اور جس کی شاطرانہ چالیں کسی دلیل و گواہ کی محتاج نہ ہوں اور جو ہاتھ پاؤں کٹ جانے کے بعد بھی اپنے سر کو صاف بچا لیجانے کے فن میں طاق ہو وہاں عوام کی فلاح و بہبود کی توقع کیوں کر اور کس حد تک ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب صرف مستقبل دیگا۔

فانتظر وا انی معکم من المنتظرین۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی

علماء و مشائخ کا اجتماع

(۲)

از جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ ایم۔ اے

میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب | میاں نصیر الدین عرف میاں کالے صاحبؒ مولانا قطب شاہؒ کے بیٹے اور شاہ فخر الدین صاحبؒ کے پوتے تھے۔ دلی میں عوام و خواص سب اُن کا ادب و احترام کرتے تھے۔ امیر و غریب سب کو اُن سے عقیدت و ارادت تھی۔ سرسید نے لکھا ہے۔

اس زمانہ میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے۔ حضور والا اور تمام سلاطین و جمیع امراء عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں۔[1]

ان کا اخلاق نہایت اعلیٰ اور وسیع تھا۔ اس لئے وہ بے حد مقبول بھی تھے۔ دلی کے چھوٹے بڑے سب اُن سے ملتے تھے اور ان کے خلوص و محبت کے گرویدہ تھے غالب کو ان سے خاص لگاؤ اور انس تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں۔ بلی ماروں کے محلہ میں ایک حویلی کرایہ کو لیکر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا بلکہ

---

[1] شجرۃ الانوار (قلمی نسخہ) آخری صفحہ

کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ [۱۵]

بہادر شاہ ظفر کو کالے صاحب سے خاص عقیدت تھی۔ اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ شاہ صاحب خود بھی بادشاہ کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ بمبئی کے احسن الاخبار اور دلی کے سراج الاخبار[۵۲] کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپس میں کس قدر گہرے تعلقات تھے۔ یکم فروری ۱۸۴۵ء کی خبر ہے۔

"اہل دربار رخصت ہوئے تو زبدۃ الواصلین قدوۃ السالکین حضرت شاہ غلام نصیر الدین، (عرف میاں کالے صاحب) ملاقات کے لئے تشریف لے آئے معرفت وحقائق کے دفتر کھلے۔"[۵۳]

جب شاہی خاندان میں کسی کو تعویذ وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو کالے صاحب سے رجوع کیا جاتا۔ ۳۱ جولائی ۱۸۴۶ء کی اطلاع ہے۔

"نواب تاج محل بیگم صاحبہ کو آثارِ حمل ظاہر ہوئے اس لئے میاں کالے صاحب پیرزادہ حفاظتِ حمل کا تعویذ دینے کی غرض سے قلعہ معلی میں تشریف لے گئے۔"[۵۴]

بہادر شاہ پر کالے صاحب کا اتنا اثر تھا کہ اُن کی سفارش سے جو فقیر بارگاہ سلطانی میں باریاب ہوتے تھے اُن پر خاص خسروانہ التفات واکرام کا اظہار ہوتا تھا، ۷ جولائی ۱۸۴۶ء کی خبر مظہر ہے۔

"جو درویش حضرت میاں کالے صاحب کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہنچا . . .

---

[۵۱] اردوئے معلی۔ حصہ دوم ص ۱۷

[۵۲] ان دونوں اخبارات کے ترجمے خواجہ حسن نظامی صاحب نے "بہادر شاہ کا روزنامچہ" کے عنوان سے شائع کئے ہیں۔ یہ روزنامچہ بہت اہم تاریخی معلومات سے بھرا ہوا ہے جس سے اس زمانہ کے سیاسی اور سماجی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

[۵۳] "بہادر شاہ کا روزنامچہ"۔ مرتبہ خواجہ حسن نظامی (مطبوعہ دہلی) ص ۵۔ [۵۴] ایضاً ص ۶،

حضرت بادشاہ سلامت نے اُسے دو اشرفیاں عنایت کی اور بہایت عزت و احترام

سے رخصت کیا۔" [1]

شاہی خاندان کی بیگمات اور دیگر افراد بھی شاہ صاحب کی سفارش کے ذریعہ اپنے وظیفہ

میں اضافہ کرواتے تھے۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۴۶ء کی خبر ہے۔

" حضرت شاہ نصیر الدین عرف کالے میاں صاحب کے صحیفہ کے جواب میں

بادشاہ سلامت خلد اللہ ملکہ نے تحریر فرمایا کہ عدم گنجائش کی وجہ سے نواب مستغنی بیگم

کا کوئی جدید وظیفہ جاری نہ ہو سکا۔" [2]

بہادر شاہ کے روزنامچہ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کالے صاحب ہ کا

بادشاہ کی جانب سے کچھ وظیفہ مقرر تھا۔ یہ چیز خواجگان چشت کے مسلک کے منافی تھی۔ اس

سلسلہ کے بزرگوں نے انتہائی عسرت اور تنگی کے باوجود بھی کسی بادشاہ یا امیر سے کوئی وظیفہ یا

جاگیر قبول نہیں فرمائی۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۴۶ء کی خبر ہے۔

" موضع شمع پور باولی کی آمدنی میں سے مبلغ پانچسو روپیہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین

صاحب عرف کالے صاحب کو مرحمت فرمائے اور ارشاد کیا کہ اس آمدنی میں سے ہمیشہ

پانچ سو روپیہ انشاء اللہ قبل از طلب حاضر خدمت ہو جایا کریں گے۔ عرض کیا گیا کہ

حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ایک ہزار پانچ سو روپیہ من جملہ چار ہزار روپیہ سالانہ

کے بھیجے گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ روپیہ واپس کر کے فرمایا کہ تمام روپیہ

یکمشت آنا چاہیے۔ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہ آنا چاہیے۔" [3]

پھر ایک دوسری اطلاع ہے۔

---

[1] بہادر شاہ کا روزنامچہ۔ ص ۷۹۔ [2] ایضاً ص ۸۶۔ [3] ایضاً ص ۹۲۔

"حکیم احسن خاں بہادر سے ارشاد ہوا کہ پیرزادہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کو نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی معرفت چار ہزار روپیہ بھیج دیا جائے" [1]

بادشاہ، تقاریب وغیرہ کے موقعوں پر کالے صاحب کو خرچ دیتے تھے۔ ۲۰ راپریل ۱۸۴۷ء کی اطلاع ہے۔

"کارپردازاں خلافت کو حکم دیا گیا کہ حضرت میاں کالے صاحب نبیرہ حضرت مولانا فخرالدینؒ کی صاحبزادی کی شادی ہے۔ دس ہزار روپے اُن کے خرچ کے لئے عطا کئے جائیں" [2]

دو مہینے ابھی نہیں گزرنے پائے کہ پھر ایک شادی میں روپے بھیجے جاتے ہیں۔ ۴ رجون ۱۸۴۷ء کی اطلاع ہے

"محبوب علی خاں خواجہ سرا سے فرمایا کہ ہمیں فی الحال میاں کالے صاحب کے صاحبزادے کی شادی کے لئے چار ہزار روپے کی . . . ضرورت ہے" [3]

حضرت کالے صاحب کا بادشاہ سے یہ میل جول، چشتیہ سلسلہ کی روایات کے بالکل برعکس تھا۔ بزرگانِ چشت نے کبھی اس قسم کے تعلقات اور جاگیرداری کو روا نہیں رکھا۔ اُن کا یقین تھا کہ اس طرح سے نہ صرف تملق اور درباداری کی عادتیں پرورش پاتی ہیں بلکہ روحانی ترقی میں سخت رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے۔

"در بعض ملفوظات خواجگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد نام او از دیوان حق سبحانہ بری آرند" [4]

---

[1] روزنامچہ ص ۱۰۷ [2] ایضاً ص ۱۳۴ [3] ایضاً ص ۱۵۲۔

[4] انفاس العارفین۔ شاہ ولی اللہؒ۔ (مطبوعہ دلی) ص ۶۹۔

خواجہ نصیر | خواجہ نصیرؒ (۱۲۶۱-۱۱۸۹) خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔ خواجہ درد (۱۱۹۰-۱۱۳۱) بڑے زبردست صوفی اور شاعر تھے۔ انھوں نے "اسرار الصلوٰۃ" "واردات درد" "علم الکتاب"[1] وغیرہ کتابیں لکھی تھیں۔ خواجہ نصیرؒ کے متعلق سرسید نے لکھا ہے کہ بچپن ہی میں خواجہ درد سے بیعت کی تھی۔ اور جب سن دس سال کا ہوا تو خواجہ درد نے وفات پائی۔ سنین کے اعتبار سے یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ خواجہ نصیر کا سنہ پیدائش ۱۱۸۹ھ ہے اور خواجہ درد نے ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

خواجہ نصیرؒ ریاضیات اور موسیقی کے ماہر تھے حساب میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا[2]۔

خواجہ نصیرؒ نے باطنی کمالات خواجہ دردؒ کے چھوٹے بھائی میر اثرؒ سے حاصل کئے تھے میر اثر بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ تذکرہ میر حسن میں اُن کے متعلق لکھا ہے۔

"درویشے است موقر صاحب سخنے است موثر عالم و فاضل مرتبہ قدرش بغایت بلند و گوہر صدرش نہایت ارجمند در خدمت برادر بزرگوار خود گوشہ نشینی اختیار کردہ و قدم برجادۂ بزرگان خود نہادہ بسر می برد"

ایسے بزرگ کے فیضِ صحبت سے خواجہ نصیر نے فائدہ اٹھایا تھا، ان کے وصال کے بعد وہ خود ہی اُن کے سجادہ پر متمکن ہوئے۔

خواجہ درد کا سلسلہ بالکل نیا تھا، اُن کے والد خواجہ میر محمد ناصر عندلیب (المتوفی ۱۱۷۲ھ) خواجہ بہاء الدین نقشبند کے سلسلہ سے تھے۔ ابتدائی زمانہ میں مغل فوج میں ملازم تھے۔ یکایک انھوں نے فوج کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ اور ایک نیا سلسلہ "طریقہ محمدی" جاری کیا تھا۔ اپنے خیالات کی تشریح میں "نالۂ عندلیب" کتاب لکھی اور اس

---

[1] "گلِ رعنا" میں سید عبدالحی صاحب (ص ۱۷۲) لکھتے ہیں "اگر ان کے فضل و کمال کا صحیح اندازہ کرنا چا ہو تو علم الکتاب کا مطالعہ کرو" [2] [3] آثار الصنادید ص ۳۵ و ۳۶

سلسلہ میں سب سے پہلے اپنے بیٹے میر درد کو داخل کیا۔ [۱]

خواجہ نصیرؒ نے سجادہ پر بیٹھ کر اس سلسلہ کو بڑی رونق بخشی۔ ان میں انتہائی استغنا اور دنیا سے بے تعلقی کا جذبہ تھا۔ قدرت کی طرف سے نہایت صابر و شاکر طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ طبیعت میں سوز و گداز بہت تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے رنج تخلص فرماتے تھے سرسید نے اُن کے چند اشعار منتخب کئے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں

؎ خط دیکھ کر اِدھر تو میرا دم اولٹ گیا
قاصد اودھر بدیدۂ پرنم اُلٹ گیا

؎ کھڑکی نکال جانب دشمن نہ بام پر
کوٹھے چڑھی جو بات کھلی خاص و عام پر

مولانا یوسف علی صاحبؒ | مولوی یوسف علی صاحب، خواجہ نصیرؒ کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے ان کا اخلاق نہایت وسیع تھا۔ ان کی صحبت میں ایسی دل کشی تھی کہ سینکڑوں آدمی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان کے زمانہ میں خواجہ درد کے سلسلہ کو بہت فروغ ہوا۔

شاہ غیاث الدین صاحبؒ | شاہ غیاث الدین صاحب چشتیہ سلسلہ کے بزرگ تھے اور خواجہ کہاری کہہ کر مشہور تھے [۲] خواجہ مودود چشتی سے آپ کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ آپ اخلاق محمدی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ دن رات عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کے رشد و ہدایت سے سینکڑوں نے استفادہ کیا۔ سرسید نے لکھا ہے "مریدانِ باخلاص کو آپ کی ذات بابرکات ارشاد راہِ ہدایت اور رہبری سبیلِ سعادت ایسا ہوا کہ کم کسی سے متصور ہے" [۳]

---

[۱] "مجدد الف ثانی" کا نظریہ توحید" از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ۳۳ - ۳۲ - (انگریزی)

[۲] آثار الصنادید ص ۳۸ - [۳] ایضاً ص ۳۸ -

۱۲۲۴ھ میں وصال فرمایا۔ مزار آپ کا ملتانی ڈھانڈہ میں ہے جو بستی قدم شریف اور پہاڑ گنج کے درمیان واقع ہے۔ [1]

شاہ صابر بخش صاحبؒ | شاہ صابر بخش صاحبؒ چشتیہ صابریہ سلسلہ کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے اُن کے والد شاہ نصیر الدین صاحب اپنے والد شاہ غلام سادات صاحب چشتی کی حیات میں وصال فرما گئے تھے اس لئے شاہ غلام سادات کے بعد آپ ہی سجادہ نشین ہوئے۔

شاہ سادات صاحب چشتی (المتوفی ۱۲۱۰ھ) بڑے ذی مرتبت بزرگ تھے۔ وہ شاہ محمد نصیر کے خلیفہ تھے جنھوں نے شیخ محمد چشتی سے خلافت حاصل کی تھی۔ موخرالذکر شیخ ابراہیم رامپوری کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے۔ اس بنا پر شاہ صابر بخش جس سجادہ پر جلوہ افروز ہوئے وہ نہایت برگزیدہ بزرگوں کی مسند رہا تھا۔

شاہ صابر صاحبؒ عبادت وطاعت میں بے نظیر تھے۔ سخاوت اور غربا پروری کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا مصنف انوار العاشقین نے لکھا ہے۔

"آپ کے زمانِ فیض نشان میں آپ کی خانقاہ میں بہت درویش اور طالب علم رہتے تھے۔ صدہا آدمیوں کو کھانا ملتا تھا اور بہت بزرگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔" [2]

۱۲۳۷ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں آپ نے وصال فرمایا۔ [3] اپنی خانقاہ میں جو روشن الدولہ کی سنہری مسجد قاضی واڑہ (فیض بازار) کے مقابل واقع تھی مدفون ہوئے۔ آپ کے مزار پر ایک کتبہ بہادر شاہ ثانی نے نصب کرایا۔ [4] فیض بازار میں آپ کی خانقاہ مشہور ہے اور یہ مقام صابر بخش

---

[1] مزارات اولیائے دہلی۔ ص ۱۱۷

[2] انوار العاشقین، از مولانا مشتاق احمد صاحب مرحوم انبھٹوی ص ۹۳ (مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۳۲ھ)

[3] آثار الصنادید۔ ص ۴۵۔ [4] واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۳۳۔

کی باؤلی کہلاتا ہے[۱]۔ خانقاہ کے پاس ایک مسافر خانہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر شاہ دکن کی جانب سے ۱۳۲۰ھ میں بنوایا گیا تھا۔[۲]

میر محمدی صاحبؒ | میر محمدیؒ (المتوفی ۱۲۴۲ھ) حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے۔ مولوی بشیر الدین نے آپ کا اصلی نام مولانا امام الدین بتایا ہے[۳]۔ مصنف مزارات اولیاء دہلی نے آپ کا نام عماد الدین لکھا ہے[۴]۔ میر محمدیؒ سے شاہی خاندان کے افراد خصوصیت سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور ہر وقت اُن کا جمگھٹا اُن کی خانقاہ میں لگا رہتا تھا۔ . . .
شجرۃ الانوار میں لکھا ہے۔

"میر محمدی صاحب کہ یکے از خلفائے حضرت مولانا اند در ارشاد و رہنمائی عباد دریں شہر بخوبیہا مصروف اند باوصاف حمائد موصوف بیلد ماز اہل شہر و شہزادہا مرید میر صاحب اند کشف و کرامات آں سید پاک درمیان مریدانِ ایشاں ہویدا است"

بہادر شاہ کے روزنامچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور نہایت دھوم دھام سے بادشاہ کی سواری ان کی خانقاہ میں پہنچتی تھی۔ لکھا ہے۔

"حضور بادشاہ ایک دن میر محمدی صاحبؒ کے گھر تشریف لے گئے۔ توپ خانہ انگریزی و بادشاہی سے حسب معمول سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں"[۵]

بہادر شاہ کی میر صاحب سے یہ عقیدت وصال کے بعد جاری رہی۔ وہ برابر اُن کے عرس میں شرکت کرتا تھا۔ روزنامچہ میں لکھا ہے۔

---

[۱] مزارات اولیائے دہلی ص ۱۳۱۔ [۲] واقعات دارالحکومت ج ۲ ص ۱۳۳۔
[۳] واقعات ص ۱۵۴۔ [۴] مزارات ص ۱۲۸۔
[۵] بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۳۰

[illegible] کے دن حضرت میر محمدی صاحبؒ مرحوم کا عرس منعقد ہوتا ہے بادشاہ سلامت
عرس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے، ختم میں شریک ہوئے اور تبرک لیکر
واپس آئے۔" [1]

شہزادے خاص طور سے آپ کے عقیدت مند تھے۔ اکثر آپ کے مرید تھے۔ مرزا سلیم
خلف اکبر شاہ ثانی آپ کا مرید اور معتقد تھا۔[2] مرزا خجستہ بخت نے وصال کے بعد میر صاحب کا
جانشین ہونے کا دعویٰ کیا۔[3] آپ نے ۱۲۴۲ھ کو وصال فرمایا۔ مرزا سلیم شاہزادے نے فرطِ عقیدت
سے آپ کو اپنے مکان کے صحن میں ہی دفن کیا جو اب میر محمدی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔[4]
اور حبشی قبر کے متصل واقع ہے۔

مولانا محمد حیاتؒ مولانا محمد حیاتؒ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے دہلی چلے آئے تھے اور
شاہ صابر بخش کی خانقاہ میں معقول و منقول کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے علمی تبحر اور زہد و تقدس
کا بہت شہرہ تھا۔ دور دور سے طلبار تحصیلِ علم کے لئے ان کے مدرسہ میں آتے تھے۔ آپ کے طلبار
اکثر نہایت اعلیٰ پائے کے عالم اور بلند مرتبہ فاضل ہوتے تھے۔ بعض تو ان میں یگانۂ عصر شمار
ہوئے۔ خصوصاً حافظ عبدالرحمٰن گو نابینا تھے لیکن بقول سرسیدؒ کوئی علم عقلیہ اور نقلیہ ایسا
نہیں کہ اس کو محققانہ نہ جانتے ہوں"[5] ہیئت اور علم ہندسہ بے تکلف پڑھاتے تھے۔ جب
مولانا حیاتؒ نے ایسے باکمال شاگرد پیدا کر دیے تو خود اصلاح باطن اور ذکر و اشغال کی طرف
متوجہ ہوئے۔ پاک پٹن میں شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کے پاس گئے۔ ان سے بہت سے کمالات باطنی
کا اکتساب کیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ جہاں آباد واپس آگئے۔ اس دوران میں شاہ صابر بخش صاحب

---

[1] روزنامچہ ص ۱۳۱
[2] واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۲۔ [3] آثار الصنادید ص ۴۰
[4] واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۲۔ [5] آثار الصنادید ص [illegible]

وصال فرما گئے۔ چنانچہ اب اُن کی خانقاہ میں مقیم ہونے کے بجائے قلعہ کے قریب ایک مسجد میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ کی وہاں موجودگی سے مسجد بے حد آباد اور بارونق ہوگئی۔ سرسید نے لکھا ہے "ایسی آباد ہوگئی کہ اب اس کو باعتبار کثرت عبادات اور وفورِ طاعات خیر المساجد اور افضل المعابد کہنا چاہئے"۔ [۱]

حضرت شاہ سید احمد شہیدؒ حضرت شاہ سید احمد صاحبؒ اس زمانہ کے نہایت مشہور اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ اُن کے فیضانِ صحبت اور ارشاد و ہدایت سے ہزاروں نے استفادہ کیا۔ مولوی محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی توجہ کی تاثیر مثل ملکے سے مینہ کے ہوتی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ہوتی ہیں اور سید صاحب کی تاثیر مثل لوہاروں کی پھکنی کے اثر کرتی ہے جو فوارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے"۔ [۲] حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلقین و ارشاد نے مجاہدوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کردی جس کے دل احیاء ملت کے لئے بے چین اور بے قرار رہتے تھے۔ سید صاحب کے متعلق اس زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس لئے ان کے متعلق خود کچھ لکھنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک معاصر کی رائے نقل کردی جائے ــــ سرسید احمد خاں جنھوں نے سید صاحب کو خود دیکھا تھا، اور جنھوں نے اپنی کتاب آثار الصنادید اُن کی شہادت کے ۱۵ سال بعد لکھی تھی۔ آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جناب ہدایت انتساب زبدہ واصلان درگاہ سید احمد صاحب طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ سادات عظام اور مشائخ کرام سے تھے۔ وطن آپ کا اصلی بریلی اوایل حال میں شوق طالب علمی میں وطن سے وارد شاہ جہاں آباد ہوکر حضرت بابرکت مولانا عبد القادر علیہ الرحمہ کی خدمت سراسر افادت میں حاضر ہوکر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو

---

[۱] آثار الصنادید۔ ص ۴۲ ۔ [۲] سوانح احمدی۔ مولوی جعفر تھانیسری (انبالہ) ص ۲۱

میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ ازبسکہ ذوقِ درویشی اور مسکینی طینت میں پڑی ہوئی تھی۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردوں خصوصاً درویشان پاک طینت کی جو دور دراز سے تحصیل علمِ باطنی کے شوق میں جناب مولانا عبدالقادر صاحب مغفور موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے خاطر داری اور سرانجام مہام میں ایسے بدل سرگرم ہوتے گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے اور اس زمانہ میں بھی اپنے اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا مصروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اسی امر کے واسطے کنج نشین اور گوشہ گزیں تھے اُن سے بھی اس طرح خاطر مجموع اور حضورِ قلب سے ظہور میں نہ آتے تھے اکثر مولانائے مغفور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں۔ اور بادہ اس سعادت منش کا ترقی مدارج علیا کا قابل نظر آتا ہے۔ اُسی أثنا میں سرگروہ علمائے انام بلغائے عظام جامع کمالات صوری و معنوی خادم حدیث شریف نبوی مولانا و بالفضل اولانا مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہ الرحمۃ سے بیعت کا ارادہ کیا۔ جب ان کی خدمت میں گئے مولانائے ممدوح نے جوان کے حالات سے واقف تھے فرمایا کہ اگرچہ حق جل وعلیٰ نے اس صاف باطن کو اختیار طریقہ رشد و ہدایت کے باب میں واسطے کا محتاج نہیں رکھا اور وسیلہ کا نیازمند نہیں کیا لیکن اہل ظاہر کے نزدیک ہر چیز کے لئے ایک سبب ضروری ہے۔ رفع حجت عوام کے واسطے کچھ مضائقہ نہیں۔ پھر آپنے مولانائے موصوف سے بیعت کی۔ بعد چند مدت کے سفر اختیار کیا۔ اور اطراف و جوانب میں خداشناساں پاک باطن سے فیض حاصل کرنے میں سرگرم رہے ازبس کہ مقاماتِ عالی روز بروز کھلتے جاتے تھے اور مراتب علیا آناً فاناً ترقی میں تھے۔ اس دولتِ بے زوال سے اہلِ ظاہر کو آگاہی ہو چلی اور

ہر طرف سے لوگوں نے ہجوم کیا اور کسی نے بیعت اور کسی نے روائے حاجات سے سوال کرنا شروع کیا۔ چونکہ اخفائے حال اور ستر احوال منظور تھا خیال میں یہ آیا کہ اگر اہلِ دنیا کے لباس سے ملبس ہو کر علم باطنی کی تحصیل کی جاوے تو یہ ہجوم عوام کا جمیعت اوقات میں خلل انداز نہ ہوگا۔ اس خیال سے ٹونک کی طرف تشریف لے گئے۔ اور نواب امیر خاں کی رفاقت میں بسر کی اور از بس کہ شجاعت اور جوانمردی سادات صحیح النسب کا جوہر ہے اُس اثنا میں تردداتِ عظیمہ آپ سے ظہور میں آئے اور با این ہمہ تلاش اہلِ باطن . . . . تھی۔ اور اکثروں کی ہدایت کی راہ بھی آپ سے حاصل ہوئی جب اس عرصہ میں جمیع مراتب کی تکمیل ہو گئی آپ ترک دنیا کر کے پھر شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے اور مسجد اکبر آبادی میں وارد ہوئے۔ اس اثنا میں مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور مولوی محمد اسمعیل رحمۃ اللہ علیہ مقام علوم رسمی کے درس و تدریس میں مصروف تھے اور اہلِ باطن کی طرف چنداں ملتفت نہ ہوتے تھے جب اس دفعہ آپ کے تشریف لانے سے مردم شہر میں ایک غلغلہ پڑ گیا تھا اور طالب فیض باطن کے کثرت سے ہجوم کرنے لگے۔ ایک بار مولوی صاحب نے باتفاق مولوی عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے آپ کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ ہم کو نماز حضورِ قلب سے کبھی میسر نہ ہوئی۔ اگر آپ کی ہدایت سے یہ امر حاصل ہو جائے تو عین مدعا ہے۔ حضرت نے کشف باطن سے معلوم کیا کہ یہ بطریقِ امتحان اس طرح سے کہتے ہیں۔ تبسم کیا اور فرمایا کہ مولانا آج شب کو اس حجرہ میں تشریف لاؤ، شاید یہ بات ظہور میں آجائے۔ ان کو زیادہ استعجاب ہوا اور شب کو دونوں صاحب تشریف لے گئے۔ اور آپ نے اپنے ساتھ ان کو نماز میں کھڑا کیا۔ اور جب نماز پڑھ چکے فرمایا کہ اب جدا جدا نیت باندھ کر دو دو رکعت علیحدہ پڑھو۔ یہ جب

کھڑے ہوئے تو اس طرح کا استغراق ہوا کہ ان دونوں صاحبوں کی انہیں دو رکعت میں
شب بسر ہوگئی۔ جب یہ فیض باطن مشاہدہ کیا صبح کو دونوں صاحبوں نے بیعت کی۔ اور
یہاں تک آپ کی کفش برداری میں حاضر رہے کہ آپ کی کفش برداری کو فخر سمجھتے تھے۔
چند روز کے بعد آپ نے فرمایا کہ مولانا مشیت الہی میں یہ ہے کہ تم کو تکمیل اس علم کی
اور تتمیم ان مراتب کی سفر میں حاصل ہو۔ ان کو ہمراہ لیکر مکہ معظمہ کا سفر کیا اور راہ میں
قریب ایک ہزار آدمی کے اپنے ہمراہ لے کر حج ادا کیا اور وہاں سے پھر ہندوستان کی طرف
تشریف لائے اور آپ جو ترویج رسوم شرعیہ اور امر بالمعروف بہت کرتے منہیات کا
رواج اُن کی برکت سے اکثر اطراف سے اٹھ گیا۔ طرفہ یہ ہے کہ شہر کلکتہ میں جب
تک آپ نے تشریف رکھی شراب مطلق نہ بکنے پائی۔ اور کلال خانہ بند رہا۔ اور اس نواح
میں آپ کے مریدوں کی کثرت لکھوک سے گذر گئی۔ اور آپ کے اکثر خلفا کو قطب اور
اوتاد کا مرتبہ حاصل ہوا اور جو کسا از روئے کشف باطن کے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کو مع اکثر
مومنین پاک اعتقاد کے سعادت شہادت حاصل ہونے والی ہے۔ مولانا اسمٰعیل اور
مولانا عبدالحی کو اجازت ہوئی کہ اطرافِ ہندوستان میں وعظ کہو اور بیشتر جہاد اور فضیلت
شہادت بیان کرو ہر چند یہ اس کا منشا نہ جانتے تھے لیکن مرید با اخلاص تھے اور فرمان
بجا لائے۔ ان کے وعظ سے لکھوک مردم شاہراہِ ہدایت پر آئے اور شوق ما ہو الحق دل
میں جم گیا۔ اور جہاد کی افضلیت ذہنوں میں بیٹھ گئی اور خود بخود چاہنے لگے کہ اگر
جان و مال راہ الٰہی میں صرف ہو تو عین سعادت ہے۔ بعد مدت کے ان بزرگوں کو
حضرت نے لکھا کہ اب ہمارے پاس چلے آؤ، یہ تو جان نثار تھے۔ بہ مجرد حکم کے مشتاقین
وعظ کو نیم جان چھوڑ کر خدمت بابرکت میں راہی ہوئے اور حضرت ان کو ہمراہ لے کر

کوہستان کو چلے گئے اور یہ ہنوز اس کے منشا سے واقف نہیں۔ . . . .

قوم افغان . . . حضرت کے ایسے معتقد ہوئے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی اور عہد کیا کہ اگر حضرت جہاد کریں تو ہم سرفروشی کو حاضر ہیں۔ آپ نے سکھوں کی قوم پر جہاد قائم کیا۔ مردم ہندوستان اس خبر کے سننے سے اطراف و جوانب سے راہی ہوئے اور اور سوائے قوم افاغنہ کے مردم ہندوستانی لاکھ آدمی کے قریب جمع ہوئے اور خطبہ آپ کے نام کا پڑھا گیا۔ دور دور امام ہو گیا۔ چند منزل عشر جو طریقہ اسلام میں ایک نوع خراج کی ہے آپ کے پاس آنے لگا۔ پشاور اور بعض مکان سکھ کی عمل داری سے نکل کر غازیانِ اسلام کے تصرف میں آ گئے سکھوں کے باوجود اس شان و شوکتِ ظاہری کے آپ کا ایسا رعب دل میں بیٹھ گیا کہ کچھ ملک دینے پر راضی ہوئے۔ سچ ہے ع

ہیبت حق است ایں از خلق نیست

لیکن حضرت کو جو کہ ترویج اسلام منظور تھی قبول نہ کیا۔ کئی سال تک یہی سلسلہ یوں ہی چلا گیا اور مولوی مولانا عبدالحی علیہ الرحمہ نے بیماری بدنی سے سفر آخرت اختیار کیا۔ بعد اس کے چونکہ قوم افاغنہ بندۂ زر اور نہایت طامع ہیں سکھوں کے اغواسے آپ سے منحرف ہو گئے۔ اور عین معرکۂ جنگ میں آپ سے دغا کی۔ از بس کہ مشیتِ الٰہی میں دولتِ شہادت آپ کے نصیب میں تھی قریب بالاکوٹ کے حضرت نے مع مولوی محمد اسمٰعیل اور اکثر مومنین صاف اعتقاد کے شہادت پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت کی شہادت کو چودہ پندرہ برس کا عرصہ گذرتا ہے۔[۱]

---

[۱] آثار الصنادید۔ ص ۴۷۔ ۴۳۔

شاہ فدا حسین صاحب | شاہ فدا حسین صاحبؒ کا اصلی نام خواجہ نجیب الدین تھا وہ رسول شاہیؒ سلسلہ کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے۔ رسول شاہی سلسلہ، رسول شاہ سے شروع ہوتا ہے، وہ خاندان سہروردیہ سے متعلق تھے۔

شاہ فدا حسین صاحب نے بانی سلسلہ رسول شاہی کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ شاہ محمد حنیف سے بیعت کی تھی۔ اُن ہی سے تمام درسی کتابیں پڑھیں۔ جب تحصیل پوری ہوگئی تو مرشد کے حکم سے کل کتابیں کنویں میں ڈالدیں وہ خاص کر حقایق و معارف میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فصوص الحکم، فتوحات مکیہ اور شیخ اکبرؒ کی دیگر تصانیف بہت خوبی سے پڑھاتے تھے "مگر وضع یہ تھی کہ چار ابرو کا صفایا کئے، ایک غرقی باندھے اور سارے بدن پر بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرہ سے باہر نکلتے تو تہمد گھٹنوں تک لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے۔ ایک بار اکبر شاہ نے اُن کے پاس آنا چاہا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا" [1]

سرسید کہتے تھے کہ وہ نہایت خوش بیان اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو جو اُن کی بھتیجی تھیں [2] اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اس کا اثر میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلی میں اُن کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے اور ۱۲۵۹ھ میں وہاں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکیہ میں جو چیلی باغ کہلاتا ہے اُن کا ڈھیر ہے" [3]

شاہ صاحب نہایت توکل اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ زمین پر سوتے اور اینٹ

---

[1] حیات جاوید ج ۱ ص ۲۰۔ [2] شاہ فدا حسین، سرسید کے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کے حقیقی بھائی تھے۔ (حیات جاوید ج ۱ ص ۲۰)۔ [3] حیات جاوید ج ۱ ص ۲۱۔

سرہانے رکھتے تھے[1]۔ اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ خاکساری طبیعت میں بہت تھی، ان کی ذات سے رسول شاہی سلسلہ کو بہت ترقی ہوئی۔ ہزاروں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ان کے خلفاء تبت، سراندیپ، مشہد وغیرہ میں موجود تھے[2]۔ بعض تذکرہ نویسوں نے شاہ صاحب کے مذہبی خیالات پر اعتراض کئے ہیں اور لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان سے اس سلسلہ میں مناظرہ کیا تھا۔ حاجی امداداللہ صاحبؒ نے ان سب باتوں کی تردید کی ہے اور شاہ صاحب کو صاحب باطن بتایا ہے[3]۔

شاہ فداحسین کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ مثنوی بن مدسر اُن کی طبع زاد ہے جو آپ کے معتقدین نے جمع کی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مرا جز دیدن دیدار وجہ اللہ کارے نیست در دنیا
شفاعت را بجز ذات رسول اللہ یارے نیست در عقبیٰ

خویشتن را خود عیاں فرمودۂ	صورتے از جسم و جاں بنمودۂ
کل نفس واحد فرمودۂ	واحد فی کل نفس بودۂ
اگر بخلوتِ دل یک زمانہ بنشینی	درونِ کعبہ دل صورت خدا بینی
نسبتِ طاعت بخود عصیاں بود	نسبتِ عصیاں بخود عرفاں بود
عین ذات تو بود وحدت وجود	ایں صفات تو بود وحدت شہود
غیر وحدت نیست کثرت را وجود	غیر کثرت نیست وحدت را شہود[4]

---

[1] آثار الصنادید ص ۵۱ - [2] ایضاً ص ۵۱-۵۲ - [3] شمائم امدادیہ ص ۱۳۰
[4] آثار الصنادید ص ۵۲ - نیز واقعات دار الحکومت دہلی۔

۱۸۵۷ء سے قبل کی علمی دنیا کا ذکر کرنا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کا ذکر کرنا ہے
اس خاندان نے علومِ دینیؒ کی وہ عظیم الشان خدمت کی ہے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔
مولانا نذیر احمد دہلویؒ نے اپنے ترجمہ القرآن کے شروع میں نہایت صحیح لکھا ہے " انھوں (شاہ ولی اللہؒ) نے اور ان کے خاندان نے ہند میں اسلام کی قریب قریب ویسی ہی خدمتیں کیں جیسی عرب میں قرونِ اولی کے مسلمانوں نے یعنی اصحاب نے، تابعین نے اور تبع تابعین نے اور ائمہ مجتہدین نے کی تھیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام جتنا کچھ بھی ہے اور جیسا کچھ بھی ہے اسی خاندانِ عالی شان کا طفیل ہے ان بزرگوں نے اسلام کی اشاعت میں وہ کیا جو دینِ حق کا دلدادہ، قوم کا مصلح، ہمدرد و خیر خواہ کر سکتا ہے۔ دین کی کتابوں کے درس دیئے ترجمہ کئے۔ وعظ کہے۔ تصنیفیں کیں" [1]

اس خاندان نے مذہب کا عظمت و وقار قائم کیا۔ عوام میں صحیح مذہبی جذبات پیدا کئے اور ان کو کتاب و حدیث سے روشناس کرایا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ ان کے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدین نے قرآن کریم کے اردو میں ترجمے کئے۔ شاہ عبدالحئی (شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے داماد) نے لغات القرآن لکھی، مولانا محمد اسحٰق (شاہ عبدالعزیز کے نواسہ) نے مشکوٰۃ کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ غرض اس طرح سے علومِ دینی کو پھیلایا گیا۔ اور عوام میں کتاب و حدیث سے استفادہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نقلی علوم کے ماہر تھے۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ عقلی مسائل کی تحقیق میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، کشفی معاملات میں شاہ عبدالقادر صاحب ممتاز تھے۔ ان تینوں صلاحیتوں نے مل کر ایک طوفانی دور میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی۔

---

[1] مقدمہ۔ ص ۴

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ | حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزند شاہ عبدالعزیز صاحب (۱۲۳۹-۱۱۵۹)
اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ متبحر عالم تھے علم وفضل میں وہ وحید عصر اور یکتائے زمانہ تھے۔
"فقر ودین، فضل وہنر، لطف وکرم، علم وعمل[1] سب خوبیاں ان کی ذات میں جمع تھیں۔ وہ علمی دنیا کے آفتاب تھے جس سنگریزہ پر شعاعیں پڑجاتیں وہ لعل ناب بن کر چمکتا۔ حدیث وقرآن کا جو چرچا ان کے زمانہ میں ہوا اس کی مثال اسلامی ہند کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے خرمن کمال کے ہزاروں خوشہ چیں تھے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے۔ ایک عالم نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور اُسے علم حدیث کا کوئی بھی ایسا استاد نہ ملا جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا شاگرد نہ ہو[2]۔"

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جس وقت وصال فرمایا تھا اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مکمل ۶۰ سال تک دلی میں علوم دینیہ کی ترویج وتبلیغ میں صرف کئے۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے بھی مذہبی مدارس ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر شاہ صاحب ہی کی کوشش کے مرہونِ منت ہیں اور ان ہی کی روشن کی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور علم کا ایک معیار قائم کیا کہ ہرکس وناکس علوم دینیہ میں بے جا دخل دینے کی (جیسا کہ انحطاط کے زمانہ میں اکثر ہوتا ہے) جرأت نہ کرسکتا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں۔

"یہ آفت جو اس جزو زمان میں تمام دیار ہندوستان خصوصاً شاہ جہاں آباد حرسہا اللہ

---

[1] مومن نے شاہ صاحب کے وصال پر ایک مرثیہ لکھا تھا اس کا شعر ہے ؎

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہوگئے
فقر ودیں، فضل وہنر، لطف وکرم، علم وعمل

[2] "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" مولانا سندھی، ص ۸۲

عن الشر والفساد میں مثل ہوائے وبائی کے عام ہوگئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل آپ کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالہ مسائل دینی اور ترجمہ قرآن مجید کو اور وہ بھی زبان اردو میں کسی نے استاد سے اور کسی نے اپنی زور طبیعت سے پڑھ لیا ہے اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرأت کر بیٹھا ہے آپ کے ایام حیات تک اس کا اثر نہ تھا بلکہ علما متبحر . . . جب تک پنا سمجھا ہوا حضرت کی خدمت میں عرض نہ کر لیتے تھے اس کے اظہار میں لب کو وا نہ کرتے تھے“ [1]

اس طرح علوم دینیہ کی ایک خاص عزت اور وقار قائم ہوگیا۔ جو لوگ دلچسپی رکھتے تھے وہ باقاعدہ تحصیلِ علوم کرتے تھے ۔ ہر جاہل کو بے سروپا اور گمراہ کن باتیں پھیلانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے علمی فیوض سے سارا ہندوستان مستفیض ہوا۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا خیال تھا کہ ”شاہ ولی اللہؒ کے خواص سے اگر دس آدمیوں نے استفادہ کیا تو شاہ عبدالعزیزؒ کے خواص سے دس ہزار مستفید ہوئے“[2] شاہ صاحب ہفتہ میں دو بار مجلس وعظ کیا کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں خواص و عوام مور و ملخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے[3]۔ شاہ صاحب کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ شدید علالت کے زمانہ میں بھی پابندی سے وعظ فرماتے تھے۔ ان کا طرز بیان بڑا دلکش تھا۔ بات مختصر لیکن دل میں اتر جانے والی کہتے تھے۔ اُن کے ملفوظات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کے دل میں مذہب سے متعلق بہت سے شبہات پیدا ہو رہے تھے اور یہ شاہ صاحب ہی کا تبحر اور قابلیت تھی کہ ان کو مطمئن کر دیتے تھے۔ ایک

---

[1] آثار الصنادید۔ ص ۷۰   [2] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ مولانا سندھی۔ ص ۹۴

[3] آثار الصنادید ص ۷۱

انحطاط پذیر سوسائٹی میں عوام کے "مذہبی ذہن وشعور" کو انتشار سے بچالینا شاہ صاحب کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے وہ عوام کی نفسیات سے واقف تھے. مذہب کی روح سے واقف تھے مرض کی تشخیص کر چکے تھے، اس لئے علاج ہمیشہ کارگر ہوتا تھا. سائل ہمیشہ مطمئن ہو جاتا تھا اور اس کے شبہات دور ہو جاتے تھے. ایک شخص نے سوال کیا "شریعت محمدی چرا اکمل شرائع باشد" جواب میں ارشاد ہوتا ہے.

"وجہش آں است کہ در دیگر شرائع لحاظ خصوصیات استعداد امت خاص وزمان و مصلحت آں وقت بود کہ اگر خلاف آں کنند نقصان شود پس کامل بود و دریں شریعت لحاظ مصلحت نوع انسانست پس تخصیص اوقات واستعداد امت خاص نہ باشد بلکہ برائے ہر امت از فرض ونوافل وسنت بہ تشدد وسہولت موجود است گویا معتدل تریں شرائع شد" [۱]

جواب مختصر تھا مگر اس قدر جامع کہ اس سے بہتر جواب ناممکن تھا. روح، معراج اور دیگر مسائل کے متعلق اُن سے سوال کئے جاتے تھے اور نہایت تشفی بخش جواب ملتا تھا [۲]

شاہ صاحبؒ نے جو خدمات اسلام کی انجام دی ہیں ان پر سیر حاصل بحث کرنے کے لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے. یہاں اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ شاہ صاحبؒ کی مساعی کے چار پہلو تھے.

(۱) علوم دینی، حدیث وقرآن کا چرچا کرنا اور ان کا صحیح معیار قائم کرنا.

(۲) اس زمانہ کے مختلف غلط مذہبی نظریات کی تصحیح اور شبہات کا رفع کرنا اور مسلمانوں میں مذہبی حیثیت سے "ذہنی انتشار" پیدا نہ ہونے دینا.

---

[۱] ملفوظات شاہ عبدالعزیز رحمۃ. مطبوعہ میرٹھ ص ۵۷. [۲] ایضاً ص ۲۵، ۵۵ وغیرہ

(۳) ہندوستان کے عرب سے زیادہ قریبی تعلقات پیدا کرنا۔

(۴) ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر جہاد کی روح پھونکنا اور مجاہدین کی ایک سرفروش جماعت کا پیدا کرنا۔

شاہ رفیع الدین صاحبؒ | شاہ رفیع الدین صاحبؒ ابن شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ چونکہ کبرسنی، ضعف مزاج اور کثرتِ امراض کے باعث آخر عمر میں درس وتدریس کا کام انجام نہیں دے سکتے تھے اس لئے شاہ رفیع الدین صاحبؒ اس خدمت پر مامور تھے۔ دور دور سے علماء آپ سے استفادہ حاصل کرنے کی غرض سے دلی آتے تھے۔ وہ ہر فن اور مضمون میں کامل مہارت رکھتے تھے جس فن کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، ایسا معلوم ہوتا کہ یہی آپ کا خاص مضمون ہے۔ ریاضیات میں بہت ماہر تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرمایا کرتے تھے

"مولوی رفیع الدین درریاضیات چنداں ترقی کردہ اند کہ شاید موجد آں محمد علی ہم بودہ باشد باز" [۲]

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

درفن ریاضی مثل مولوی رفیع الدین در ہند وولایت نخواہد بود۔ [۳]

آپ کی تصانیف میں مقدمۃ العلم، رسالہ عروض، کتاب التکمیل، رسالہ دفع الباطل، اسرار المحبۃ بہت مشہور ہیں۔ آپ نے اردو میں قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو آپ سے بہت محبت تھی۔ جامع ملفوظات نے مولانا رفیع الدین صاحبؒ

---

[۱] فتاوی عزیزیہ ج ۱ (مطبع مجتبائی ص ۱۷، ۱۸۵۔ نیز ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۸۰۔

[۲] ملفوظات۔ ص ۳۰۔ [۳] ایضاً ص ۹۲

کے جنازے کی پوری کیفیت اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا باوجود نابینا ہونے کے چارپائی اٹھانے کی کوشش کرنا نہایت دردناک پیرایہ میں بیان کیا ہے۔[1]

شاہ عبدالقادر صاحبؒ | شاہ عبدالقادر صاحبؒ (۱۱۶۷-۱۲۳۰) اپنے خاندان کی علمی خصوصیات کے حامل تھے۔ خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے۔

"عالم، عامل، وفقیہ کامل بود، درعلم حدیث وتفسیر شانے عظیم داشت۔"[2]

انتہائی پرہیزگار اور متقی تھے۔ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ توکل اور قناعت حد سے زیادہ تھی۔ امیر الروایات میں لکھا ہے: "شاہ عبدالقادرؒ کا کھانا اکبری مسجد میں روزانہ شاہ عبدالعزیزؒ ہی کے گھر سے جاتا تھا وہی اپنے متوکل بھائی کے کپڑے بنا دیتے تھے۔"[3]

شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ۱۲۰۵ھ میں صرف قرآن پاک کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ موضح القرآن کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ بقول مولوی نذیر احمد دہلویؒ اردو کا بہتر سے بہتر ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔"[4]

شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے اور بیٹے تو عالم اور صلحا تھے لیکن شاہ عبدالقادر صاحب نسبت تھے اور صاحبِ نسبت بہت کم ہوتے ہیں۔[5]

آپ کا اخلاق نہایت عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ کسی سے کچھ نہ فرماتے تھے لیکن رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے رؤسا آپ کے سامنے لب کشائی کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔[6]

---

[1] ملفوظات ص ۸۲-۸۳۔ [2] خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۸۹۔ [3] امیر الروایات امیر شاہ خاں۔ ص ۱۰۵۔

[4] مقدمہ ترجمہ القرآن ص ۴۔ نیز مولانا سندھی مرحوم کا خیال ہے کہ "موضح القرآن" میں "آپ کے تشریحی ارشادات آج تک علمائے محققین کے لئے بصیرت افروز ہیں" شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۸۲۔

[5] ارشاداتِ رحمانی وفضل یزدانی۔ مولوی عبدالاحد (مجتبائی پریس دہلی ۱۳۱۱ھ) ص ۳۰۔

[6] واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۹۔

مولوی رشید الدین خاں | مولوی رشید الدین خاں، شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے شاگرد رشید تھے۔ معقول و منقول، فروع و حدیث میں یگانۂ عصر تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ان کی تعلیم و تربیت بیٹے کی طرح کی تھی، ہر وقت ان کی اصلاح اور ترقی کی فکر اور کوشش رہتی تھی۔ شاہ رفیع الدین صاحب کے بعد، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحب نے ان کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کی طرف توجہ کی۔

مولوی رشید الدین صاحب گو ہر فن میں دستگاہ رکھتے تھے لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں اُن کو خاص مہارت تھی اور اُس زمانہ میں مشکل سے کوئی شخص ان فنون میں ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ مناظرہ اور مباحثہ میں جو ید طولیٰ اُن کو حاصل تھا وہ مشکل سے کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ علماء و فضلا آپ کے تبحر کا کلمہ مانتے تھے۔ فرقۂ امامیہ سے اُن کے مباحث اُن کے علمی بلندی کا ثبوت ہیں۔

علم و فضل کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کا زہد و تقویٰ بھی مسلم تھا قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عہدہ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مدرسہ شاہ جہاں آباد میں مدرسی کرتے رہے۔ سو روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ یہی گذر اوقات کا ذریعہ تھا۔ جو ضرورتمند پہنچ جاتا تھا اس کی حتی المقدور مدد کرتے تھے۔ ۱۲۴۹ھ میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں وصال فرمایا۔

مولانا مخصوص اللہ صاحبؒ | مولانا مخصوص اللہ صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب کے فرزند ارجمند تھے علم و فضل میں اپنے گھرانے کی روایات کے حامل تھے ۲۵ سال تک وہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں رہے تھے۔ ان کی مجالس وعظ میں پابندی سے شرکت کی تھی اور اس طرح سے حدیث و تفسیر کا بے نظیر سرمایہ سینے میں رکھتے تھے۔ مدت تک انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ رکھا۔ آخر میں گوشہ نشین ہو گئے اور عبادت گذاری میں وقت صرف کرنے لگے۔

مولانا عبدالحیؒ | مولانا عبدالحی صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد اور داماد تھے۔ زہد و تقویٰ، علم و فضل سب ہی کچھ اللہ تعالیٰ نے انھیں عنایت کیا تھا۔ ہر فن کے ساتھ خداداد نسبت رکھتے تھے۔ ایک مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ پھر سید احمد شہیدؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرلی۔ اور پھر ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے۔ اُن ہی کے ساتھ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے واپسی پر پیر و مرشد کے ارشاد کے مطابق وعظ گوئی میں مصروف ہو گئے۔ مولوی محمد اسمٰعیلؒ کے ساتھ ترغیب جہاد میں سرگرم رہے۔ پھر سید صاحب کے ساتھ سرحدی علاقوں میں تلقین و ترغیبِ جہاد شروع کی۔ ۱۲۴۳ھ کو مولانا عبدالحی صاحبؒ نے وصال فرمایا جب اُن کا آخری وقت ہوا تو سید صاحب نے اُن سے فرمایا کہ مولانا اگر آپ کی کوئی خواہش ہو تو میں اس کو پورا کردوں۔ آپ نے کہا آپ اپنا قدم بڑھا کر میرے سینے پر رکھیں۔ یہ ہی ایک خواہش باقی ہے۔ سید صاحب نے تعمیل کردی۔[1]

شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ | شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تفہیماتِ الٰہیہ میں ایک جگہ اشارہ کیا تھا کہ "اگر موقع و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کرکے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا تھا"[2] زمانہ کا یہ تقاضا نہ تھا اس لئے وہ خاموش ہو رہے کچھ عرصہ کے بعد حالات نے ایک مجاہد کو پکارا تو شاہ صاحبؒ کی یہ "صلاحیت" شاہ محمد اسمٰعیلؒ کی صورت میں نمودار ہوئی شاہ محمد اسمٰعیل، شاہ صاحب کے پوتے تھے اور "حضرات ثلٰثہ"[3] کی صحبت اور تربیت سے انھوں نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا تھا جو شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ تھا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۰۰۔ [2] تفہیمات الٰہیہ جلد اول ص ۱۰۱۔
[3] آثار الصنادید (ص ۹۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ۔ شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

شاہ محمد اسمٰعیل صاحب ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے انھیں اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ بقول سرسید کہ "جوہر قابل محتاج تربیت اور نیاز مند تعلیم نہیں ہوتا"[1] آپ نے بہت جلد تمام علوم حاصل کرلئے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں تحصیل معقول و منقول سے فراغت حاصل ہوگئی۔ اوائل حال ہی میں شاہ سید احمدؒ کے معتقد ہوگئے۔ پیرومرشد کے ہمراہ حج کو چلے گئے۔ جب واپس آئے تو رشد و ہدایت کا دروازہ کھول دیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنی توجہ تین چیزوں کی طرف مبذول کی کہ ان کی نظر میں اسلام کی بقا کا راز صرف ان ہی میں تھا۔

(۱) اماتتِ بدعت۔

(۲) احیاءِ سنت۔

(۳) تلقینِ جہاد۔

جامع مسجد دہلی میں انھوں نے ہزاروں کے اجتماع میں وعظ کہے۔ سینکڑوں کو بدعت سے نکالا۔ سنت پر جمایا اور جہاد کے لئے تیار کیا۔ ان کی اس مسلسل کوشش نے عروقِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جب دہلی میں کام ختم کر چکے تو پیرومرشد نے بالاکوٹ بلالیا جہاں مرشد و مرید دونوں نے ناموسِ اسلام کی خاطر اپنے خون کے آخری قطرات بہادیئے۔

شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کے لئے اس مضمون میں گنجایش نہیں۔ انھوں نے احیاءِ ملت کے لئے وہ خدمات انجام دیں جو اسلامی ہند کی تاریخ میں سونے کے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں میں جو روح پھونک دی تھی اس کے مظاہرے ان کی شہادت کے بعد تک ہوتے رہے۔ سرسید کا بیان ہے۔

---

[1] آثار الصنادید

"اس واقعہ کو (یعنی شہادت کو) چودہ پندرہ برس گزرتے ہیں اور چونکہ یہ طریقہ آخرالزماں میں بنیاد ڈالا ہوا ان حضرات کا ہے اب تک اس سنت کی پیروی عباد اللہ نے ہاتھ سے نہیں دی۔ اور ہر سال مجاہدین اوطانِ مختلفہ سے بہ نیت جہاد اُسی نواح کی طرف راہی ہوا کرتے ہیں۔ اور اس امر نیک کا ثواب آپ کی روح مطہر کو پہنچتا رہتا ہے۔" سلہ

مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ مولانا محمد اسحٰق شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے تھے اور ان ہی کی خدمت میں علم حدیث حاصل کیا تھا بیس سال تک حدیث کا درس شاہ صاحبؒ کے سامنے بیٹھ کر نئے طلبا کو دیا۔ سلہ اتباعِ سنت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم و عمل دونوں عنایت فرمائے تھے۔ ۱۲۳۹ھ میں جب شاہ عبدالعزیز نے وصال فرمایا تو اپنا مدرسہ مولانا اسحٰق صاحبؒ ہی کے سپرد کیا۔ اور وہی خلیفہ مقرر ہوئے۔ دہلی میں ان کی بڑی عزت اور احترام تھا۔ بادشاہ تک اُن کا احترام کرتا تھا۔ حاجی امداد اللہ صاحب سے روایت ہے کہ مولانا عشرہ محرم کے دن بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے۔ بادشاہ سونے کے کپڑے پہنے ہوئے تھا، آستین سے بند کرلئے اور جب تک مولانا بیٹھے رہے مودب بیٹھا رہا۔ سلہ

کچھ عرصہ بعد چند قبیلوں کے ساتھ حج کو چلے گئے اور پھر تشریف لاکر اپنے مواعظ ونصائح سے خلقِ خدا کو راہِ ہدایت دکھانے لگے۔ دوسری بار پھر معہ قبائل حج کے لئے روانہ ہوئے اور مکہ معظمہ میں ہی وطن اختیار کرلیا۔ ہندوستان سے جو لوگ حج کے لئے جاتے تھے وہ ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے اور وہ ان کی بڑی خاطر مدارات کرتے تھے۔ دلی سے جدا ہوکر ۲ سال تک مکہ معظمہ رہے ۱۲۶۲ھ میں وصال فرمایا۔

سلہ آثار الصنادید ص ۱۰۳۔ سلہ ایضاً ص ۱۰۴۔ سلہ شمائم امدادیہ ص ۱۳۰۔

مولانا محمد یعقوبؒ | مولانا محمد اسحاقؒ کے چھوٹے بھائی تھے، علم و فضل، قناعت و استغنا میں بے نظیر تھے۔ کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہ کرتے تھے۔ شاہ اسحٰق صاحبؒ کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ معظمہ میں وطن اختیار کیا۔

نواب قطب الدین خاں | نواب قطب الدین خاں صاحب اپنے زمانہ کے متبحر عالم تھے فقہ و حدیث کی تعلیم حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے حاصل کی تھی۔ اتباعِ شریعت کا بے حد خیال رہتا تھا۔ وضع ولباس میں بالکل اپنے استاد کے مشابہ تھے[1] علم و فضل، زہد و ورع سب کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو عنایت کیا تھا۔ ان کے بزرگ دربارِ شاہی میں تقرب رکھتے تھے۔ خود اُن کو بارگاہِ سلطانی میں بڑا مرتبہ اور عزت حاصل تھی۔ ۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کی خبر ہے۔

"نواب غلام محی الدین خاں بہادر کی تقریب ماتم میں اُن کے صاحبزادے مفخر الاسلام نواب محمد قطب الدین خاں بہادر کو خلعت شش پارچہ اوران کے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت کی طرف سے عطا کیا گیا۔"[2]

نواب صاحب چوتھے دن اپنے استاد کی پیروی میں مجلسِ وعظ منعقد کرتے تھے، آپ نے بہت سے رسائل اردو میں لکھے ہیں۔ ان میں بعض نہایت اہم مسائل کو سمجھایا ہے۔ سرسید نے لکھا ہے "ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریاتِ دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہوگیا"[3] انھوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ "مظاہر الحق" کے نام سے اردو میں کیا۔ اس ترجمہ کی زبان بہت سلیس اور شستہ ہے۔ وہ ہمیشہ رواجِ دین اور تقویتِ شرع کے لئے ساعی رہتے تھے۔

مولانا مملوک علی صاحبؒ | مولانا مملوک علی صاحب دلی کے مشاہیر علماء میں سے تھے، معقول و منقول

---

[1] آثار الصنادید ص ۱۰۶۔ [2] بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۰۳۔ [3] آثار الصنادید ص ۱۰۷

میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ فقہ پر خاص طور سے عبور تھا۔ وہ مولانا رشید الدین صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مولانا مرحوم کے بعد وہی مدرسہ شاہ جہاں آباد کی مدرسی پر مامور ہوئے آپ کے فیوض سے تمام ہندوستان نے استفادہ کیا۔ آپ کے شاگرد بڑے مرتبہ کے عالم ہوئے مولانا عاشق الٰہی صاحب مرحوم نے خوب لکھا ہے۔

"مولانا مملوک علی صاحب جنھوں نے درسیات کا اکثر حصہ ماہتابِ ہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ کے ارشد تلامذہ حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب سے پڑھا تھا، فلک علم کے نیرین امام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی و قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا محمد مظہر صاحب صدر المدرسین مظاہر العلوم جیسی مقدس و مشہور ہستیوں کے استاد تھے کہ ان سب حضرات نے علومِ دینیہ و فنونِ ادبیہ کی پیاس اسی بحر زخار کے آب و دہن سے بجھائی اور ہر چہار جانب سے پریشان ہو کر اسی آستانہ پر شفا و تسکین پائی تھی۔" [۱]

مولانا کو درسیات وغیرہ کی کتابوں پر اس قدر عبور تھا کہ اکثر زبانی یاد تھیں۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ سرسید لکھتے ہیں۔

"اگر فرض کرو کہ ان تمام کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو اُن کی لوحِ حافظہ سے پھر نقل اُن کی ممکن ہے۔" [۲]

مولانا کا اخلاق نہایت وسیع تھا۔ سرسید لکھتے ہیں: "ان سب کمال و فضیلت پر خلق و حلم احاطۂ تقریر سے افزوں ہے۔" [۳] مولانا نے ۱۲۶۷ھ کو وصال فرمایا۔ آپ کا مزار مقبرہ شاہ ولی اللہ میں ہے۔ [۴] آپ کے صاحبزادے مولوی محمد یعقوب صاحب (المتوفی ۱۳۰۲ھ) نے مدرسۃ العلوم

---

[۱] تذکرۃ الخلیل (مطبوعہ میرٹھ) ص ۹۔ [۲] و [۳] آثار الصنادید ص ۱۲۷ [۴] واقعات۔ ج ۲ ص ۵۸۴۔

دیوبند کے ابتدائی دور میں صدر مدرسی کی خدمات انجام دیں۔ آپ کی صاحبزادی بی مبارک النسا مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی والدہ تھیں [1]

میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی (۱۲۲۰-۱۳۲۰) سید نذیر حسین صاحبؒ، حدیث کے مشہور عالم تھے انھوں نے مولوی عبدالخالق، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے استفادہ کیا تھا۔ حدیث و تفسیر شاہ محمد اسحاقؒ سے پڑھی تھی، تیرہ برس تک اُن کی خدمت میں رہ کر فیوض و برکات حاصل کئے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں " مولوی صاحب بہت صاحب استعداد ہیں۔ خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقران سے گوئے سبقت لے گئے ہیں " [2] لیکن فقہ سے اُن کی دلچسپی زیادہ عرصہ تک نہ رہی۔ ۱۲۷۰ھ کے بعد آپ نے قرآن و حدیث کے درس کے علاوہ کسی طرف رُخ نہ کیا۔ انھوں نے فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے قرآن و حدیث سے براہِ راست استفادہ کرنے پر زور دیا۔ اور اس طرح سے ایک نیا سلسلہ اہلِ حدیث کا شروع ہوا " اس سلسلہ میں توحید خالص اور رد بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہِ راست کتب حدیث سے بقدرِ فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ پیدا ہوا " [3]

مولانا سید نذیر حسین صاحب کے ذریعہ سے اہلِ حدیث کے سلسلہ کو بڑی ترقی ہوئی۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے لکھا ہے " سارے ہندوستان اور نیز ہندوستان کے باہر بھی یمن، نجد، سنوس، اندلس، افغانستان، کشمیر، خراساں، کاشغر، ہرات، جاوا تک آپ کے ہزارہا شاگرد پھیلے ہوئے ہیں " [4] ہندوستان میں تو ان کے شاگردوں نے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اپنے طریقہ کی اشاعت کی۔ [5]

---

[1] تذکرۃ الخلیل ص ۱۱۰-۱۰۹۔ [2] آثار الصنادید ص ۱۱۰۔ [3] حیاتِ شبلی ص ۴۶-۴۵
[4] واقعات ج ۲ ص ۲۵۹۔ [5] اُن کے بعض مشہور تلامذہ کیلئے دیکھئے حیاتِ شبلی ص ۴۷-۴۶۔

مولانا کا یہ معمول تھا کہ روزانہ نمازِ فجر کے بعد مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمۂ قرآن کے دو تین رکوع سب کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد حدیث شریف کا درس شروع ہوتا تھا۔

مولانا نے چند رسالے اپنی تصانیف میں چھوڑے ہیں۔ معیار الحق۔ واقعۃ الفتوی، واقعۃ البلوی، ثبوت الحق الحقیق، فلاح الولی باتباع النبی، ابطال عمل المولد، وغیرہ۔

مولانا کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ سارے شہر میں اُن کی عزت تھی، لوگ میاں صاحب کہتے تھے اور اُن سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں آپ نے وصال فرمایا اور رشیدی پورہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کئے گئے۔ ان کی سوانح "الحیاۃ بعد المماۃ" اور "حسرت العالم بوفاۃ محدث العالم" ہیں۔

مولوی محبوب علی صاحبؒ | مولوی محبوب علی صاحبؒ علم حدیث و فقہ کے بڑے جید عالم تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تحصیلِ علم کیا تھا۔ اور اُن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مسائل جزویہ پر مہارت تھی۔ ۱۲۷۰ھ میں وصال فرمایا اور چونسٹھ کھمبہ بیرون ترکمان دروازہ سپرد خاک کیے گئے[1]

مولوی نصیر الدین صاحبؒ | مولوی نصیر الدین صاحبؒ مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے شاگرد تھے علوم دینی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ مرجع عوام و خواص تھے۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ لیکن اعلائے کلمۃ الحق میں نہایت بے باک تھے۔ جب بالاکوٹ کے تاریخی مقام پر سید صاحب شہید ہوگئے تو اُن کی جماعت کے باقی ماندہ لوگوں نے آپ ہی سے بیعت کی تھی۔[2]

مولوی نصیر الدین صاحب میں اگر ایک مجاہدانہ اور سرفروشانہ جذبہ کارفرما تھا تو دوسری طرف عبادت کا یہ عالم تھا کہ چہرۂ مبارک پر کثرتِ گریہ سے سیاہ نشان پڑ گئے تھے۔ ان کا اخلاق نہایت وسیع تھا۔ مریدوں اور شاگردوں تک سے انتہائی اخلاق سے پیش آتے[3]

---

۱ مزارات اولیاء دہلی ص ۱۵۹۔ ۲ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۵۷۔ ۳ شمائم امدادیہ ص ۲

ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے والد ماجد علیل ہوئے اور حاجی صاحب کو تیمار داری کیلئے وطن طلب کیا گیا۔ حاجی صاحب مولانا سے اجازت لینے کے لئے گئے۔ جب حاجی صاحب چلنے لگے تو مولانا مدرسہ شاہ محمد اسحٰق سے ان کے مکان تک جو کافی دور تھا رخصت کرنے کے لئے آئے۔ حاجی صاحب نے ہر چند روکا لیکن قبول نہیں کیا۔ جب واپس جانے لگے تو حاجی صاحب بپاسِ ادب پہنچانے کے لئے مدرسہ تک آئے۔ حاجی صاحب جب واپس ہونے لگے تو مولانا پھر ان کو رخصت کرنے کے لئے مکان تک آئے۔ تین مرتبہ اسی طرح ہوا تو حاجی صاحب اس مجسمۂ اخلاق کے قدموں پر گر پڑے [۱]

مولانا آخون شیر محمدؒ | مولانا آخون شیر محمدؒ افغانستان کے رہنے والے تھے۔ تحصیلِ علم کے لئے دہلی آئے تھے۔ شاہ عبد القادر صاحبؒ کے تلمیذ رشید اور شاہ محمد اسمٰعیل صاحبؒ کے ہم سبق تھے۔ توکل و قناعت کا یہ عالم تھا کہ ایک نیمہ میں گذر اوقات کرتے تھے۔ حکیم غلام حسن خاں کے مکان پر قیام رہتا تھا۔ اور وہیں شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ فیضِ باطن شاہ غلام علی سے حاصل کیا تھا۔ آخر عمر میں درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا تھا اور صرف قرآن پاک کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ آپ اپنے شاگردوں کو تقوی کی خاص ہدایت فرمایا کرتے تھے جو کوئی آپ کی مجلس میں غیبت کرتا اس پر جرمانہ کیا جاتا تھا [۲]

آخر عمر میں ہندوستان کو دار الحرب خیال کر کے یہاں کی سکونت کو مکروہ تصور کرنے لگے تھے۔ اور حرمین الشریفین کی طرف چل دیئے تھے۔ لیکن ابھی ملتان تک ہی پہنچے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ کے صدہا خلفا تھے [۳] میر طالب علی المشتہر بہ مولوی عبد الغفار، سید عبد اللہ مغربی،

---

[۱] مزارات اولیاء دہلی ص ۱۵۱۔ [۲] [۳] مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۵۸۔

ملا پیر محمد، ملا گل محمد، مولوی محمد جان، محمد عظیم، شیخ خلیل الرحمن وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

ان علماء کے علاوہ اس زمانہ میں دلی میں اور بہت سے بزرگ تھے جن کے علمی تبحر اور اور تقدس نے دلی کو رشکِ بغداد و مصر بنا دیا تھا۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے شمع علم کے پروانے دلی میں جمع ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت کی تجہیز و تکفین کے آخری منازل طے ہو رہے تھے۔ علمی دنیا میں رونق آرہی تھی۔ مولوی عبدالخالق صاحب کے علم و فضل تقویٰ دیانت کا تمام ملک میں شہرہ تھا۔ مولانا کریم صاحب، مولانا فضل امام صاحب، مولانا فضل حق صاحب، مولانا نورالحسن صاحب، مولوی کرامت علی صاحب، مفتی رحمت علی خاں عرف میر لال، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، حاجی محمد، ملا سرفراز اپنے فن میں یگانہ تھے۔ ان کی موجودگی نے دلی کو زوال کے زمانہ میں وہ عظمت و شوکت بخشی تھی کہ ہندوستان کی عزت و شہرت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ سارے ملک کا ادبی مرکز دلی تھی یہاں علم و عرفان کی پیاس بجھانے والے یہ جید علماء اپنے اپنے فن میں وحیدِ عصر اور یگانۂ روزگار تھے۔

مذہبی اور روحانی دنیا سے قطع نظر سینکڑوں شعرا، حفاظ، اطبا، دہلی میں موجود تھے۔ مومن و غالب کی دلی، غدر سے پہلے ہی کی دلی تھی۔ قاری قادر بخش، حافظ احمد، قاری محمد بیگ کی دلکش قرارت، غدر سے پہلے ہی، دلی کے منبر و محراب نے سنی تھیں۔ اب تو یہ

لے سکے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

(حالی)

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے لکھے ہوئے قرآن کریم

از جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ڈی۔لٹ (پیرس)

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی (۱۵-۱۸ نومبر ۴۶ء) کی نمائش میں راقم کو بھی حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ اس اہم نمائش کی خوبیاں ماہرین تعلیم یا معلم ابتدائی و ثانوی تعلیم اور ان کے علاوہ ماہرین فنون لطیفہ اسلام کے لئے بیشمار ہیں جن پر الگ مضمون درکار ہے مگر فی الحال مجھے یہاں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے کیونکہ اس غلط فہمی کی بنا پر ناواقف حضرات ہی نہیں بلکہ بعض پڑھے لکھے لوگوں سے بھی اکثر سننے میں آتا ہے کہ انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر کا لکھا ہوا قرآن کریم دیکھا ہے یا ان کے کتب خانہ میں ہے جو بالکل بے بنیاد دعوے ہیں۔

اس نمائش میں ہمارے ایک بزرگ خان بہادر نے قرآن کریم کے دو قلمی نسخے پیش کئے ایک کے ساتھ "قرآن کریم قلمی یاقوت مستعصمی" اور دوسرے کے ساتھ "قرآن کریم شاہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ" عبارتیں لکھکر آئینہ دار الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اول الذکر پر تو پھر کبھی عرض کرونگا مگر فی الحال موخرالذکر پر عوام کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کچھ عرض کرتا ہوں۔

مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جو تاریخ دانی کے لئے بھی مشہور ہے اس طرح کے ادعا کی کیسے جرارت کرسکتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی ذاتی تاریخ عہد کی روشنی میں اس ضمن میں چند الفاظ لکھے جائیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نسخہ قرآن کریم کے آخر میں کچھ عبارت عربی میں اورنگ زیب کی اپنی لکھی ہوئی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے

اور وہ صرف و نحو کے اعتبار سے غلط ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے اس نے غلط عبارت تحریر کی ہو اور یہ قرآن ضرور اسی کا ہے، یہ امر بے حد تعجب و حیرت کا باعث ہے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے متعلق یہ امر بغیر کسی تاریخی ثبوت بہم پہنچانے کے مسلم ہے کہ وہ سب سلاطینِ مغلیہ میں زیادہ عالم فاضل تھا تاہم اس کے عہد کی تاریخ "عالمگیر نامہ یا ماثرِ عالمگیری" کی طرف رجوع کرنا چاہئے چنانچہ محمد کاظم مولف عالمگیر نامہ[1] رقمطراز ہے:۔

"از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالاتِ قدسیہ وہبیہ گشتہ تتبع علوم دینیہ از حدیث و تفسیر عربیہ و فقہ شریف حنفیہ است۔ و بسیاری از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چوں احیاء العلوم و کیمیائے سعادت و دیگر تصانیف عرفا و اکابر و رسائل و ملفوظات علماء باطن و ظاہر بمطالعہ ہمایوں رسید، حل معضلات و کشف اسرار آں فرمودہ اند۔ و بالفعل نیز بعد فراغ از نظم مہام سلطنت و سروری و تمہید مراسم دین پروری و عدالت گستری باین شرائف اشغال پیوستگی دارند"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کے ذاتی کسبی کمالات میں علوم دین از حدیث و تفسیر عربیہ و فقہ شریف حنفیہ تھے اور بہت سی کتب اخلاق پر مثلاً احیاء العلوم و کیمیائے سعادت وغیرہ کا مطالعہ امور سلطنت سے فارغ ہو کر کرتے تھے ان میں دیگر تصانیف اکابر علماء باطن و ظاہر از قسم رسائل ملفوظات بھی شامل تھے۔

اسی طرح آگے چل کر یہی محمد کاظم حفظ قرآن کریم کے ضمن میں رقمطراز ہے:۔

"توفیق حفظ تمام کلام مجید ربانیست۔ . . . و فہم اسرار و نکات آں بر لوحِ حافظ اشرف کہ لوحِ محفوظ اسرار غیبی است مرتسم گشت چنانچہ تاریخ شروع آں حفظ شریف را

---

[1] عالمگیر نامہ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء ص ۱۰۹۱۔

حروف کریمہ" سنفرنک فلاتنسی" بحساب جمل پردہ از رخ می کشاید و تاریخ اتمامش
از اعداد" لوح محفوظ" جلوہ ظہور می نماید۔

یعنی بقول مورخ آپ کو امورِ سلطنت سے اول اول وقت کم ملا جس کی وجہ سے کلام پاک کو سلطنت سنبھالنے سے پیشتر حفظ نہیں کر سکے چنانچہ بعد جلوس بر اورنگ سلطنت حفظ قرآن کریم کی طرف توجہ کر کے تھوڑے سے عرصہ میں حفظ کیا اور قرآن کریم کے الفاظ " سنفرنك فلا تنسیٰ" سے شروع کرنے کی تاریخ نکلتی ہے جو قریب ۱۰۷۱ھ کے مطابق ہیں اور اسی طرح تاریخ اختتام بحساب جمل قرآن کے الفاظ " لوح محفوظ" سے نکلتی ہے جو ۱۰۷۵ھ کے مطابق ہے۔ اس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کو کس قدر علوم دین اور قرآن کریم سے شغف تھا اس سے اس کی عربی دانی کا بھی تصور ہو جاتا ہے جو نہایت اعلیٰ معیار پر تھی پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ غلط عربی عبارت تحریر کرے جو بالکل بے بنیاد بہتان ہے۔

اس کے بعد ہم جب اورنگ زیب عالمگیر کے حسنِ تحریر خط کی طرف توجہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ استادان اقلیم سبع اس تک رسائی نہیں کر سکتے تھے آپ کا خط نسخ یاقوت (مستعصمی) اور (عبداللہ) صیرفی کے خط نسخ کا مقابلہ کرتا تھا وہ پختگی، خوبصورتی اور متانت و کمال کے اعتبار سے اپنا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ مشہور ہے کہ قرآن مجید کی کتابت اورنگ زیب عالمگیر کا ایک نہایت محبوب مشغلہ تھا۔ اور اس کی یہ عادت اس قدر مشہور ہوئی کہ عام طور پر بیان کئے جانے لگا کہ اورنگزیب قرآن لکھکر روزی کماتا تھا اور مکہ مکرمہ ارسال کرتا تھا جس سے اس کے صاحب ریاضت ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس ضمن میں مورخین[۵] کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

" در ایام میمنت انجام بادشاہزادگی مصحف مجید بخط مبارک صورت اتمام دادہ آں را

۵؎ عالمگیر نامہ۔ ص ۱۰۹۳-۱۰۹۲۔ و مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۳۸۹-۳۸۸

با دیگر شرائف تحف در غائب و مبلغی خطیر بہ رسم نذر و آئین نیاز بمکہ معظمہ و کعبہ مشرفہ زاد اللہ قدرا و جلالتہ فرستادند"

بعد جلوس بر سریر سلطنت تھوڑے عرصہ میں اور قرآن کریم تحریر کئے۔

"دراندک وقتے بدستیاری تائید و مددگاری بخت سعید جلدے دیگر از مصحف مجید باتمام رسانیدہ . . . . . .

"قرآن مجید بخط اقدس کہ مبلغ ہفت ہزار روپیہ و جدول و جلد آں صرف شدہ بمدینہ منورہ مرسل شدہ"

یعنی عالمگیر نے قبل سلطنت قرآن مجید کا ایک نسخہ لکھکر مکہ معظمہ ارسال کیا اور تخت نشینی کے بعد قرآن لکھے، ان کو مدینہ منورہ ارسال کیا۔ مبلغ سات ہزار روپیہ ان کی جلد بندی اور جدول کی زیب و زینت میں صرف فرما کر مدینہ منورہ حرم نبوی صلعم کے اندر بطور نذر رکھا دیئے۔ . . . . . . ان معاصر مورخین کی تحریروں سے اورنگ زیب عالمگیر کے حسن مذاق خطاطی اور پھر اس پر زر کثیر خرچ کرکے اس کو مزین کرنا اس بات کی بھی تردید کرتا ہے جیسا کہ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ وہ فنون لطیفہ کے صحیح مذاق سے عاری تھا بلکہ اس کی عام دلفریبی کا اس کو پورا احساس تھا۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیوں پڑھے لکھے لوگ اورنگ زیب عالمگیر کے لکھے ہوئے قرآن کریم کہہ کر دوسروں کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں جبکہ اس کے لکھے ہوئے قرآن کریم کے نسخے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے لوگوں کے تلاوت کے لئے وہاں پہنچ چکے ہیں اور وہاں بھیجے ہوئے مطلا و مذہب نسخوں کے کبھی پھر ہندوستان واپس آنے کی شہادت تک بھی نہیں ملتی۔

اب رہے قرآن کریم کے وہ نسخے جو آج مختلف لوگوں کے پاس یا بعض کتبخانوں میں موجود ہیں اورنگ زیب عالمگیر کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں تو متذکرہ بالا بیان کی روشنی میں تاریخی حیثیت

وہ صحیح ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے ہاں یہ ممکن ہو کہ ان دو تین قرآن کریم کے نسخوں کے علاوہ جو مکہ و مدینہ ارسال کیے گئے تھے عالمگیرؒ نے کچھ اور قرآن بھی لکھے ہوں اور وہ لوگوں کے پاس ہوں اور ان پر آج دستخط وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ اس دعوے کی تردید میں ہم اورنگ زیب عالمگیرؒ کا اپنا ایک رقعہ پیش کرتے ہیں جو بنام شہزادہ ہے اور آخر ایام کا ہی معلوم ہوتا ہے، اس واقعہ سے بالوضاحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے یک دو" قرآن کریم صرف رضائے الٰہی حاصل کرنے کیلئے لکھے تھے اور اسی وجہ سے اس نے ان پر تاریخِ کتابت اور اپنا نام تک نہیں لکھا تھا رقعہ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

"..... چہ بنویسم وچہ بگویم خجالت و انفعال ایں نام بدنامے گفتہ تا نوشتن اسم برسم آں برسم اولی وانسب۔ من یک دو مصحف کہ نوشتہ ام نام نوشتہ ام تاریخ ہم نوشتن درکار نیست۔ اگر برائے او سبحانہ نوشتہ اند علم او حسبی وکفی . . ."

اورنگ زیب عالمگیر کا یہ رقعہ رقعاتِ عالمگیری کے اس نسخہ میں درج ہے جو میری ملکیت میں ہے اور جس پر "کلمات طیبات" لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کی تقطیع چھوٹی ہے اور اس رقعہ کا نمبر ۱۴۳ سرخ سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ رقعہ رقعاتِ عالمگیری کے دوسرے مجموعوں میں بھی مل جائے اب اس متذکرہ بالا بیان کے بعد جس کو معاصر مورخین کی تحریروں کے علاوہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی اپنی ذاتی تحریر سے واضح کردیا گیا ہے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ عالمگیر نے قرآن کریم ضرور لکھے لیکن ان کو مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ ارسال کردیا گیا اور ان پر نام و تاریخ نہیں لکھے گئے۔ امید ہے اب لوگ اس کی طرف کسی قرآن کے نسخہ کو منسوب کرنے سے اعراض کریں گے۔

یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اورنگ زیبؒ کی علمی فضیلت اور عربی و فارسی میں اس کی مہارت کا اعتراف ہندو مورخین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ عہد عالمگیری کے نامور مورخ سر جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں۔

"اورنگ زیب عربی اور فارسی ایک فاضل ومحقق کی طرح بولتا اور لکھتا تھا"

(History of Aurangzib Based on Original Sources. R4)

پس ارباب نظر خود انصاف کریں کہ قرآن مجید کے کسی نسخہ کو عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا اقرار دینا۔ حالانکہ ختم قرآن پر جو عربی عبارت عالمگیر کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور جس کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ خود بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ عربی نحو وصرف کے قواعد کی رو سے غلط ہے۔ کیونکر قرین انصاف اور لائق قبول ہو سکتا ہے۔

فیض الباری

(مطبوعہ مصر)

فیض الباری نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کی مشہور ترین اور مایۂ ناز کتاب ہے، شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ جو اس صدی کے سب سے بڑے محدث سمجھے گئے ہیں فیض الباری آپ کی سب سے زیادہ مستند عظیم الشان علمی یادگار ہے۔ جسے چار ضخیم جلدوں میں دل آویزی و دل کشی کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ مصر میں بڑے اہتمام سے طبع کرایا گیا ہے فیض الباری کی حیثیت امام مرحوم کے درس بخاری شریف کے امالے کی ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص مولانا محمد بدر عالم صاحب رفیق ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑی قابلیت، دیدہ ریزی اور جانکاہی سے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریروں کے علاوہ فاضل مؤلف نے جگہ جگہ تشریحی نوٹوں کا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب کی افادی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ مکمل چار جلدوں کی قیمت سولہ روپے

مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

انڈونیشیا میں سیاسی کشمکش

جناب مظفر شاہ خلق صاحب ایم۔اے

ایشیا اپنی گہری نیند سے جاگ چکا ہے اور اس میں نئی زندگی کی لہر دوڑتی دکھائی دیتی ہے
ایشیا کی سب چھوٹی بڑی قومیں اپنے آزاد مستقبل کے لئے بے چین ہو رہی ہیں۔ اور ان کے دلوں میں
آگے بڑھنے اور دنیا کی عام ترقی میں برابر کا حصہ لینے کی آرزوئیں تڑپ رہی ہیں اور وہ مغربی اثر و اقتدار
کا جوا اتار کر اپنی آزادی اور خود مختاری کے جائز حق کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مشرق بعید سے لے کر
مشرق وسطیٰ تک ہر جگہ ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ حالات کا رخ بدلا ہوا نظر آرہا ہے، مغربی
شہنشاہیت کے بادل چھٹتے جاتے ہیں اور آزادی کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مشرق کے
افق پر نکلتا آرہا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا میں جن ملکوں نے بیرونی اقتدار کے خلاف جدوجہد شروع کی، ان
میں انڈونیشیا پیش پیش ہے، انڈونیشیا میں بڑی تیزی سے قومی تحریک نے زور پکڑا اور اپنی آزاد و
خود مختار جمہوریت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

انڈونیشیا میں کوئی تین ہزار سے زیادہ جزیرے شامل ہیں۔ جن میں جاوا اور سماترا دو خاص
جزیرے ہیں، جغرافیائی اعتبار سے یہ جزیرے دنیا میں سب سے خوبصورت اور مالدار جزیرے گنے جاتے
ہیں، کیونکہ یہ قدرتی خزانوں سے مالا مال ہیں۔ ساری دنیا کی مختلف پیداوار میں انڈونیشیا کا جو حصہ ہے

ان کا فیصدی حساب یہ ہے، کونین ۹۱ فیصدی، ربڑ ۴۰ فیصدی۔ تانبہ اکیس فیصدی۔ چائے انیس فی صدی، کوکو انتیس فی صدی۔ ٹین بیس فیصدی۔ سیاہ مرچ بانوے فیصدی۔ تمباکو پچاس فیصدی، شکر پچیس فی صدی اور کپاس اکہتر فیصدی۔ لیکن قدرت کے ان بیش بہا خزانوں میں انڈونیشیا والوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اب تک ان کا یہی کام رہا کہ اپنے ملک کی دولت سے دنیا کو فائدہ پہنچائیں اور خود مصیبت کی زندگی گذاریں، خود بھوکے ننگے رہ کر اپنے آقاؤں کی سرمایہ داری کو فروغ دیں۔ انڈونیشیا کی عام زبوں حالی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہاں کی تقریباً ستر فیصدی آبادی کا گذارہ چاول کی معمولی کاشت پر ہے۔ ان میں بہت سے لوگ صرف مچھلیاں پکڑ کر یا جانوروں کا شکار کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں، پیالہ بھر چاول اور مچھلی کا شوربہ ان کی عام غذا ہے۔ ان لوگوں کی سالانہ آمدنی کا اوسط کوئی تین پونڈ یا چالیس روپے ہے، تیس فیصدی باشندے لڑائی سے پہلے تیل کے کنووں، بڑے بڑے باغیچوں اور کانوں میں معمولی مزدوروں کی طرح کام کیا کرتے تھے ان لوگوں کی آمدنی کا اندازہ کوئی ۱۳ پونڈ یا ۱۷۵ روپے سالانہ ہے۔ غرض دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ قدرتی دولت انڈونیشیا والوں کے لئے مصیبت کا سامان بن گئی۔ سرمایہ دار قوموں نے ان سرمایہ دارانہ غرضوں کے لئے انڈونیشیا میں قدم جمائے اور رفتہ رفتہ سیاہ وسفید کی مالک بن بیٹھیں۔

سب سے پہلے سولہویں صدی کے شروع میں پرتگالیوں نے انڈونیشیا کی سرزمین پر قدم رکھے، اس کے بعد دوسری یورپی قوموں کی آمد کا تانتا بندھ گیا اور یکے بعد دیگرے، اسپینی، فرانسیسی، ڈچ اور انگریز پہنچتے رہے۔ پہلے پہل تو انڈونیشیوں نے ان لوگوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا کیونکہ ان کے ذریعہ انڈونیشیا کی تجارت اور کچے مال کی کھپت کے راستے کھل گئے لیکن ان قوموں نے پنجے جما کر ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے تو انڈونیشیوں کی آنکھیں کھلیں اور ان میں قومیت کا جذبہ بیدار ہوا۔

اور وہ بیرونی طاقتوں کے خلاف متحد ہونے لگے۔ اس بیداری نے آئندہ سیاسی تحریک کے لئے راستہ ضرور تیار کیا۔ لیکن انڈونیشیا کی باقاعدہ "قومی تحریک" نئے دور کی پیداوار ہے اس سے پہلے وہاں کسی باقاعدہ سیاسی تحریک کا وجود نہ تھا۔ قومی امنگیں بیدار ضرور ہو چکی تھیں مگر انھوں نے کوئی واضح صورت اختیار نہیں کی تھی۔

انڈونیشیا کی پہلی منظم تحریک کی ابتدا بیسویں صدی کے شروع میں ہوئی، ۱۹۰۵ء میں روس کے خلاف جاپان کی فتح اور جاپان کی نئی زندگی، ۱۹۱۲ء میں چینی جمہوریت کا قیام، ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب اور فلپائن اور ہندوستان کے دوسرے واقعات، پھر خود انڈونیشیا کی اندرونی بیداری، ان سب چیزوں نے مل جل کر انڈونیشیا کی قومی تحریک پر اچھا اثر ڈالا اور وہ روز بروز زور پکڑتی چلی گئی۔ اس طرح انڈونیشیا والوں کی ہمت بندھی اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی۔ غیر ملکیوں کے ہاتھوں انڈونیشیوں کو جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اس سے بھی اُن میں سیاسی شعور پیدا ہوا، غرض اندرونی اور بیرونی حالات کچھ اس طرح بدل چکے تھے کہ ان کا نتیجہ قومی بیداری کی صورت میں ظاہر ہونا لازمی تھا۔

سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں "شرکیت ڈاگنگ اسلام" کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم ہوا اور اس کے بعد اسی قسم کی اور بہت سی جماعتیں فلاح و بہبودی کے لئے قائم ہوتی رہیں اس وقت تک ان جماعتوں کا براہِ راست سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کا پہلا مقصد یہ ہی تھا کہ انڈونیشیا کی قومی تجارت کو بڑھایا جائے اور عام لوگوں کی اقتصادی حالت سدھاری جائے لیکن جوں جوں سیاسی بیداری پھیلتی گئی، ان جماعتوں کا رخ بھی بدلتا گیا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں "شرکیت ڈاگنگ اسلام" کا نام بدل کر "شرکیت اسلام" رکھا گیا اور پھر اس میں دوسری اسلامی جماعتیں بھی شامل ہوگئیں،

شرکیتِ اسلام کے ماتحت پہلی قومی کانگرس جولائی ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ اس کانگریس میں شرکیتِ اسلام کو ایک مستقل سیاسی جماعت کی حیثیت دیدی گئی اور انڈونیشیا میں خودمختار حکومت اور آزاد ریاست کا قیام اس کا مقصد قرار پایا، سال بھر بعد یعنی ۱۹۱۷ء میں مکمل آزادی، اس کا نصب العین بن گیا اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سیاسی جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس وقت انقلاب کی بجائے تدریجی اصلاح کا راستہ مناسب سمجھا گیا۔ چنانچہ "شرکیت اسلام" اور دوسری پارٹیوں کی طرف سے حکومت کے کام میں زیادہ سے زیادہ اختیار دینے کا مطالبہ کیا جانے لگا اور سب جماعتیں پارلیمانی طریقوں کو اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھنے لگیں۔

بالآخر مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۸ مئی ۱۹۱۸ء کو حکومت کی طرف سے VolksRAD کے نام سے ایک مجلس منتظمہ قائم کی گئی، اور اس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندے شامل کئے گئے، لیکن آگے چل کر انڈونیشیوں کو پتہ چلا کہ آئینی طریقوں سے وہ کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکے اب انھوں نے VolKSRAD سے باہر آکر براہِ راست تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح انڈونیشیا کی جنگ آزادی کا انقلابی دور شروع ہوا۔

انڈونیشیا میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیانی حصہ میں کمیونسٹ اثرات کو کافی فروغ ہوا غریب اور امیر کی کشمکش کی ابتدا تو پہلے ہی ہو چکی تھی، سب سے پہلا اسٹرائک ۱۹۱۲ء میں SoeraKarta میں ہوا۔ پھر ۱۹۱۷ء کے بعد سے انڈونیشیا کے سارے بڑے شہروں میں اسٹرائک ہونے لگے اور مزدوروں کی تحریک شروع ہوگئی، جگہ جگہ مزدوروں کی جماعتیں بننے لگیں اور انھوں نے اپنے مطالبات کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کردی۔ اب تو سارے انڈونیشیا میں اسٹرائک کی ہوا پھیل گئی اور حکومت کی طرف سے سخت قسم کی جوابی کارروائی ہونے لگی۔

انڈونیشیا کے جو نوجوان باہر تعلیم پارہے تھے، انھوں نے بھی آزادی کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی، ان لوگوں نے وطن واپس آکر انڈونیشیا کی سب سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی، پھر انھوں نے اپنی ایک قومی جماعت بھی بنائی، جس کا نصب العین انڈونیشیا کی "مکمل آزادی" رکھا گیا، اس پارٹی کے قیام کے بعد سے انڈونیشیا کی قومی تحریک میں اور جان آگئی، دوسری طرف ڈاکٹر سوکارنو اپنی متواتر کوششوں کے بعد انڈونیشیا کی تمام جماعتوں کو ایک جھنڈے تلے اکھٹا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور سب جماعتوں کا ایک وفاق (فیڈریشن) قائم ہوگیا۔ اب یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ جب تک عوام کی طرف سے پرزور متفقہ آواز نہیں اٹھائی جائے گی۔ اس وقت تک کسی قسم کی آئینی تبدیلی ممکن نہیں، چنانچہ اب انڈونیشیا کی سیاسی تحریک کا ایک نیا دور شروع ہوا اور عدم تعاون کی بجائے تعاون کے ساتھ قومی امنگوں کو پورا کرنے کی کوشش ہونے لگی۔

۱۹۳۹ء میں جب دنیا نے ایک نئی کروٹ بدلی اور چاروں طرف جنگ کے خوفناک بادل منڈلانے لگے۔ تو انڈونیشیا میں بھی عام بے چینی پیدا ہوئی، ۲۱ مئی ۱۹۳۹ء کو تمام سیاسی پارٹیوں کی کانفرنس بلائی گئی تاکہ ایک مشترک قومی محاذ قائم کیا جائے۔ اس کانفرنس نے ایک ایسی پارلیمنٹ کے قیام کا بھی مطالبہ پیش کیا۔ جس کے سارے ممبر عوام کے چنے ہوئے ہوں ساتھ ہی ایک قومی حکومت بھی بنائی جائے جو اس پارلیمنٹ کو جوابدہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انڈونیشیا والوں میں قومی شعور بڑھ جائے گا اور وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ انڈونیشیا کے دفاع کی کوشش کریں گے، جس سے ملک کی دفاعی حیثیت بہت مضبوط ہو جائے گی کیونکہ جب کسی قوم میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں دبا سکتی۔ انڈونیشیا میں جگہ جگہ اس جائز مطالبہ کی تائید و حمایت کی گئی۔ خاص کر نوجوانوں نے بڑے پُرجوش طریقہ پر

اس کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ اس وقت انڈونیشیا کا نوجوان طبقہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور قومی ترقی کے لئے متحد ہو کر کام کر رہا تھا۔ ڈچ حکومت نے نازک حالات کو سوجھ بوجھ کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور انڈونیشیا کے اس متفقہ مطالبہ کو نامنظور کر دیا۔

۱۰ رمئی ۱۹۴۰ء کو جرمن فوج نے ڈچ نازیوں کی مدد سے ہالینڈ پر حملہ کیا اور ڈچ حکومت اس حملہ کی تاب نہ لا سکی اور اس نے بھاگ کر انگلستان میں پناہ لی۔ ہالینڈ کی اس شکست کے بعد خود بخود انڈونیشیا سے اس کا تعلق ختم ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ قاعدہ کے مطابق اب انڈونیشیا ایک آزاد ملک تھا، کیونکہ ہالینڈ کی بادشاہت ختم ہو چکی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ حکومت کے سارے اختیارات گورنر جنرل کے ہاتھ میں آ گئے اور اب وہ ملکۂ ہالینڈ کی طرف سے انڈونیشیا کا واحد مختار تھا۔

اس بحرانی دور میں بھی انڈونیشیا کی اندرونی حکومت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی صرف ڈچ حکومت کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ جب ہالینڈ آزاد ہو جائے گا تو انڈونیشیا کی آئینی تبدیلی کے مسئلہ پر غور کیا جائے گا، اس مضحکہ خیز وعدے کا انڈونیشیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور ان کا "خود مختار حکومت" کا مطالبہ روز بروز زور پکڑتا گیا۔

پرل ہاربر کے حملہ کے بعد لندن میں ملکۂ ہالینڈ نے جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اسی دن انڈونیشیا کے گورنر جنرل نے بھی اسی قسم کا اعلان کیا۔ گویا اب انڈونیشیا کو بھی اس کے باشندوں کی مرضی معلوم کئے بغیر لڑائی میں دھکیل دیا گیا۔ انڈونیشیا والے پہلے ہی سے نازیت اور فسطائیت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو خطرے کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اب جو بحرالکاہل میں جمہوریت کے خلاف بھرپور لڑائی چھڑی تو ان کے خطرات اور بڑھے کیونکہ اس وقت لڑائی اُن کے سر پر آ گئی تھی۔ جب جاپانی فوجیں انڈونیشیا پر بڑھیں اس وقت

انڈونیشیا کے بے تاج بادشاہ ڈاکٹر سوکارنو، ساترا، میں قید تھے، ڈچوں سے کہا گیا کہ ایسے موقع پر ڈاکٹر سوکارنو کو فوراً چھوڑ دیا جائے، تاکہ وہ پوری قوم کو جاپانیوں کے خلاف تیار کرا سکیں، اور جاپانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے، لیکن ڈچوں کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ اور ڈاکٹر سوکارنو جاپانیوں کی آمد تک قید میں پڑے رہے۔

۱۹ اردسمبر ۱۹۴۲ء کو جاپانیوں نے بورنیو کے علاقے پر بمباری کی۔ اس کے بعد کئی جگہ خوفناک جنگ ہوئی، انڈونیشیوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جاپانیوں کا مقابلہ کیا اور زبردست خونریزی ہوئی لیکن جاپانی اپنی فوجی اکثریت اور بڑی طاقت کی وجہ سے غالب آئے اور سارے انڈونیشیا پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس پر بھی انڈونیشیوں نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ ان کے دلوں میں آزادی کا جذبہ اور بھڑک اٹھا، وہ اب بھی جاپانی شہنشاہیت کے خلاف لڑنے کو تیار تھے۔

جاپانیوں کو انڈونیشیا کی قومی تحریک کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا اسی لئے وہ انڈونیشیا کا اندرونی انتظام انڈونیشیوں کو سپرد کرنے پر تیار ہو گئے۔ اور ایک عارضی حکومت بنا دی گئی دراصل اس وقت جاپانی یہ چاہتے تھے کہ اپنی جنگی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے انڈونیشیا کے قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھائیں۔ اور یہاں کے لوگوں سے اپنا کام لیں۔ اسی لئے انھوں نے انڈونیشیوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ انڈونیشیا کے دفاع کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں لیکن انڈونیشی جاپانیوں کے اس فریب میں آنے والے نہ تھے، وہ ڈچوں کی طرح جاپانیوں کو بھی اپنی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے، چنانچہ اب انھوں نے جاپانیوں کے چنگل سے آزاد ہونے کے لئے خفیہ تحریک شروع کر دی۔

۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر سوکارنو نے گوریلا فوج تیار کرنے کا کام شروع کیا اور جاپانیوں

کو بتایا کہ ہم اتحادی حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ انتظام کر رہے ہیں اس طرح ڈاکٹر سوکارنو
نے درپردہ جاپانیوں کے خلاف ایک زبردست انقلاب برپا کرنے کا بندوبست کرلیا تھا۔
یوں ظاہرہ طور پر ڈاکٹر سوکارنو نے جاپانیوں سے صرف اس لئے تعاون کر رکھا تھا کہ وہ
آسانی سے ان کے خلاف تیاری کرلیں ورنہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جاپانیوں اور
ڈچوں میں کوئی فرق نہیں۔

۱۹۴۵ء کے شروع میں جاپانیوں کا زوال شروع ہوا اور وہ ہر جگہ اتحادیوں کے مقابلہ
میں پسپا ہونے لگے، جب انڈونیشیوں کو معلوم ہوگیا کہ جاپانی لڑائی ہارتے جارہے ہیں تو انھوں
کھلم کھلا جاپانیوں کو اپنے ملک سے نکالنے کی تحریک شروع کردی، اور سینکڑوں نوجوان اپنے
وطن کی آزادی کے لئے میدان میں آگئے۔

آخر توقع سے پہلے ہی جاپانیوں کے خاتمہ کا دن آپہنچا۔ ۶ر اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشما
پر پہلا ایٹم بم پڑا، اور وہ بالکل بھسم ہوکر رہ گیا۔ دو دن بعد ناگاساکی بھی ایٹم بم کا شکار ہوا، او
اس کے بعد فوراً ہی روس نے بھی جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا، جاپان ان ناگہانی
آفتوں کا مقابلہ نہ کرسکا اور اس نے مجبور ہوکر ۱۵ر اگست ۱۹۴۵ء کو اتحادیوں کے سامنے ہتھیا
ڈالدیئے اور ہار مان لی۔ انڈونیشیوں نے وقت سے پورا فائدہ اٹھایا، ان کے لیڈروں نے
قومی فوج کی مدد سے جگہ جگہ اپنا قبضہ جمانے کی کوشش شروع کردی، ان لوگوں نے بہت
سے ہتھیار اور گولہ بارود بھی چھین کر اپنے قبضہ میں کرلیا۔ دوسری طرف جاپانی افسروں کی انتہا
سختی اور کھلی مخالفت کے باوجود انڈونیشیوں نے ۱۷ر اگست ۱۹۴۵ء کو انڈونیشیا کی آزاد
جمہوریت کا اعلان کردیا۔ ڈاکٹر سوکارنو جمہوریت کے پہلے صدر مقرر ہوئے، ساتھ ہی جمہوری اصول
کے مطابق انڈونیشیا کے آئین کا ایک مسودہ بھی تیار کیا گیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انڈونیشیا میں جمہوریت کا تصور کوئی نیا نہ تھا۔ انڈونیشیا میں صدیوں پہلے سے دیہات میں پنچایتی نظام چلا آرہا تھا اور ہر علاقے کو کچھ نہ کچھ خودمختاری حاصل تھی، ان کی اقتصادی زندگی امدادِ باہمی کے اصول پر مبنی تھی۔

جمہوریت کے اعلان کے فوراً ہی بعد ایک کانفرنس بلائی گئی، جس میں انڈونیشیا کی سب پارٹیوں کے لیڈر شریک ہوئے۔ اور ہر علاقے کے نمایندوں نے حصہ لیا۔ اس کانفرنس کا جلسہ دو دن تک ہوتا رہا۔ کانفرنس میں یہ طے پایا کہ ایک قومی کمیٹی بنائی جائے جو انڈونیشیا کے سارے انتظام کی ذمہ دار ہو۔ گویا یہ ایک ایسی مجلس انتظامیہ بنی جسے ملک کا سارا کاروبار سونپ دیا گیا۔ قومی کمیٹی نے سب سے پہلے انڈونیشیوں کو ہدایت دی کہ وہ اتحادی فوجوں کو ان کا کام نمٹانے میں مدد دیں، کیونکہ اسے امید تھی کہ جتنی جلدی جاپانیوں کو ہٹا کرنے اور اتحادی قیدیوں کو چھڑانے کا کام پورا ہو جائے گا۔ اتحادی فوجیں انڈونیشیا سے چلی جائیں گی۔

۱۹ اگست ۱۹۴۵ء کو قومی کمیٹی کی طرف سے ڈاکٹر سلطان شہریار کو وزارت بنانے کا کام سپرد ہوا، اور انھوں نے ایک باقاعدہ متوازی حکومت قائم کر لی، یہی حکومت صحیح معنوں میں انڈونیشیا کی آزاد اور خودمختار حکومت تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ جب مارچ ۱۹۴۲ء میں ڈچ انڈونیشیا جاپانیوں کو کلیتاً سونپ کر الگ ہو گئے تو پھر انڈونیشیا پر اُن کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ اب ہم نے جاپانیوں سے حکومت چھینی ہے اس لئے ہم خود اپنی قسمت کے مالک ہیں۔

لیکن ڈچ اب بھی انڈونیشیا پر اپنا حق سمجھ رہے تھے، اور دوبارہ اپنی حکومت قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ ساری دنیا میں ان کی اس حرکت کو بری نظروں سے دیکھا گیا، لیکن وہ اپنے سامراجی طریقوں سے باز نہیں آئے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کئے ہوئے تھے کہ اب ساری دنیا کا رنگ بدل چکا ہے۔ دنیا کی ساری دبی ہوئی قومیں ابھر چکی ہیں اور اب انھیں ڈنڈے

کے زور سے غلام نہیں بنایا جا سکتا۔

انڈونیشیوں کو پرچانے کے لئے ڈچ حکومت نے ۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کو ایک نئی اسکیم پیش کی، جس میں مرکزی حکومت کو جمہوری اصولوں پر ترتیب دینے، نسلی فرق ختم کرنے اور انڈونیشیا کو ڈچ سلطنت میں برابر کا درجہ دینے کی تجویزیں رکھی گئی تھیں۔ لیکن ڈاکٹر سوکارنو نے ان تجویزوں کو یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے بعد ڈچوں نے اپنے سامراج کے دوبارہ قیام کے لئے پوری طاقت سے کام لینا شروع کر دیا ان کی جگہ جگہ قوم پرستوں سے ٹکر ہوئی اور انڈونیشیا میں پھر ہتھیار بند لڑائی ہونے لگی۔

اتحادی فوجیں بھی اپنی غیر جانبداری کو نہ نبھا سکیں اور وہ بھی امن انتظام کے نام پر انڈونیشیوں کے خلاف کارروائی کرنے سے نہیں چوکیں، حالانکہ اتحادی فوجوں کے افسر اعلیٰ نے برطانوی فوجوں کے انڈونیشیا میں اترتے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ ہم نہایت ایمانداری سے اپنا کام پورا کریں گے اور اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہ دیں گے لیکن فوراً اس اعلان میں کچھ اور لفظ بھی شامل کرلئے گئے جن کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک امن وامان کی ذمہ داری اُن پر ہے جب تک ڈچوں کی حکومت پوری طرح انڈونیشیا پر دوبارہ تسلط نہ جمالے۔

اسی کشمکش کے زمانے میں انڈونیشی جمہوریت کے نائب صدر ڈاکٹر عطا محمد نے ڈچوں کو نہایت مناسب مشورہ دیا کہ ان تمام جھگڑوں سے بچنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ڈچ انڈونیشی قوم کی آزاد حیثیت تسلیم کرلیں، اس کے بعد دونوں ملکوں میں، تجارتی، اقتصادی اور دوسرے قسم کے تعلقات قائم ہوسکتے ہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ انھیں ڈچوں سے کوئی ذاتی مخالفت نہیں، وہ تو صرف اپنی آزادی چاہتے ہیں، ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے انھیں

ڈچوں سے ہر قسم کے تعلقات قائم رکھنے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن دوبارہ غلامی کے پھندے میں پھنسنے کو کسی طرح تیار نہیں، ان کا نعرہ ہے۔

"دوبارہ غلام بننے سے برباد ہو جانا بہتر ہے۔"

انڈونیشی جمہوریت کے صدر ڈاکٹر سوکارنو نے اتحادی قوموں سے بھی اپیل کی کہ وہ انڈونیشیا کے معاملہ میں دخل دیں اور دونوں ملکوں میں سمجھوتہ کرادیں، ان کا خیال تھا کہ اگر امریکہ، روس اور چین دلچسپی لیں اور بیچ میں پڑکر جھگڑا نپٹانے کی کوشش کریں تو آسانی سے سارے معاملات صاف ہو سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ تک تو ڈچ اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے اور انڈونیشیا میں میدانِ کارزار گرم رہا۔ انڈونیشی تو عزم کرہی چکے تھے کہ کسی صورت میں بھی دوبارہ ڈچ راج قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اسی لئے وہ ہر جگہ جان توڑ کر ڈچوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اپنے پیدائشی حق کے لئے لڑ رہے تھے، ان کا مطالبہ جائز تھا، ان کی آواز جگہ جگہ پہنچی، ساری دنیا اور خاص کر ایشیا میں ان کے مقاصد سے گہری ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور ڈچوں کی جارحانہ کارروائیوں کی سخت مخالفت ہونے لگی۔

بالآخر ڈچوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اب پرانا دور ختم ہو چکا ہے، اور زمانہ کی ہوا بدل گئی ہے، اب قوت کے زور پر کسی چھوٹی سے چھوٹی قوم کو بھی غلام نہیں رکھا جا سکتا، اس لئے انھوں نے انڈونیشی جمہوریت کو تسلیم کرلیا اور سمجھوتہ کی گفتگو شروع کردی، پہلے تو انڈونیشیا کے لفٹیننٹ گورنر جنرل ڈاکٹر فان موک کے ذریعہ سمجھوتے کی بات چیت ہوتی رہی، لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، اس کے بعد ہالینڈ سے ایک کمیشن جنرل آیا اور انڈونیشی جمہوریت کے نمائندوں اور کمیشن کے ممبروں نے باقاعدہ گفت و شنید کے بعد

سمجھوتہ کا مسودہ تیار کرلیا۔ اسی سمجھوتہ کے مطابق ڈچ حکومت نے انڈونیشی جمہوریت کو باقاعدہ تسلیم کرلیا اور طے پایا کہ ڈچ ایسٹ انڈیز کے سب علاقوں کو ایک فیڈریشن کی صورت میں مجتمع کردیا جائے اور اس فیڈریشن کا نام ہو "ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا" اس کے بعد ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا اور ہالینڈ کی سلطنت کو ملا کر ایک یونین بنائی جائے۔ یہ یونین ۱۹۴۹ء تک قائم ہوجانی چاہئے۔ "ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا" کا مشترک آئین بنانے کے لئے ایک نمایندہ اسمبلی کی تجویز بھی رکھی گئی، جس میں فیڈریشن کی سب ریاستوں کے منتخب کردہ نمایندے شامل ہوں۔ دفاع اور اہم بیرونی معاملات دونوں ملکوں کی مشترکہ ذمہ داری میں دیدیئے گئے۔

اقبال اور قسطائیت

از محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ

ڈاکٹر اقبال فلسفی اور شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ وہ شاعر فلسفی ہیں یا فلسفی شاعر۔ اقبال کے وجود میں قدرت نے اس انداز سے فلسفہ وشاعری کو سمویا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا ناممکن ہے۔ اقبال کی شاعری اور فلسفہ دونوں بلند ہیں۔ شاعری فلسفہ کی بدولت اور فلسفہ شاعری کی بنا پر۔

غالب و اقبال | غالب کے بعد ہندوستان میں اقبال ہی ایسا شاعر ہوا جس کی حکیمانہ بصیرت نے ذرہ سے لیکر آفتاب تک کی ہر چھپی اور کھلی حقیقت کا جائزہ لیا اس نے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے گوشے گوشے کو ٹٹولا۔ اس کا طائرِ فکر زمین سے اڑا اور بیک پرواز آسمانوں کی اس نورانی خلوت گاہ تک جا پہنچا جس کے قریب فرشتوں کو بھی پر مارنے کی مجال نہیں۔ یعنی جہاں باطن ظاہر ہے ان بلندیوں پر پہنچکر اقبال نے کہا ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

غالب کی طرح اپنے وسیع خیالات کو لفظی جامہ پہنانے کے لئے اقبال کو بھی اردو کا دامن تنگ نظر آیا۔

اقبال کی شاعری کے تین دور | ڈاکٹر اقبال کا کلام تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں سے پہلا وہ ہے جس میں انھوں نے پرانے مذاق کی تقلید کے ساتھ ایک نئی وضع بھی قائم رکھی۔ دوسرے

حصے میں اس کی اصل طبیعت اور مذاق کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں اور تیسرے دور میں اقبال کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے ان تینوں حصوں کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔

شروع کے کلام میں بعض رجحانات ایسے بھی ہیں جو آخر تک اقبال کے کلام کی خصوصیت رہے اور آخری دور میں بعض جگہ ایسا انداز بھی اس مفکر شاعر نے اختیار کیا جس کا قیاس بھی اس کی اوائل عمری کا کلام پڑھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ پہلا دور تجرباتی تھا جب شاعر کا طائرِ فکر پر تول رہا تھا اور مختلف میدانوں میں اس کا والہانہ تخیل گامزن تھا۔ یہی زمانہ ہے جب ہندوستان کی پست حالت دیکھکر اقبال کے دل میں درد اٹھا اس درد کی پہلی کسک سے "ترانۂ ہندی" "تصویرِ درد" "نیا شوالہ" جیسی دلکش نظمیں شاعر نے لکھیں اور یہ دلی تڑپ بعد میں "شکوہ" میں پورے شباب پر نظر آئی۔ لیکن ادبی نقطۂ نگاہ سے اس دور کی بہترین نظمیں "حقیقتِ حسن" اور "اخترِ صبح" ہیں نظم کا یہ دلرباطرزِ تخیل کی یہ نازک گلکاریاں غالب کے بعد اقبال کو قدرت نے پوری فیاضی سے عطا کی تھیں اور اس وقت بھی جب اس کا دماغ مذہب و فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا اس کا شاعرانہ دل، دلاویز اچھوتے تخیل کے نت نئے کرشمے دکھا رہا تھا۔

اقبال کے کلام کا دوسرا دور جذبۂ ذہنی کی بیداری سے شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانہ تھا، جب شاعر تعلیم کے سلسلے میں یورپ گیا تاریخ و فلسفہ کے مطالعہ اور دنیا کے مشاہدے نے اقبال کو شخصی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کے وہ طریقے بتائے جنہیں معلوم کرنے کی اس کو پہلے آرزو تھی مغربی ممالک کی سیاحت اور وہاں کے مفکرین مدبرین سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد اسلامی دنیا کی پستی اور بیچارگی دیکھکر اقبال کے حساس دل پر ایسی کاری ضرب لگی کہ اس چوٹ کے اثر سے وہ تلملا گیا اس نے بیقرار ہو کر بارگاہ الٰہی میں شکوہ کیا "شمع اور شاعر" "خضرِ راہ" "طلوعِ اسلام"

اقبال کی اسی دل کی چوٹ کی آہیں ہیں۔

جیسے جیسے شاعر کا ذہن خودی اور بے خودی کے فلسفے میں ڈوبتا گیا وہ ایک نئی زبان کی ضرورت محسوس کرتا گیا آخر کار فارسی میں اس نے لکھنا شروع کیا۔ مثنوی اسرار و رموز"۔ پیامِ مشرق" " پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں اقبال نے شخصیت کی تعمیر کے تمام گر بتائے ہیں لیکن فارسی ہو یا اردو اپنے تمام کلام میں سیاسی اور معاشرتی مسائل پر اس نے زیادہ توجہ دی۔ اقبال نے ان مسائل کا جو حل بتایا ہے اس کے پیش نظر اقبال کو فسطائی شاعر کہنا اس پر پرلے درجہ کا ظلم ہے۔ اس کی کئی نظموں میں سرمایہ داری اور ملوکیت مٹانے کی خواہش اور کسان و مزدور کو ظلم سے بچانے کی تمنا ہے لیکن اس کی انقلاب پسندی کسی سر پھرے سوشلسٹ کی بکواس نہیں ہے نہ اقبال کا پاکیزہ دل روس کی سوشلزم سے متاثر تھا وہ تو اس مساوات اور اخوت کا حامی تھا جس کی تعلیم اب سے تیرہ سو سال قبل ہادی برحق حضرت محمد صلعم نے دی تھی۔ جس کی نظیر اس متمدن زمانے میں شرق سے تا غرب نہیں مل سکتی۔

اقبال نے جس خیال کو لیکر شعر کا جامہ پہنایا وہ قرآن پاک تعلیم تھی اشتراکی تصورات نہ تھے۔ اقبال اپنی انقلابی اسپرٹ کے لحاظ سے ایک حد کے اندر رہتا ہے یہ دھوکا چند مسلمان نقادوں کو اس لئے ہوا کہ ان سب نے نہ تو اصل اسلام کو سمجھا ہے اور نہ اقبال کی اصل شاعرانہ عظمت کا ہی جائزہ لیا ہے حالانکہ وہ انسان کی انفرادیت اور خود مختاری کا سب سے بڑا علمبردار ہے کہتا ہے۔

فطرت کو خرد کے روبرو کر — تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
تاروں کی فضا ہے بیکراں — تو بھی یہ مقامِ آرزو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت — جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

اقبال کا یہ شعر اس کی اصل دینی اسپرٹ کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پہ
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

اس شعر میں جو روحِ عمل ہے جو پیغام ہے جو جھلکی ہے کیا یہ وہ نہیں ہے؟ کہ اقبال مسلمانوں کو محض نمازوں تک محدود رکھنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اسی استقامت اسی روحِ جہاد کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اسلام کی اصل روح ہے، اس کی انقلابی روح کا ہی اعجاز ہے جو وہ بے ساختہ کہتا ہے۔

تھا ارنی گو کلیم، میں ارنی گو نہیں — اس کو تقاضہ روا مجھ پہ تقاضہ حرام

انسان کو اپنی عظمت اپنی بلندی کا اندازہ اس بلند فکر شاعر کے کلام میں ملتا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے منتظر ہیں تمام — یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

قدم قدم پر اقبال انسان کو ہر دام سے آزادی دلانے کی کوشش کرتا ہے۔

پیری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں — کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

مکمل خود مختاری براہِ راست عمل کامل انسانی شرف و مجد اور بجلی کی طرح چمکتی ہوئی جدوجہد ہی تعلیم اقبال کی شاعری کا وہ مخصوص فرض منصبی ہے جو کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ابھی تک نہیں ملتی۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا — یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

اقبال کو ہندوستان کی آزادی اور آبرو کا اتنا ہی خیال تھا جتنا کہ اتحاد کے بڑے سے بڑے علمبرداروں کو مسلمانوں کو غیرت دلانے بیدار کرنے اور خودی کا جام پلانے سے اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی اور اپنے دیس والوں کی فکر کریں ہندوستان کو آزاد کریں اور اسکو افلاس و نکبت سے

نجات دلائیں۔ اقبال نے اپنے مذہب اور اپنی ملت کی خاطر قومیت کی مخالفت کی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ قومیت کا تصور کچھ ایسی فضا بنا دیتا ہے جس میں شاعری تو کیا انسانیت بھی نہیں پنپ سکتی قومیں بنتی ہیں ایثار و خدمت صداقت کے بھرپور جذبوں سے عدل و انصاف و رواداری اور انسانیت کی قدر پہچاننے سے اس کے لئے ولولوں کی ضرورت ہے نہ نعروں کی ہم میں کام کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو ظاہری ڈھونگ بیکار رہے۔ دنیا میں اقبال نے اپنے کلام کی بدولت شہرت پائی لیکن اس کی باعظمت شخصیت کا بھروسہ صرف ایک شعر کہنے کی صلاحیت پر نہ تھا وہ اتنا بڑا مفکر اتنا فلسفی اور ایسا تبحر عالم تھا کہ مشرق و مغرب میں شاید ہی کوئی اس جیسا جامع صفات انسان اب پیدا ہو سکے، اقبال کا مطالعہ اتنا وسیع اور مشاہدہ ایسا عمیق تھا کہ شاعری اور فلسفہ دونوں مل کر بھی اس کا حوصلہ پورا نہ کر سکے وہ بذات خود ایک پورے ادارے کی حیثیت رکھتا تھا ایک جانب اس کا دماغ مشہور جرمن مفکر نٹشے سے بہت متاثر تھا تو دوسری جانب مولانا روم کے فلسفہ کا والہانہ رنگ اقبال کو اپنے میں جذب کر چکا تھا اس لئے وہ جو کچھ بھی کہتا تھا اس میں حکمت و فلسفہ شعر و ادب کا بہترین امتزاج ہوتا تھا اور اس کی بتائی ہوئی راہ صراطِ مستقیم کی حیثیت رکھتی تھی۔ اقبال کی تصانیف میں شاہین کا فقیر و درویش ہونا، زردشت کے وعظ سے بہت قریب ہے جس میں وہ اپنے کوہستانی نشیمن کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ وہاں سے عقاب اور ستاروں کی ہمسائیگی نصیب ہے۔

سیاسی افکار اور نصب العین کا جہاں تک تعلق ہے اقبال کی سیاست کے کئی پہلو تھے ایک طرف تو وہ اور بلند پایہ مفکرین و مصلحین کی طرح تمام نوعِ انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا محض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے اعلیٰ درجے کا شاعر یا مفکر مخصوص گروہوں پر ہی اپنی توجہ نہیں دیتا اقبال کی طرح جرمنی کا سب سے بڑا شاعر گوئٹے ہے

جس کا زمانہ جرمنی کا نہایت پُر آشوب زمانہ تھا جبکہ نپولین نہ صرف جرمنی کو بلکہ تمام یورپ کو تباہ و برباد کر رہا تھا گوئٹے اس تمام ہنگامہ سے کچھ ایسا بے تعلق رہا کہ بعض نقادوں نے کہا کہ اس میں جذبہ حب الوطنی بالکل نہ تھا اقبال کے متعلق بھی صورتِ حال اسی قسم کی ہے۔ اس درد مند دل رکھنے والے شاعر نے شروع میں حب وطنی کے عام جذبات کے ماتحت ایسی پُر جوش نظمیں لکھیں جن سے بہتر آج تک اور کوئی شاعر نہیں لکھ سکا لیکن اس دور کے بعد اقبال کی دوربیں نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہاں بلند ہو گئی اور وہ قرآن حکیم کے اس نقطے پر آ کر ٹھیر گئی "کہ کسی قوم میں حقیقی طور پر تغیر جب ہی ہو سکتا ہے جب اس قوم کے لوگوں میں تغیر پیدا ہو جائے" سیاست داں کی نظر صرف ظاہر پر پڑتی ہے اور وہ صرف ظاہری اصلاح کر سکتا ہے لیکن ایک مصلح کی نظر اساسیات پر پڑتی ہے اور سیاست داں کے مقابلے میں بہت گہری اور دوررس ہوتی ہے۔ سیاست داں محض ابن الوقت ہوتا ہے اور معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی ہیں ان کو سلجھانے کے لئے قاعدے قانون بناتا رہتا ہے جن کی تہ میں کوئی پائیدار حقیقت نہیں ہوتی اس لئے ہمارا مفکر شاعر اپنے اہلِ وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا جس میں محض یورپ کی قوم پرستی کی بیجا تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ صالحانہ جد و جہد سے سب کے لئے کُھل جائے۔ وطن کی صحیح محبت اقبال کے دل میں آخر دم تک موجود رہی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا۔ اپنی آخر عمر کی فارسی نظموں میں جہاں کہیں وہ ہندوستان کا ذکر کرتا ہے اس کے بیان میں بڑا درد سوز و گداز ہوتا ہے وہ ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھا اور اپنے وطن کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، عقلی، مذہبی اور اخلاقی غلامی سے بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اقبال کی پوری شاعری اسی تخیل کی آئینہ دار ہے۔ اس شاعر نے اسلام کا وہی اصلی خاکہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے جو رنگ و نسل اور خون کے امتیاز کی وجہ سے کسی

قوم یا شخص کو بڑا یا چھوٹا نہیں سمجھتا اقبالؔ اس بیسویں صدی کے مسلمان میں بھی بلالؓ کی روح علیؓ کی شجاعت، عثمانؓ کی حیا، عمرؓ کا تدبر اور ابوبکرؓ کی صداقت دیکھنی چاہتا تھا۔ یہ چاہنا کیا بُرا چاہنا تھا؟ اس کے نزدیک انسان میں قوتِ مشاہدہ کا ہونا ضروری ہے اس کے بغیر اس کی انسانیت مکمل نہیں ہو سکتی اس نے اپنے کلام میں جا بجا اس صفت کے حصول پر زور دیا ہے۔ پیامِ مشرق میں جہاں آدمؑ کی پیدائش کا ذکر ہے وہاں پہلے شعر کا یہ مصرعہ اقبالؔ کے خیال کو پورے طور پر واضح کرتا ہے۔

حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

اس میں یہ اشارہ ہے کہ خود نگر ہونا ہر انسان کے لئے لازمی ہے۔ اقبالؔ صرف ہندوستانی ہی نہیں مسلمان بھی تھا۔ اسی نقطۂ نظر سے وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمایندہ بھی تھا جہانتک سیاست کا تعلق گروہوں کی اصلاح و ارتقا سے ہے وہ جس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کے لئے اعلیٰ درجے کے اقتدار کا آرزومند تھا اسی طرح وہ تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا۔ ہندوستان کے بعض غیر مسلم حضرات مسلمان کی اس فطرت سے آشنا نہیں ہیں چنانچہ جب کوئی مسلمان ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کے متعلق دلچسپی یا جوش اور جذبے کا اظہار کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے اور وطن پرست یا قوم پرست بھی نہیں ہیں ہر صحیح الفطرت مسلمان ہندوستان کی پستی، جہالت، غلامی سے اتنا ہی دلگیر ہے جتنا کہ اور کوئی غیر مسلم ہندوستان کی عزت کے لئے۔ ہر ہندوستانی کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ہندوستان کی عزت اس کی اپنی عزت ہے، ہندوستانی مسلمان کا وجود مادرِ ہندوستان کی خاک سے اُبھرا ہے اور اس میں وہ پیوند ہو جائے گا لیکن اسلام نے ایک مسلمان کو ایک ایسی برادری کا بھی رکن بنا دیا ہے جو جغرافیائی حدود سے ماوریٰ ہے مراکش اور چین کے مسلمان کی سیاسی اور تمدنی کش مکش کے ساتھ بھی اس کے دل کو وہی رابطہ ہے جو خود اپنے وطن کی جد و جہد سے ہے۔ مسلمان کی وسعتِ قلب

میں وطن کے لئے ایک نہایت عزیز مقام موجود ہے لیکن وطن سے علاوہ عالمگیر اسلامی برادری کو بھی وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتا۔

اقبال نے شہنشاہیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری کو اسلام کی تعلیم کے بالکل خلاف قرار دیا ہے غلامی و محکومی کو انسان کے لئے مہلک بتایا، جمہوریت اخوت، مساوات اور آزادی کی بنیاد پر انسانی سماج کی تعمیر کا مشورہ دیا اس وجہ سے اقبال کا کلام حیات و عمل کا ایک زندہ جاوید پیام بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سماج جو اقبال کا نصب العین تھا اشتراکی نصب العین سے ملتا جلتا ہے لیکن درحقیقت وہ اشتراکیت سے بہت بلند اور اسلامی تصورات کا صحیح عکس ہے جہاں اس مفکر شاعر نے ہندوستان کے مسئلہ آزادی کا حل ۱۹۳۰ء میں یہ بتایا کہ مسلمانوں کو ان مخصوص علاقوں میں اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کا حق ملے وہاں خدا کی جانب سے فرشتوں کو یہ انقلابی پیغام بھی دیا۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

آج ہم اقبال کے مبارک خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جبر و ظلم شہنشاہیت استبداد کی طاقتیں ہر ملک میں زوال پذیر ہیں ہر جگہ عوام منظم و متحد ہو کر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں، جمہوریت کا پرچم ہر ملک میں بلند ہو رہا ہے اور وہ دن اب دور نہیں جس کی پیشین گوئی ڈاکٹر اقبال نے اپنے ان اشعار میں کی ہے۔

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
جہازِ ما کہ اورا پرورش کردند طوفانہا
ز گردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے

تبصرے

سفرنامہ انند رام مخلص | از جناب ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی (کینٹب) صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو دہلی یونیورسٹی تقطیع کلاں ضخامت ۲۷۰ صفحات ٹائپ باریک مگر روشن قیمت مجلد چھ روپئے۔

محمد شاہ کا زمانہ سلطنت کے انتہائی زوال کا زمانہ ہے لیکن اس دور میں بھی کچھ ایسے ارباب علم و ادب تھے جن کے دم سے گذشتہ زمانہ کی کلچرل روایات قائم تھیں۔ انھیں لوگوں میں سے ایک انند رام مخلص بھی تھا۔ یہ قوم کا کھتری اور اصل باشندہ سیالکوٹ کے ایک مقام سودہرہ کا تھا علم و فضل کے لحاظ سے اسے اپنے معاصرین میں ایک مرتبۂ خاص حاصل ہے۔ وہ دو سرکاروں کا وکیل ہونے کے باوصف تصنیف و تالیف اور شعر گوئی کا مشغلہ بھی جاری رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دیوان کے علاوہ نثر میں بھی چند مفید اور دلچسپ تاریخی اور ادبی تصنیفات بطور یادگار چھوڑی۔ انھیں تصنیفات میں سے اس کا ایک سفرنامہ ہے جس میں اس نے روزنامچہ کی شکل میں اپنے اُس سفر کا حال بڑے دلچسپ پیرایہ میں لکھا ہے جو اس نے نواب سید علی محمد خاں بہادر کی معیت میں دہلی کا کیا تھا۔ یہ سفرنامہ محض روئداد سفر نہیں بلکہ اس میں اُس عہد کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات کے متعلق ایسی قابل قدر معلومات ملتی ہیں جو تاریخ کی کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتی۔ خوش قسمتی سے اس سفرنامہ کا ایک نسخہ خود مخلص کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانۂ عالیہ رامپور میں محفوظ تھا۔ زیر تبصرہ کتاب یہ وہی نسخہ ہے جس کو جناب ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب نے بڑی قابلیت و لیاقت اور عمدگی و خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب و مہذب کیا اور سرکار عالیہ رامپور کی طرف سے شائع کیا گیا۔ علاوہ اصل سفرنامہ کے جس کو آج کل کے جدید مغربی طریقہ کے مطابق اڈٹ کیا گیا ہے۔ شروع میں ایک سو چالیس صفحات کا ایک طویل

اور نہایت فاضلانہ و محققانہ مقدمہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے مخلص کے خاندانی حالات، ذاتی صفات و کمالات اور ادبی و شعری امتیازات و تصنیفات پر ناقدانہ گفتگو کرنے کے بعد سفرنامہ کا وسعتِ نظر اور دقتِ نگاہ سے جائزہ لیا ہے اور اس سلسلہ میں سفرنامہ میں جو مخصوص اصطلاحات آئی ہیں ان پر بڑے مفید اور معلومات افزا نوٹ لکھے ہیں اور ساتھ ہی سفرنامہ کی زبان اور اس کے بعض مندرجات پر کلام کیا ہے۔

اصل سفرنامہ کے علاوہ کتاب کا مقدمہ اور سفرنامہ کے حواشی عام اربابِ ذوق کے لئے عموماً اور تاریخ کے طلباء کے لئے خصوصاً نہایت مفید اور بہت قابل قدر ہیں۔ پھر مقدمہ کی زبان بھی ایسی شیریں اور رسیلی ہے کہ پڑھ کر آزاد کے طرزِ نگارش کا لطف آنے لگتا ہے۔

اس موقعہ پر غالباً یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بعض فارسی تاریخوں میں "الیہ" حال کے معنی میں عام طور پر استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صفحہ ۱۹ پر اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس لفظ کی اصل کیا ہے؟ اس کی نسبت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ دراصل الیہ حالیہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جیسے فارسی میں طلایہ جو پہرا اول کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے درحقیقت عربی لفظ طلیعہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ حالیہ سے آلیہ بنا اور پھر لوگوں نے اس کو جار مجرور سمجھ کر الیہ پڑھنا شروع کر دیا اور وہ ہی چل پڑا یہ صرف ہمارا قیاس ہے۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے سفرنامہ کی مشہور شخصیت نواب سید علی محمد خاں بہادر کے حالات و سوانح بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں لیکن اگر اس کی بھی تحقیق ہو جاتی تو بہتر ہوتا کہ نواب مرحوم کو اور ان کی اولاد کو سید کہنے کی وجہ کیا ہے داؤد خاں نے اس بچہ کو جس جگہ سے لیا اور جس حالت میں اٹھایا اس کے پیش نظر اس امر کی تحقیق اور بھی ضروری ہو جاتی ہے بہر حال ہم ڈاکٹر صاحب کو ان کے اس فاضلانہ علمی کارنامہ پر اور سرکار عالیہ رامپور کو اس معارف پروری و علم نوازی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ کتاب خانہ عالیہ رامپور کے اور نادر اور بیش بہا مخطوطات بھی اسی طرح غایت اہتمام و انتظام کے ساتھ شائع ہو کر علم و ادب کے ذخیرہ میں بیش قیمت اضافہ کا باعث ہوں گے۔ گدائی کار از تو آید و مردان چنیں کنند

اگست ۷۷ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء:۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت:۔ جدید اڈیشن جس میں ضروری اضافے کئے گئے ہیں۔ سے مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۲ مجلد ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ۔ سے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۸ر

۱۹۴۰ء:۔ نبی عربی صلعم:۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرتِ سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے جدید ایڈیشن جس میں اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ ۸ر

فہم قرآن جدید اڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب۔ عام مجلد ہے

غلامانِ اسلام:۔ اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید ایڈیشن۔ قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد ضروری اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین بنایا گیا ہے۔ قیمت صہ مجلد ۸ر

۱۹۴۱ء:۔ قصص القرآن حصہ اول:۔ جدید ایڈیشن حضرت آ[دم] سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک صہ مجلد ۸ر

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب۔ عار مجلد سے

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں ر[ہنے] کے لائق ہے جدید اڈیشن جس میں نہایت اہم تازہ ترین اض[افے] کئے گئے ہیں حجم پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے اور ۱۹۴۸ء تک کی تمام بین الاقوامی معلومات آگئی ہیں۔ پانچ روپے۔

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن دو روپے

۱۹۴۲ء:۔ قصص القرآن حصہ دوم:۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک۔ سے مجلد للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام:۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا اڈیشن للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن للعہ مجلد صہ

جلد نوزدہم | شمارہ (۲)

اگست سنہ ۱۹۴۷ء مطابق رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۶ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد	۶۶
۲۔ ادیب پشاوری	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد	۶۹
۳۔ سندباد	جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی	۹۳
۴۔ دنیا کے تین جاہلی تمدن	جناب مولوی ابو صالح صاحب اعظمی	۹۹
۵۔ عوالم خمسہ اور مراتب وجود	جناب خواجہ محمد علی صاحب رحمانی	۱۱۵
۶۔ تبصرے	م ۔ ح	۱۲۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جس تاریخ کو برہان کا یہ پرچہ اپنی مقررہ تاریخ اشاعت کے مطابق شائع ہونا چاہیے۔ وہ ہی تاریخ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ہے۔ یہی وہ تاریخ ہوگی جبکہ ہندوستان انڈیا اور پاکستان کے دو علاقوں میں بٹ کر ڈھائی سو سال کے بعد اپنے معاملات میں خواہ وہ اندرونی ہوں یا خارجی مختارِ مطلق ہوگا۔ اس خوشی میں دونوں جگہوں پر قومی جھنڈا لہرایا جائے گا۔ اور مختلف طریقوں سے اظہارِ مسرت کرکے جشنِ آزادی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ یہ سب کچھ ہوگا اور ہورہا ہوگا۔ لیکن ایک حقیقت پسند انسان کو پھر بھی یہ سوال کرنے کا حق ہے کہ کیا یہی وہ آزادی ہے جو ہم لوگوں کو محبوب و مطلوب تھی، کیا یہی وہ حریت و استقلال کی ناظورۂ خوش جمال ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی رگ و پے میں اضطراب و بے چینی کی بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ پھر کیا یہی وہ ہماری متاعِ گم گشتہ ہے جس کو واپس لینے کی حسرت و آرزو میں ایک طرف سراج الدولہ اور ٹیپو نے جامِ شہادت نوش کیا اور دوسری جانب حضرت سید احمد صاحب شہید اور ان کے رفقائے کرام کی جماعتِ حقہ نے خرقہ پوشی کے ساتھ شمشیر زنی کا ایسا کمال دکھایا کہ سرزمینِ بالاکوٹ کا ذرہ ذرہ آج بھی زبانِ حال سے اس کی گواہی دے رہا ہے۔ اگر در اصل یہ وہی آزادی ہے جس کا خواب حضرت شیخ الہند۔ انصاری۔ اجمل خاں، محمد علی، موتی لال نہرو اور سی آر داس وغیرہم نے دیکھا تھا تو پھر یہ کیا ہے کہ ملک اس آزادی کا استقبال فوجوں کے پہروں۔ سپاہیوں کی سنگینوں اور فوجی قوانین کی ہلاکت انگیزیوں کے ساتھ کررہا ہے۔ عالم میں غلغلہ بپا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر سے اپنا قبضہ اٹھالیا۔ لیکن خود ہمارا حال یہ ہے کہ نہ زندگی مامون ہے، نہ مال اور آبرو محفوظ ہے۔ کہیں ہندو مسلمان سے سہما اور ڈرا ہوا ہے اور کسی جگہ مسلمان ہندوؤں کے ڈر سے

لرزہ براندام ہیں۔ پھر ہندو ہندو میں پھوٹ ہے۔ مہا سبھا کانگریس کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مسلمان مسلمان سے نبرد آزما ہے، پنجابی سندھی سے اور سندھی پنجابی سے اور سرحد کا پٹھان ان دونوں سے کھٹکا ہوا ہے اور سیاست کے میدان میں آگے چل کر ایک دوسرے سے داؤ پیچ کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ان اختلافات اور تعصبات کے علاوہ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام روز بروز تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اربابِ سیاست کو بڑے اور اونچے درجہ کے معاملات نمٹانے سے ہی فرصت نہیں کہ وہ عوام کی پریشانی اور مصیبت کا جائزہ لے سکیں۔ ملک میں اناج کا کال ہے۔ ہر چیز گراں سے گراں تر ہوتی جا رہی ہے۔ چور بازار علی الاعلان اور کھلم کھلا چل رہا ہے۔ ہر محکمہ میں رشوت ستانی کا بازار گرم ہے۔ اخلاق اس درجہ گر گئے ہیں کہ انسان انسان نہیں رہا۔ بھیڑیا اور خونخوار درندہ بن گیا ہے۔ خدا پرستی کا صرف نام ہی نام ہے۔ امانت اور دیانت صرف کاغذوں میں نظر آسکتے ہیں۔ عمل میں ان کا کہیں وجود نہیں۔

پھر اس وقت جبکہ جشنِ آزادی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ ہمیں بے ساختہ بنگال وبہار سرحد و پنجاب، احمد آباد و بمبئی اور دوسرے مقامات کے ان لاکھوں انسانوں کی بھی یاد آرہی ہے جو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو کر مر گئے اور یا گھر سے بے گھر ہو کر آج بھی خانہ بربادی و بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں!

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ اب قید و بند کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں اور آزادی کا دور شروع ہوا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آزادی فی نفسہٖ کوئی قابلِ قدر چیز نہیں ہے۔ اگر اس کو صحیح اور درست طریقہ پر استعمال نہ کیا جا سکے۔ تاریخ میں کیسے کیسے بہادر اور نبرد آزما بادشاہ گذرے ہیں جنھوں نے ملک کے ملک فتح کئے لیکن ان پر حکومت نہ کر سکے۔ ملک فتح کرنے کے لئے بہادری، مردانگی اور عزم و ارادہ کی مضبوطی ہی درکار ہیں۔ لیکن حکومت چلانے کے لئے کمالِ

عقل وفرزانگی، دور اندیشی مصلحت شناسی۔ اور عوام و خواص کے جذبات کا ادراک وشعور، فکر وعمل کا توازن۔ پھر ان سب سے اہم اور مقدم یہ کہ ظاہر و باطن کی پاکیزگی اور صفائی، عدل و انصاف اور دیانت وراست بازی یہ سب اوصاف ضروری ہیں۔ پس آج جشنِ آزادی مناتے ہوئے انڈیا اور پاکستان دونوں حکومتوں کے اربابِ حل وعقد کو بارگاہ خداوندی میں عہد وپیمان کرنا چاہیئے کہ اب وہ کسی طرح ماضی کے دلخراش واقعات کا اعادہ نہ ہونے دینگے دونوں حکومتوں کا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہے اس لئے دونوں ایک دوسرے کی حلیف اور مددگار بن کر رہیں گی۔ کیونکہ اساسًا اسی پر دونوں کی خوشحالی اور حقیقی امن وعافیت کا دارومدار ہے۔ اب تک ہم نے حقایق بینی سے کہیں زیادہ جذبات پرستی سے کام لیا ہے اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج آزادی بھیانک اور ڈراؤنی شکل میں نظر آرہی ہے لیکن اب ہم کو لامحالہ حق شناسی سے کام لینا ہوگا۔ ورنہ اگر اب بھی ہم اس سے محروم رہے تو انجام شدید ترین تباہی وبربادی اور کامل ہلاکت ورسوائی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟

جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر نیر از جاج ہو نہ سکیگا حریفِ سنگ
خونِ دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

بہرحال ہماری دعا ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں آزادی سے بجا اور صحیح طور پر فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ ترقی کریں اور نہ صرف ایشیا کے لئے، بلکہ تہذیب وتمدن، نظامِ معیشت ومعاشرت، فضائل اخلاق۔ امن وخوشحالی اور علمی وثقافتی عروج وترقی کے اعتبار سے تمام دنیا کے لئے شمع راہ کا کام دیں۔

ادیب پیشاوری

سوانح حیات اور کلام

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد

اے بسا معنی کہ از نامحرمی ہائے زباں | باہمہ شوخی مقیم نسخہ ہائے راز ماند
وے بسا بالِ پری کز تنگیٔ دام و قفس | ساخت با آسودگی چندانکہ از پرواز ماند
بسکہ فطرت ہا بگردِ نارسائی خاک شد | یک جہاں انجام۔ جملہ پرورِ آغاز ماند
نغمہ ہا بسیار بود اما ز جہلِ مستمع | ہر قدر بے پردہ شد در پردہ ہائے ساز ماند

حسن در اظہارِ شوخی رنگِ تقصیرے نداشت

چشم ہا غفلت نگہ شد۔ جلوہ محوِ ناز ماند (بیدل)

مسلمانانِ ہند کی فارسی سے بے اعتنائی قابلِ صد ہزار افسوس ہے کیونکہ اسلامی مذہبیات اور ادبیات کا جتنا خزانہ اس زبان میں ہے شاید ہی اور کسی زبان میں ہو۔

ہندوستان میں غالباً صرف ایک پشاور ہی ایسا شہر ہے جہاں بعض کشمیری ایرانی اور کابلی خاندانوں کی وجہ سے اب بھی اکثر گھروں میں فارسی بولی جاتی ہے لیکن یہاں بھی علوم فارسی سے بے توجہی اتنی ہی موجود ہے جتنی باقی ہندوستان میں۔

اس صحبت میں آپ کو پشاور کے ایک ایسے فاضل اور شاعر سے روشناس کرانا مطلوب ہے

جس کی ایران کے اہلِ زبان نے کما حقہٗ قدر شناسی کی لیکن جسے ہندوستان کے اہلِ وطن ایسا بھولے کہ گویا وہ کبھی ان میں کا تھا ہی نہیں۔

چند روز ہوئے میرے دوست مرزا عبداللطیف خاں سیشن جج نے جنھیں اس گئے گزرے زمانے میں بھی فارسیات سے گہرا تعلقِ خاطر ہے۔ ادیبِ پشاوری کا ایک مطبوعہ دیوان مجھے دکھایا یہ کتاب مطبعۂ مجلس۔ طہران میں بجمع و تحشیہ و تعلیقاتِ علی عبدالرسولی۔ بحروف ٹائپ طبع ہوئی ہے۔ سنہ طباعت ۱۳۱۲ (ہجری شمسی) (۱۳۵۲ھ ہجری قمری ۱۹۳۴ء) ہے۔ یہ دیوان ادیب کے فارسی اور عربی قصائد و غزلیات پر مشتمل ہے۔ بڑی تقطیع کے ۲۹۵ + ۱۷ صفحات ہیں۔ غلط نامہ علاوہ ہے ادیب کے دو فوٹو بھی ہیں ایک جوانی کا اور ایک بڑھاپے کا۔

جامع دیوان (علی بن عبدالرسولی) نے مقدمۂ کتاب میں شاعر کے مختصر مگر مستند حالات بھی لکھے ہیں۔ عبدالرسولی، ادیب کا شاگرد اور معتقد تھا۔ اور مدتوں اُن کے ساتھ رہا۔ مندرجہ ذیل بیانات اسی مقدمہ پر مبنی ہیں۔

نام و نسب | ادیب کا نام سید احمد تھا۔ سید شہاب الدین معروف بہ سید شاہ بابا کے بیٹے اور سید عبدالرزاق رضوی کے پوتے تھے وہ سادلتِ اجاق سے تھے۔

ان کا خاندان صاحبِ زہد و تقویٰ اور اہلِ ذکر و دعا تھا۔ ان کا سلسلۂ ارادت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمت اللہ علیہ پر منتہی ہوتا ہے۔

وطن | ادیب کا خاندان پشاور اور افغانستان کے درمیانی علاقے میں۔ جسے اب علاقۂ غیر یا قبائلی علاقہ کہا جاتا ہے، رہتا تھا۔ ادیب کا فوٹو خود ایک بیّن دلیل اس امر کی ہے کہ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ پشاور شہر میں بھی ان کا رہنے کا مکان تھا۔ اس نواح کے لوگ اس خاندان کے بڑے معتقد تھے۔ اور ان کے باطن سے طلبِ ہمت اور کسبِ فیض کرتے تھے۔

ولادت | سید ادیب ۱۲۶۰ھ (قمری) ۱۸۴۴ء کے قریب پشاور شہر میں پیدا ہوئے۔ مدرسے جانے کی عمر ہوئی تو والد نے انھیں مکتب میں بھیج دیا تاکہ پڑھنا لکھنا سیکھیں۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل آپ نے اسی دبستان میں طے کئے۔ اس کے بعد آپ ادبیات و علوم کی تحصیل میں مشغول ہوئے۔

مثنوی مولانائے روم کی طرف توجہ کا عجیب واقعہ | وہ زندگی کے اسی مرحلے میں تھے کہ ایک روز وہ پشاور کے بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک درویش نہایت خوش الحانی کے ساتھ مثنوی مولانائے روم سے صلح حدیبیہ کا قصہ پڑھ رہا تھا جب وہ اس بیت پر پہنچا ؎

ناگہاں در حقِ آں شمعِ رسل　　　دولتِ انا فتحنا زد دہل

جب ادیب نے یہ شعر سنا تو بیخود ہوگئے۔ حالت دگرگوں ہوگئی اور اسی جذب کی حالت میں سر کو دیوار پر مارا۔ سر زخمی ہوگیا اور خون بہ نکلا۔ بقولِ سعدی

نہ بینی کہ اُنانکہ صاحب دلند　　　بہ آوازِ دولاب مستی کنند

اس کے بعد وہ مثنوی میں ایسے مشغول ہوئے کہ ہر وقت اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔

انگریزوں سے لڑکر افرادِ خاندان کا شہید ہونا | یہ وہ زمانہ تھا جب اضلاعِ سرحد میں چھینی ہوئی آزادی کو واپس لینے کے لئے لڑائیاں جاری تھیں۔ ایسے موقعہ پر ایسے خاندان کا اِس قومی جہاد سے برکنار رہنا ممکن نہ تھا چنانچہ وہ میدان میں آگئے۔ عمّالِ انگلشیہ سے لڑتے ہوئے نہ صرف ادیب کے والد شہید ہوئے بلکہ خاندان کے افراد کی اکثریت چچوں کے لڑکے۔ اکثر اعزا و اقارب اور ذوالارحام جامِ شہادت کا آبِ حیات پی کر زندۂ جاوید ہوگئے۔ ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاءٌ عند ربھم یرزقون (۳-۱۶۹)

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

وطن سے ہجرت | اِن حالات میں ادیب کا اپنے وطن میں اقامت پذیر رہنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ اپنی مظلوم بوڑھی ماں مہد علیا کو جو سادات حسینی سے تھیں اور جن کا سلسلۂ نسب حضرت سجادؑ سے ملتا ہے۔ وطن میں چھوڑ کر درد و سوز کے کارواں در کارواں دل میں لئے کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔

سفر اور تعلیم | دو سال کابل میں رہے اور آقا خوند ملا محمد معروف بہ آل ناصر سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہاں سے غزنی چلے گئے۔ اور حکیم سنائی کی تربت اور سلطان محمود غزنوی کے مقبرہ باغ فیروزہ پر مقیم ہو گئے۔ اڑھائی سال سے کچھ زیادہ وہاں اقامت کی اور ملا اسعد الدین سے جن کا شجرۂ نسب خلیفۂ اول رض سے ملتا ہے اور جو حکمت اور فنونِ ادب کے مشہور استاد تھے تحصیلِ علم کرتے رہے۔

غزنی سے ادیب ہرات آ گئے اور چودہ مہینے وہاں رہے۔ اس کے بعد تربتِ شیخ جام کی طرف روانہ ہو گئے اور ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ وہاں گزارا۔

قریباً تیس سال کی عمر میں وہاں سے وہ مشہد آ گئے اور علوم ادب و حکمت کی تحصیل و تکمیل میں لگ گئے۔ اور وہاں کے مشہور مدرس مرزا عبد الرحمٰن سے حکمت اور ریاضی اور آخوند ملا غلام حسین شیخ الاسلام سے فلسفہ اور علوم عقلیہ پڑھتے رہے۔ اور علوم ادبیہ کی تکمیل میں بالخصوص کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ ذوقِ فطری اور حدّتِ ذہن اور قوتِ حافظہ کی برکت سے وہ اس فن میں ماہرِ کامل ہو گئے اور اپنے معاصرین و اقران پر فوقیت حاصل کر لی۔

۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں ادیب سبزوار آ گئے۔ یہ شہر اُن دنوں علوم حکمت کا مرکز اور طلبائے معقول اور اہلِ معرفت کا مجمع تھا۔ دو سال تک استاد الحکماء و المتالہین حاجی ملا ہادی سبزواری کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور اُن ہی کے کہنے پر اُن کے لڑکے آقا خوند ملا محمد کے حلقۂ درس میں بیٹھتے رہے اور آخوند ملا اسمٰعیل سے بھی اس فن میں مستفید ہوتے رہے۔

حاجی سبزواری کی وفات کے بعد ادیب مشہد واپس آ گئے اور میرزا جعفر کے مدرسے

میں سکونت گزیں ہو گئے۔ اب وہ خود علم و فضل میں مشہور ہو گئے تھے۔ اور اماثل و افاضل کشمائلیہ انھیں لوگ ادیبِ ہندی کہا کرتے تھے۔

معلمی | یہاں انھوں نے خود بساطِ افادت بچھائی اور پڑھانے لگے۔ بڑے بڑے دانشمند بزرگ برغبتِ تمام اُن سے فیض حاصل کرنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کو غنیمت سمجھتے تھے۔

طہران میں ورود | سنہ ۱۳۰۰ ہجری قمری (۱۸۸۳ء) میں وہ طہران آ گئے۔ میرزا سعید خاں وزیر امور خارجہ کی معرفی سے۔ جو اُن دنوں مشہد مقدس میں آستانِ قدس کی تولیت سے بہرہ مند تھے۔ ادیب میرزا محمد علی خاں قوام الدولہ کے ہاں آ گئے۔ انھوں نے آپ کی تشریف آوری کو مغتنم سمجھا۔ اور جب تک جیتے رہے آپ کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا وہاں کے فاضل اور ادیب آپ کی صحبت کو غنیمت جانتے اور ان کی ہم نشینی کو عزت سمجھتے تھے۔

مشاعروں میں شرکت | اُن دنوں سید محمد بقا کے مکان پر ہفتہ میں ایک بار انجمنِ شعرا کا جلسہ ہوتا تھا۔ ادیب بھی گاہے ماہے برسبیلِ تفنن ان جلسوں میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ یہ سید محمد بقا جامعِ دیوان علی عبدالرسولی کے استاد تھے۔ علی بھی ان جلسوں میں موجود ہوتے تھے وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے میں نے ادیب کی جو نظم سنی۔ وہ ایک قصیدہ تھا جو انھوں نے اس مشاعرے میں پڑھا اور جس کا مطلع یہ ہے۔

تا بید برمیاں چو کمر زلفِ تابدار　　برنیم تار بست مہ من ہزار تار

معشوق کی کمر کی باریکی کے بیان میں موئے کمر کہہ کر شعرا کمر کو تارِ موی سے تو تشبیہ دیا ہی کرتے تھے اور یہ مضمون خاصا پامال بھی تھا۔ ادیب نے بال کی بھی کھال اتار کر کمر کو نیم تار کر دیا

ناصر الدین شاہ قاچار سے تعارف | بادشاہِ ایران ناصر الدین شاہ قاچار نے جب آپ کے فضائلِ علمی کا شہرہ سُنا تو اُسے آپ کی ملاقات کا شوق ہوا اور انھیں اپنے حضور میں طلب کیا۔ چنانچہ آپ

سید محمد بقا مذکور کے ساتھ حضورِ شاہی میں تشریف لے گئے اور موردِ الطافِ شاہی ہوئے بقولِ سعدی

اگر گوہرِ قیمتی غم مدار کہ ضائع نگرداندت روزگار

عبدالرسولی سے ربط | جامعِ دیوان کی ادیب سے پہلی ملاقات ۱۳۱۵ھ بمطابق ۱۸۹۷ء میں انجمن شعراء کے ایک اجلاس میں ہوئی۔ جامع اُن دنوں سید بقا کی شاگردی میں خطِ نسخ کی مشق کرتا تھا اور مشاعروں میں اکثر موجود ہوتا تھا۔ گو ابھی وہ نوآموز تھا اور مراتبِ ادبی کی تشخیص کے ناقابل۔ تاہم وہ ادیب کے فضائل و شمائل پر ایسا فریفتہ ہوا کہ اُسے ان کی ملازمت اور صحبت کا شوق ہو گیا۔

اتفاق یوں ہوا کہ حاجی میرزا عبداللہ کاتب المتخلص بہ دانا کے حجرے میں ادیب کا آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ عبدالرسولی بھی اکثر وہاں ہوتا تھا۔ اور ربا اوقات یہ دونوں دن دن بھر اکٹھے ہوتے تھے۔ اس طرح عبدالرسولی کی مراد بر آئی۔ مزید یہ کہ دانا اتفاقاً سفرِ مکہ و ہندوستان پر روانہ ہو گیا۔ اور قریب دو سال باہر رہا۔ اس دوران میں دانا کی جگہ جامعِ دیوان ہی اس حجرہ میں اقامت پذیر ہو گیا۔ اور اس طرح وہ ادیب کے دوامِ صحبت سے مستفیض ہونے لگا۔ اور رشتہ الفت و ارتباط ایسا بڑھا کہ عمر بھر قائم رہا۔

جمعِ دیوان | شروع شروع میں ادیب کے دو تین قصیدے اور چند غزلیں جامع کے ہاتھ آگئیں اُس نے انھیں خوشخط لکھ کر آپ کی نظر سے گزارا اور تقاضا کیا کہ جب آپ کوئی نظم لکھیں تو اُس کا نسخہ اُسے عنایت کریں۔ تاکہ جمع و تدوین کے کام سے وہ سرفراز ہو سکے۔

چنانچہ ادیب اپنی ہر نئی نظم جامع کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ عمر بھر یہی دستور رہا۔ اِس تعلق سے پہلے کی کئی نظمیں ضائع ہو گئیں اور کئی ایک عبدالرسولی نے دوسرے لوگوں سے اور بعض پھٹے پُرانے مسودات اور متفرق اوراق سے مرتب کر لیں۔

ادیب کی کم آمیزی | اُن مصائب و نوائب کے باعث جو ادیب کو کم عمری کے زمانے میں پیش آئے

اُن کی طبیعت میں کم حوصلگی اور تند خوئی تھی۔ ان کی دو عکسی تصویروں کو جو شاملِ کتاب ہیں دیکھ کر اُن کی تند خوئی کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہی علاقۂ غیر کا چہرہ۔ وہی خال و خط اور وہی نقوش کی درشتی۔ مصائب کے اثر کے علاوہ اُن کی زاد بوم کی خصوصیتیں بھی یقیناً ان کی طبیعت پر اثر انداز ہوئی ہوں گی۔

وہ لوگوں کے ساتھ الفت و انس کم کرتے تھے۔ اور بہت کم ملتے تھے۔ اسی لئے وہ درس دینے میں بھی چنداں رغبت نہیں رکھتے تھے۔ اتفاقاً کسی دوست کو کبھی ریاضیات اور ادبیات کا درس دیدیا تو دیدیا۔

مطالعہ | اُن کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا تھا اور ہمیشہ اپنے محفوظات کے تکرار میں مصروف رہتے تھے۔ حتیٰ کہ رستے میں چلتے چلتے بھی وہ پڑھنے سے باز نہیں آتے تھے۔

شعر خوانی | اُنھیں کم خوابی کی تکلیف تھی۔ کبھی کبھی دو تہائی رات گئے تک اور کبھی سحر تک اپنے مخصوص انداز میں ترنم کے ساتھ شعر گنگناتے رہتے تھے۔ اس طرح کہ سننے والا باوجود کوشش کے کوئی لفظ سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ کبھی شعر خوانی سے تھکتے نہ تھے۔ اکثر مثنوی مولانائے روم اور کبھی کبھی عربی قصیدے پڑھا کرتے تھے۔

حافظہ | ادیب کے حافظے کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ شیخ محمد خان قزوینی اپنی کتاب بیست باب میں لکھتے ہیں کہ "مجھے ادیب کا حافظہ دیکھ کر حماد راویہ یاد آجاتا ہے۔ کتبِ ادبیہ میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ شعرائے جاہلی میں سے اُسے حروفِ تہجی کے ایک ایک حرف پر سو سو لمبے قصیدے یاد تھے۔ علاوہ مقطعات کے۔ شعرائے اسلامی کا تو ذکر ہی کیا"۔

سید محمد تقا کا کہنا ہے کہ جب کبھی انجمن میں کوئی آدمی ادیب کے سامنے قصیدہ پڑھتا تھا اور پھر دو مہینے کے بعد کہیں اُس قصیدے کا ذکر آجاتا تھا تو ادیب اس قصیدے کے شروع

درمیان اور آخر کے چند شعر زبانی سنا دیا کرتے تھے اور آخر کار بے توجہی کے عالم میں ہی ناقص صورت میں سارا قصیدہ سُنا دیتے تھے۔

مثنوی حفظ تھی | جامعِ دیوان کا بیان ہے کہ میں نے خود ادیب سے سنا کہ جب وہ خراسان میں تھے اور مزاج پورے اعتدال اور استقامت پر تھا تو اکثر شہر کے باہر لوگوں سے دُور نکل جایا کرتے تھے اور تیز چلنا اور مثنوی پڑھنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ گرم خوانی کی یہ حالت ہوتی تھی کہ رستے میں گڑھا اور پتھر نظر نہ آتا تھا۔ اور کئی دفعہ گر پڑتے تھے۔ ان دنوں اُنھیں مثنوی کے چھ کے چھ دفتر مرتباً زبانی یاد تھے۔ وہ ڈرا کرتے تھے کہ کہیں اختلالِ حواس کی نوبت نہ آجائے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے اس عادت کو چھوڑا، لیکن اقامتِ طہران کے زمانے میں یہ عادت پھر عود کر آئی۔ جب کبھی وہ کسی دوسرے کام میں مشغول نہیں ہوتے تھے تو مثنوی پڑھتے رہتے تھے۔ ایک لحظہ بھی آرام نہیں کرتے تھے۔

تجرد | ادیب تمام عمر تنہا اور مجرد رہے۔ زن و فرزند، خانہ و خواستہ غرضیکہ دنیا کے تمام تر تعلقات سے آزاد رہے اور کسی قسم کی بندھن گوارا نہ کی۔

سوائے تن کے لباس اور چند ایک کتابوں کے اُن کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ طمع و آز سے ہمیشہ سختی کے ساتھ برکنار رہے۔ خوشامد کی اُن میں بُو نہ تھی۔ بغیر کلمۂ حق کے کسی نے کبھی ان کی زبان سے کوئی بات نہ سنی۔ عالی ہمت اور مستغنی طبع تھے، مداہنت اور تزویر چھُو تک نہیں گئی تھی یہی وجہ تھی کہ اظہارِ عقاید میں اُن کے لہجے کی صراحت اکثر اوقات لوگوں کی طبیعتوں پر گراں گزرتی تھی۔

حبِ وطن | اُن کا تعلقِ خاطر زیادہ تر سیاسیات کے ساتھ تھا اور اُن کی گفتگو اکثر اسی باب میں ہوتی تھی۔ حبِ وطن اور مملکت کے استقلال کا عشق گویا اُن کا مذہب تھا۔ وطن کے ساتھ خیانت اور اغیار خصوصاً انگریزوں کی طرف میلانِ طبع کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے، چنانچہ آپ اُن کے کلام کے ذکر میں دیکھیں گے کہ اُن کے اکثر قصائد اور مثنویات اسی موضوع پر ہیں۔

مدح سے پرہیز | ادیب نے عمر بھر کسی کی مدح نہیں کی یعنی مال کی طمع کی بنا پر کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

کوز طمعِ زر طریقِ مدح و شیوۂ ذم گرفت　　نیستم من چوں دگر گویندگاں۔ داند خدا

عالم نمایانِ بے حقیقت کو سخت بُرا سمجھتے تھے اور اہلِ حقیقت و صلاح و دیانت سے بہت محبت کرتے تھے

دوستوں سے محبت | ایک دفعہ اُن کا ایک دوست پردیس میں مرگیا۔ اس پر وہ بہت متاثر اور پریشانِ خاطر ہوئے۔ کہتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ دنیا میں میرے اہل و فرزند کوئی نہیں۔ اس قسم کی مصیبتوں سے بچا رہوں گا۔ لیکن اب دیکھتا ہوں کہ اگر میرا جوان بیٹا یا بھائی مرجاتا تو میں اس سے زیادہ غمگین نہ ہوتا۔ جتنا اب ہوں۔

فضائلِ علمی | ادیب اتنے شاعر نہ تھے، جتنے عالم، صرف ونحو۔ لغت و منطق و کلام۔ معانی و بیان۔ عروض و قافیہ۔ ہیئت و نجوم۔ حساب و ہندسہ اور تاریخ و تفسیر میں تبحرِ تام حاصل تھا۔ فلسفہ اور الٰہیات میں کامل تھے۔ فوق العادت حافظہ کی وجہ سے اُن کی معلومات کے خزانے معمور رہتے تھے جو کچھ کبھی پڑھا یا دیکھا۔ اُس کا بیشتر حصہ انھیں یاد تھا۔ فارسی اور عربی لغات میں استحضار کی یہ کیفیت تھی کہ کسی سوال کے جواب میں انھوں نے کبھی لا ادری (نمیدانم) نہیں کہا۔

اُن کے خصائص و فضائل کے اس پہلو کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی کہ وہ عرب و عجم کے نساب تھے اور قدیم و جدید انساب بہت خوب جانتے تھے۔ مختلف مذاہب و ملل کی تحقیق میں بھی دسترس تھی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کئی قرون سے مادرِ گیتی نے ایران کی گود میں ایسے فرزند کی پرورش نہیں کی۔ جامعِ دیوان کہتا ہے کہ اس بات کو مبالغے پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ فی الواقعہ

وہ وحیدِ عصر اور فریدِ دہر تھے۔ اُن کے معاصرین میں سے کوئی فاضل جامعیت اور تمامیت میں اُن کے برابر نہ تھا۔

شعرِ عرب اور متقدمین شعرائے عجم کے متعلق اُن کی معلومات کی وسعت کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص ان دو طبقوں کے کسی بڑے شاعر کا کوئی شعر پڑھ دیتا اور شاعر کو نہ جانتا تو ادیب اس سے آگے اور پیچھے کے شعر سُنا دیتے۔ اور شاعر کے حالات اور تاریخ بیان کرکے سائل کو مستغنی کر دیتے۔

آپ نے تاریخِ بیہقی پر جو حواشی اور تعلیقات لکھی ہیں۔ ان سے تاریخ و ادبیات میں اُن کی اطلاعات کی وسعت اور معلومات کی گہرائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وفات | ۲ محرم ۱۳۴۹ھ ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء کی صبح کو آقائے بہار الملک کے مکان پر معمول سے ذرا پہلے اپنے سونے کے کمرے سے نکلے اور علی کے کمرے میں آگئے۔ اور کہا کہ میں طبیعت میں کسالت اور سنگینی محسوس کرتا ہوں اور طبیعت ناساز ہے۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں سکتہ ہو گیا۔ اور دائیں طرف فالج ہو گیا۔ پورا ایک مہینہ بستر پر رہے۔ مزاج میں ضعف تھا اور عمر نوے سال کے قریب تھی۔ علاج معالجہ بے اثر رہا۔ ۳ صفر (۳۰ جون) کو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

مدفن | دوسرے روز انھیں مزار زادہ عبداللہ میں دفن کر دیا گیا۔ وزرا اور اکابر و اعیانِ مملکت جنازے میں شامل ہوئے۔

ماتمی جلسے | مدرسۂ سپاہ سالار میں مجلسِ ماتم منعقد ہوئی۔ وزارتِ معارف اور انجمنِ ادب میں بھی ماتمی جلسے ہوئے۔ وزرا، علما اور اعیانِ سلطنت نے شمولیت کی۔ تقریریں ہوئیں اور نظمیں پڑھی گئیں۔ عربی اور فارسی مرثیے سنائے گئے۔

تصانیف | (۱) دیوان قصاید و غزلیات فارسی (۴۲۰۰) بیت۔ قصائد و قطعات عربی (۳۷۰) بیت

(۲) رسالہ دربیانِ قضایائی بدیہیاتِ اولیہ۔

(۳) رسالہ نقدِ حاضر۔ دیوان ناصر کی تصحیح میں۔ جو جامعِ دیوان کے نام لکھا ہوا۔ یہ نسخہ ناتمام رہا

(۴) مثنوی در بحرِ متقارب۔ جس کا نام قیصر نامہ جامعِ دیوان نے رکھا۔ اور ادیب نے یہ نام پسند کیا۔ چنانچہ نقدِ حاضر میں آپ نے اس مثنوی کو اسی نام سے یاد کیا ہے (۱۴۰۰) بیت۔ جامع نے اسے مرتب اور محشی کر رکھا ہے۔ تا حال طبع نہیں ہوئی۔

(۵) ترجمہ اشاراتِ شیخ الرئیس۔ بعض دوستوں کی خواہش پر متنِ اشارات کا ترجمہ کیا اور ایک بیانِ مختصر اپنی طرف سے ایزاد کیا۔ یہ نسخہ بھی ناتمام رہا۔ کیونکہ اجل نے مہلت نہ دی۔

(۶) حواشی و تعلیقات بر تاریخِ بیہقی۔

قضایا اور نقدِ حاضر دیوان کے ساتھ چھپ گئی ہیں۔

~~~~~~~~

کلام ۱۔ ادیب نے قصیدے زیادہ لکھے ہیں، غزلیں کم۔ بعض قصیدے بہت لمبے ہیں۔ ایک ہی قافیہ لے کر صدہا شعر لکھ جاتے ہیں۔ پرانے قصیدہ گو شاعروں کی طرح وہ بھی الفاظ کی شوکت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ بہت متین گو ہیں۔ بازاری لفظ یا خیال غالباً ایک بھی دیوان میں موجود نہیں۔

۲۔ مختلف علوم میں ان کی اطلاعات کی وسعت کے آثار تمام کلام میں نمایاں ہیں۔ بہت پامال مضمون کم لکھتے ہیں اور کہیں کہیں ایسے موقعہ پر تھوڑا بہت تصرف کر کے پرانی چیز کو نیا بنا دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال آپ پڑھ چکے ہیں۔

۳۔ تشبیہات اور استعارات میں پرانی لکیر کی فقیری کم کی ہے۔ اس بارے میں وہ ہندوستانی الفاظ اور ہندوستانی اشیاء کو بکثرت استعمال کرتے ہیں جو فارسی شاعری میں نئی چیز معلوم ہوتی ہے بعض دفعہ الفاظ کو نئی ترکیبیں بھی دے جاتے ہیں۔ جس سے ان کے قادر سخن ہونے کی شہادت ملتی ہے۔
~~~~~~~~

(۴) منطق۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ ہیئت وغیرہ علوم کے مصطلحات بھی بہت بے تکلفی سے بعض دفعہ استعمال کر لیتے ہیں۔ لغاتِ عرب وعجم کی مہارت تو قریباً ہر نظم سے ثابت ہوتی ہے۔ جامع دیوان کا یہ کہنا کہ ان کے استعمال شدہ الفاظ کو جمع کرنے سے ایک فرہنگ بن سکتی ہے زیادہ مبالغہ آمیز نہیں۔

(۵) بعض دفعہ بہت مشکل گوئی بھی کر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک شعر کے متعلق عبدالرسولی نے جرأت کر کے کہدیا کہ اسے ہزاروں میں سے کوئی ایک آدمی سمجھ سکے گا۔ ادیب نے جواب دیا کہ میں نے یہ شعر اُسی ایک آدمی کے لئے کہا ہے۔

(۶) دوسرے شعراء کے مضامین کو اپنی نظم میں باندھنے سے بڑا پرہیز کرتے ہیں اور عموماً نئی نئی باتیں ہی کہتے ہیں۔

(۷) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ شاعر سے زیادہ عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شوخی اور رندی بہت کم ہے۔

(۸) سیاسیات کو تو گویا وہ اپنا مذہب ومسلک بنائے ہوئے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں یہ مضمون مستقلاً یا ضمناً موجود نہ ہو۔ انگریزوں سے اور دوسرے اغیار سے بہت نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

(۹) حبِ وطن اُن کے ہر قصیدے سے ظاہر ہے۔ تمام عمر ہندوستان سے باہر گزاری۔ لیکن کسی نظم میں ہندوستان کو، ہندو اور مسلمان کو اور ہندوستانی سیاست کو نہیں بھلایا اور انگریزوں کو وہ کھری کھری سنائی ہیں کہ یاد رکھیں گے۔

(۱۰) ایران سے ان کی محبت بھی ان کے قصائد سے ظاہر ہے۔ تمام عمر انھوں نے ایران میں ہی گزاری۔ اس لئے یہ جذبہ قدرتی تھا۔

(۱۱) غزل تو بغیر رندی اور شوخی کے لطف ہی نہیں دیتی اس لئے انھوں نے غزلیں لکھی بھی کم ہیں

اور جو ہیں وہ بھی قصائد کے شروع کے تمہیدی رنگ تغزل کی طرز کی۔

نمونۂ کلام سے جو ذیل میں درج ہے، ان کے کلام کی خصوصیتیں اور خوبیاں خود ظاہر ہو جائیں گی۔

قصائد | دیوان کے شروع میں قصیدے کے شروع کے چند شعر جو پند و حکمت میں ہیں۔ ملاحظہ کیجئے

مگر کہ مرگ۔ دولت برکند ازیں دنیا — کہ دردِ حمق ندارد بجز کہ مرگ دوا

نگار کردہ رخان دبکار بردہ عبیر — ہمی فریبدت ایں گندہ پیر پشت دوتا

بلعل وگوہر دارد نہفتہ گردن وگوش — بزر و زیور دارد نہاں چکادہ[1] و پا

ہمی بصنعت ارژنگ[2] چہرۂ ارژنگ[3] — کند چو صفحۂ ارژنگ[4] خرم وزیبا

ہزار دام وتلہ بر نہادہ دارد سخت — براہت اندر ہر یک نہان وناپیدا

تو پای بستہ بدام اندرون وپنداری — کہ رستہ گشتہ وآزادۂ ضبوک[5] بلا

چدار[6] سخت بیا بر نہادت ایں جادو — قوی کمند بگردن فگندت ایں رعنا

گر ایں چدار بدری۔ بدر روی از خرچ — ور ایں کمند ببری چو جاں شوی بصفا

مکن مقام بویرانہ گرنہ خرکوف[7] — بروں خرام ازیں خانہ پاک چوں عنقا

یہ مضمون ایسا ہے جس پر قریباً ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن پڑھنے والا یہ محسوس نہ کریگا کہ ادیب نے کسی کا کوئی خیال جوں کا توں لے لیا ہے۔ عجوزۂ ہزار داماد کو انھوں نے یہاں بالکل نئے زیوروں سے آراستہ کیا ہے اور اس کے سحر و فسوں کو بھی نئے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

ایک رزمیہ قصیدے کے چند شعر دیکھئے۔

---

(۱) قصیدہ ہی کیا جو فرہنگ کی مدد کے بغیر پڑھا جا سکے۔ لیجئے [1] بالائے سر و پیشانی۔ [2] مشہور نقاش مانی کا نام۔ [3] ایک دیو کا نام جسے رستم نے قتل کیا تھا۔ [4] مانی کا مرقع تصاویر۔ [5] محکم [6] پائی بند اسپ واستر۔ [7] اُلّو۔

رومئینہ شاہیں ہانگر با آہنی چنگالہا	گسترده اندر باختر پر ہائے کین و بالہا
بگشاده از منقار ہا بر سانِ دوزخ غارہا	فد غار جستہ مارہا تفتیدہ دُم و بالہا
پیکار جویان فرنج بیہودہ در کیں راہ رنج	و از کوہ با توف و تفنج انگیختہ زلزالہا
زاں بانگ ہائے ہم ناک در دیدہ شد پیوند خاک	شد سرو خمیدہ چوناک افتاد از استقلالہا
سقلابیان تیز جنگ بر خویش بستہ ساز جنگ	چوں شیر بچگاں بیدرنگ جستہ بروں از نالہا
از دل بروں افگندہ باک بسپردہ تن ہا بر ہلاک	یا تخت شاہد یا مغاک مارا دریں احوالہا

دیکھئے اس قصیدے کا ایک ایک لفظ جنگ کی ہولناکیاں اپنے ساتھ لئے ہے۔ ان اشعار کو ذرا جلی آواز میں ایک ایک مصرع کے دو دو ٹکڑے کرکے اس بحر کے مخصوص انداز میں پڑھئے تو یقیناً سننے والوں کے سامنے لڑائی کی تمام تر ہم ناکیوں کا نقشہ کھنچ جائیگا

ایسی نظم میں شاعر کے سامنے سب سے بڑا کام مناسب الفاظ کا انتخاب ہوتا ہے۔ ادیب یقیناً اس کام میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نظم میں زلزالہا کا لفظ پڑھکر اذا زلزلت الارض زلزالھا واخرجت الارض اثقالھا الآیہ یاد آجاتا ہے۔ دیکھئے ان آیات کو پڑھ کر قیامت کا نقشہ اپنی تمام زہرہ گداز حقیقتوں کے ساتھ کس طرح انسان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے یہ انتخابِ الفاظ کا طلسم ہے۔

خمیدہ کو مشدد اور بچگان کو مخفف کرنا بھی زور آور آدمی کا کام ہے، ہر کسی کا نہیں۔ ادیب بہت مقامات پر الفاظ اور تراکیب میں اس طرح کا تصرف کر لیتے ہیں اور وہ معیوب بھی نظر نہیں آتا۔

ایک قصیدے کے شروع کے تغزل کے چند شعر سنئے۔

چتر گیسوئے ترا خاصیتِ بالِ ہماست	ملکت خوبی مسلم زیں سبب روئے تراست
در نگارستانِ چیناں نگارے کس ندید	با چنیں نازو ملاحت ہاکہ در روئے شماست
ماہ را از آفتاب و آفتابِ چرخ را	ہم ز خورشیدِ دگر یعنی ز روئ تو ضیاست

چمنستان دیکھیے۔ ادیبؔ کی اپنی ترکیب ہے اس طرح وہ کئی نئے لفظ گھڑ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ظرافت ور شاعر قواعد وضوابط اور حدود وقیود کی پابندیوں کو اپنی آزادی اور آزادگی کے خوف کے منافی سمجھتا ہے۔ اسی قصیدہ میں ایک شعر ہے۔

روزہا بر گردِ گل می گردد و شب بر گردِ شمع　　　زندگی جز بہرو پروانہ بسپردن خطاست

پروانے کے رات کے کاروبار تو معلوم عوام ہیں لیکن اُس کی دن کی مصروفیتوں کا حال اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ اب ادیبؔ کے اس شعر سے معلوم ہوا کہ یہ ننھی سی جان رات بھر شمع پر قربان ہوتی رہتی ہے اور دن بھر پھولوں پر نثار اور غالباً یہ بیان درست بھی ہے۔ یہ نہایت چھوٹی بظاہر حقیر سی ہستی جس کا سینہ سوزِ بے پایاں کا خزینہ ہے دن بھر بیکار کس طرح بیٹھ سکتی ہوگی۔

جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے۔ ادیبؔ کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی حبِّ وطن ہے۔ چنانچہ "در القاظ وانباہِ ہندواں فرماید" ہندو سے یہاں مراد ہندوستانی ہے۔

چشمِ روشن بینِ آدم اندکے چوں نَم گرفت　　　دیو آنگہ کامِ خود از حضرتِ آدم گرفت

چوں غبارِ غفلتے بر چشمِ جم پردہ کشید　　　دیو فرصت دید و شد از کلکِ[1] جم خاتم گرفت

ہاں وہاں اے زادۂ ہندوستاں ہشیار باش　　　کز رواغفالِ دیوت راہِ صوت ودم گرفت

گر بُدے با خاک انبودہ بدے بہتر ازیں　　　کز شما نیرنگ لندن ستلج وجیلم گرفت

آبروئے ترک وہند بہر زمیں ریزید چوں　　　لندنی جمنا گرفت ورو س رودِ زم[2] گرفت

وز ہر کس کہ بود اورا خیانت در سرشت　　　از برائے خویش اورا خاصہ ومحرم گرفت

شور شد ہندوستاں برلندنی از کار تو　　　بر تو ماتم گشت وہم از کار تو ماتم گرفت

بہر او آباد وبہر تو خراب از دستِ تست　　　اے شگفتا یک زمیں ایں دو صفت باہم گرفت

---

[1] انگلی۔ [2] دریا کا نام۔

چوں خدا تاں داد جنبش دل فراہم آورید — آں شنیدستی کہ قومِ متفق عالم گرفت

یکدلی تاں راست خواہد کرد ایں بالائے کوژ — سالہا از دو دلی تاں راست بالا خم گرفت

متفق بودن بہم اے زادۂ ہندوستاں — شد ببامِ عرش بر ہر کو چنیں سلّم[۵۱] گرفت

کردہ دینِ عیسوی ترویج اندر ملکِ ہند — ہر کشیشے کو بدزدی جا دراز مریم گرفت

انگریزوں سے خطاب ہے۔

ہر بدی در ہر کجا بر ہر کہ صادر شد ز تو — ہیں مبر ظن کش دبیرِ دہر لا یہ قم[۵۲] گرفت

در حواسِ دہر نبود خوفِ نسیان و ذہول[۵۳] — ہست حاضر گر ز تو واضح دگر مبہم گرفت

آنچہ در ہندوستاں از قتل و نہب و سلب رفت — بر تو با دا فراہ[۵۴] ہر یک آسماں مبرم گرفت

ان اشعار میں چند چیزیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) کسی قوم کے غافل ہو جانے پر سلطنت اس سے چلی جاتی ہے ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہوا۔

(۲) محکوم قوم کے خائن لوگ حاکم کے مصاحب بن جاتے ہیں۔

(۳) وہی ملک حاکم کی اغراض کے لئے آباد اور محکوم کی محرومی کے لحاظ سے ویران بن جاتا ہے۔

(۴) محکوم قوم کی اپنی بداعمالیوں سے ملک میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔

(۵) ہندوستان کی مختلف قوموں کو یکدلی اور اتفاق کی ترغیب۔

(۶) عیسائی پادریوں کی شدید مذمت

(۷) انگریزوں کو تنبیہ کہ ایک دن آسمان تم سے مظالم کا بدلہ لے گا۔

ایک اور قصیدے کے اشعار ہیں۔

ایدوں منم از کارِ ہند و زروز تیرہ و تارِ ہند — کیفر ازیں جبارِ ہند یا آہ دل خواہم کشید

---

[۵۱] زینہ۔ [۵۲] نہ لکھا گیا۔ [۵۳] غفلت۔ [۵۴] سزا بدلہ۔

خواہم زپلکاں ہمتے تاگیرم دل قوتے — وزقوتِ دل سطوتے یابد تنے کزوے شمید[1]

زیں دم کہ آتش مے جہد دشمن از آتش کے رہد — وراز تنش دریا زہد گردد چو نفت[2] آنچہ زہید[3]

انگریزوں سے خطاب

درکارنامۂ روزوشب دیداز تو افتادہ شغب — ایں گنبد دوّار ولب درزیر دنداں میگزید

تاافگند درگو ترا آں گو کہ بیروں شو ترا — زانجا بروزوشو[4] ترا نایدبدستانے پدید

گردوں ہمہ تن سینہ باد وآں سینہ پر از کینہ باد — وآں کینہ اش دیرینہ باد چوں باتو خشمیں بستہید[5]

باہرکہ درآمیزشی بنہفتہ درآویزشی — درشہر شور انگیزشی جز تو کجا کس بنگرید

عہدِ تو باکس بستہ نیست کاں زاں سپس بشکستہ نیست — دل نہ کہ خارت خستہ نیست کز باغ تو دل نشگفید

بدخوئی تو بیم ہا افگندہ دراقلیم ہا — وزکاخہا وتیم ہا آسودگی از تورمید

اس قصیدے سے ادیب کا انگریزوں سے شدید جذبۂ انتقام ظاہر ہوتا ہے اور حد درجے کی نفرت، سینہ وکینہ والا شعر کتنی زوردار اور سنگین بددعا ہے۔ اس شعر سے انگریزوں کے خلاف ادیب کے جذبات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ میں نے کسی بددعا میں اتنی شدت کبھی نہیں دیکھی۔ کائنات کی تمام فضا ایک سینہ بن جائے۔ پھر وہ سینہ کینے سے لبریز بھر جائے۔ اس کینے میں پرانے کینے کی تندی اور سختی ہو اور پھر زمانہ اس کینے کے ساتھ انگریزوں سے انتقام لے۔

انگریزوں کی ہر ظاہری آمیزش کو باطنی آویزش کہا ہے اور یہ مبالغہ بھی نہیں۔ انگریزوں کے عہدو پیمان کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان انگریزوں کے خلاف ہمیشہ یہی شکایت کرتا رہا ہے۔ روئے زمین کے ہر گوشے میں انگریزوں نے جو بے اطمینانی پھیلائی ہے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

---

[1] ڈرتا تھا۔ [2] آتشِ سیال۔ [3] پانی کا بہنا۔ [4] رات شب۔ [5] لڑنا جھگڑنا۔

ایک اور قصیدے سے تغزل کے چند شعر اور ہندوستان کے متعلق کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہر کجا خوبے ست من مولائیمش — عاشقِ خال و خطِ زیبائیمش
ناظرِ خورشیدم اندر ہر افق — ہر کجا خورشید من حربائیمش[1]
ہر گلے کز ہر چمن خنداں شود — من چو بلبل شاد با سودائیمش
روح را چوں جز شمیمش مایہ نیست — زاں غلامِ زلفِ عنبر سائیمش
با دہانش اُلفتے دارم فزوں — گرچہ من شیدائے سرتاپائیمش

اے برادر کشورِ ہندوستاں — دیدہ ام دوشینہ در رویائیمش
بر مثالِ مرغکِ بے بال کز — نالۂ زارش کنوں درّوائیمش[2]
شد مصور پیشِ چشمم ہمچو ماہ — ہمت و دیدم در آں اثنائیمش
گفت ہمت گرچہ بالش سود و پر — من مسیحِ بال و پر بخشائیمش
گفت ہمت ہر کہ شد در من فنا — تا قیامت ضامن القائیمش

یہاں ہندوستانیوں کو آزادی حاصل کرنے کے لئے کمر ہمت باندھنے کی ترغیب دی ہے

ایک اور قصیدے میں انگریزوں سے خطاب ہے۔

اشترِ ہند تو بود ہند و کنوں کیں گرفت — جاں نبرد سارباں چوں شتر آورد کیں
بندِ عقالِ[3] ترا زانوئے او بُد مکاں — بر بر و پہلوت گشت جائے عقالش مکیں
مار فسوں خواندہ بود ہند بدست اندرت — مار فسائندہ[4] را مار کشید بالیقیں
بس رگِ جانِ کساں گشت گسستہ ز تو — بگسلد روزگار نیز و رید و و تیں[5]

---

[1] جانورے ست آفتاب پرست۔ [2] درواشیدا متحیر۔ [3] زانو بند شتر۔ [4] مارگیر۔ [5] رگ قلب۔

برتو کشادہ مباد چرخ بروی و بروٗ[1]　　جز کہ بیاوردہ خشم جز کہ درافگندہ چین

کشتی عمر تو باد رفتہ فرو لخت لخت　　تختۂ در قلزم و تختۂ در بحر چین

خواستہ ام از خدا تا کہ بہ بینم ترا　　روبہ ذم در تلہ گربۂ بے پوستین

لوح دعائے مرا بخش نگارِ قبول　　اے کہ کفِ فیضِ تو نیست بہ بخشش ضنین[2]

شروع کے شعروں میں ہندوستانیوں کی سیاسی بیداری کا ذکر ہے اور آزادیٔ ہند کی پیش گوئی ہے جو بفضلہٖ تعالیٰ پوری ہو رہی ہے۔

اِس کے بعد دعا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر انگریزوں پر بد دعا۔ اِن شعروں کے ایک ایک لفظ سے خلوص۔ حُبِّ وطن اور بغضِ اغیار کے جذبات پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادیب کا جسم ایران میں اور دل ہندوستان میں ہے۔ یہ خلوص و درد اور سوز و گداز سے بھری ہوئی دعائیں آخر قبول ہوئیں کیونکہ خدا فی الواقعہ دعائیں قبول کرنے میں بخیل نہیں۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست　　(حافظ)

ادیب کی خمریات کا اسلوب اِن اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے۔

ساقی مگر بر جائے مے آتش زمینا ریختہ　　آتش بے سرمائے دی در جامِ صہبا ریختہ

ساقی بے افگندہ پے در جامِ جم پالودہ مے　　وز نوشِ لب دارو ئے کے بر زخمِ دلہا ریختہ

چوں با جگر آمیز دت تف از جگر انگیز دت　　مستی ز تن بگریز دت گرد ز اعضا ریختہ

چوں ماہی بریاں اگر پیچیدۂ دستار در　　صور سرافیلے نگر کا وائے احیا ریختہ

سوز ز آغازت زباں چوں پور عمراں بگیاں　　وانگہ بفرقت رائگاں نورِ تجلا ریختہ

---

[1] ابرو کا مخفف۔ [2] بخیل۔

ہندوستان کے متعلق ایک اور قصیدے کے کچھ شعر دیکھئے۔

باغی اے ہندوستاں بحک وبا گلہ بزاں — کت بود گرگے شباں وزاغِ دوں خنیاگرے

چونی اے خائندہ شکر طوطیٔ شیریں مقال — کت بود زاغ خطیب برشدہ بر منبرے

جز نگر بیدانشی وجز نگر ناداں امیر — نیست اے ہندوستاں ہیچت گناہ دیگرے

عاقلے نواب ومہراج تراچوں دہر گفت — اینست غافل مہترے آنست جاہل سرورے

دُزد کافر خوی وتو ناداں وزرے پاسباں — گر بر دیکبارہ نبود معجب ومستنکرے

اے مسلماں مرتراوے برہمن ہم مرترا — از ثریا بردایں بیدانشی اندر ثرے

خانہ زانِ تو وبیگانہ درآں فرماں روا — پس نگر خانہ من است ایں عاریتے[1] ان یا کرے

اے مسلماں وے برہمن النجا ثم النجا[2] — تاکہ ملکت بے دریغ آید بر چوں دلبرے

باتومے گویم مباش اے سادہ دل ہندو پسر — در طریق جاں سپاری کم زہندو دخترے

چوں سپردہ شد طریقت کفر ودیں گردد یکے — بیگمانت ایں زمن بایست کردن باورے

موردش اینجاست اے ہندو مکن دیگر جدال — خصم کار افزاست کم کن اے مسلماں ماجرے

شش جہت گردد یکے چوں بگزری زیں چنبرہ — حق پرستاں راچہ قبلہ آدروچہ ایدرے

سوئے آتش اے برہمن شادرو ہمچو ستی — سوئے شمشیر اے مسلماں شادرو چوں جعفرے

گربہ باشد زبوں چوں دل فراہم نیست موش — مورِ خاطر جمع دردیوست برشیر نرے

از غمت اے گلستانِ ہند روز وشب منم — رستہ اندر آب چشم خویش، چوں نیلوفرے

تو بدیں جانے کہ داری ننگ ہر جانادری[3] — شہسوارے شو مکن خر بندگی پیش خرے

تو بمیداں اندر آی وہمچو مرداں تیغ زن — بزم مرداں رانشاید جز چنیں ساغر خورے

جز کہ دیو ودد زبہر جانِ اہل آسیا[4] — بچہ ہرگز نزادہ در اروپا[5] مادرے

---

۱ کرایہ۔ ۲ جلدی ۳ جانور۔ ۴ ایشیا ۵ یورپ

ہندوستانیوں کو مذہبی جھگڑے چھوڑنے کی اور وسعت مشرب کی ترغیب دی ہے۔ راجاؤں اور نوابوں کا گلہ کیا ہے۔ دل مضبوط رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ ہندو مسلم اتفاق پر زور دیا ہے۔ ہندوستان کی بدحالی پر اپنی زار نالی بیان کی ہے اور آخری شعر میں یورپ اور ایشیا کے متعلق جو کچھ کہا ہے، اس کا ایک ایک حرف حقیقت کا آئینہ ہے۔

تجدیدِ مطلع کے بعد پھر اسی قصیدے میں کہتے ہیں۔

آمد اندر کشور ہندوستاں سوداگرے	کردہ پنہاں زیر خاکستر بجلت اخگرے
بعد چندے زیر خاکستر فروزینہ[1] نہاد	تاکہ دود فتنہ بالا زد سراز ہر کشورے
آسماں با آزِ او از چشم سوزن تنگ تر	ویں زمیں در گاز او چوں زر بہ پست زرگرے
کشتی کیدش رواں عرادہ مکرش رواں	آں میانِ بحر او ویں در میان ہر برے
ہم بریں پیماں و عہد آمد ز لندن تا کجا	تا بہ سیحوں ہم ز سیحوں زد سوئے پشاورے
ہم ہوا مسموم گرد و ہم زمیں زہر آب دم	ہر کجا زیں قوم مکیتن بگذر د چوں عا برے
کار ایراں ایں چنیں ناساختہ از سازِ کیست	کش نہ بنا بہ بجا ندہ در کف و نہ منصرے
آنچہ اکنوں میرود زیں قوم اندر مصر و ہند	در بخارا از تتر[2] ہر گز نر فت و در ہرے
نیست مارے در بُنِ غارے کہ بہرِ زہر او	خلق تریاقے نکرد و نا فریدہ منترے
بہرِ زہر تو قضا خواہد فرستادن ترغیب	زہر کش تریاکے و ہم مار گیر افسونگرے
طبلِ رسوائیش در عالم بکوب اے عدلِ حق	بہر عدل تو نخواہد یافتن کس داورے
اضطرابش باعثِ آرام جانِ عالم است	زندہ کن عالم بمرگِ ایں چنیں بدگوہرے

اِن اشعار میں انگریزوں کا ہندوستان میں سوداگر بن کر آنا۔ زیرِ آستیں خاکستر میں فتنے کی

---

[1] خس و خار و خاشاک۔ [2] تاتار

چنگاریاں لانا۔ انگریزوں کی بے انتہا جوع الارض۔ ان کی مقراض کی پیراہن نوازی۔ جھوٹے عہد و پیماں کے ذریعے کہاں سے کہاں تک پہنچنا۔ جہاں جانا وہاں کی ہوا کو زہریلا بنانا۔ مختلف ممالک کو قطعاً بے دست و پا کرنا۔ انگریزوں کو سانپ کہنا اور ان کے زہر کے لئے خدا سے تریاک کی دعا کرنا اور ان پر بددعا کرنا مندرجہ بالا اشعار کا ماحصل ہے۔

غزلیات | اب ادیب کی غزلیات کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اُن کی غزل کے انداز کا اندازہ ہو سکے۔

ازفراقِ روئے تو اشب مرا میرسد ایں نیمہ جاں برلب مرا
گر مسلماں ور کہ کافر خوانیم نیست جز عشق اے صنم مذہب مرا

چوں کبوتر مرغِ دل در دست تست پرزناں در پنجۂ شاہیں مرا
آں فسوں گر کیست کز افسون او گشتہ آئینِ شمن[1] آئیں مرا

---

[1] بت پرست

دل نہ تنہا تو از کون و مکاں مستغل[2] است کہ بسودائے تو ز اندیشۂ جاں مستغل است
مردم دیدہ ازاں لحظہ کہ ازروئے تو گل چیدن آموخت زگلزار جہاں مستغل است

[2] مستغنی

بر سماعِ بلبلاں گل جامہ مے درّد بشوق تا نہ پنداری ز شوقِ بلبلاں آگاہ نیست
نیستی آسودہ خاطر زانکہ از شاخِ رطب دستِ تو کوتاہ و دستِ آرزو کوتاہ نیست

دانہ و دامم بجز خال و خطِ خوباں مباد زانکہ کاروبارِ گیتی غیر دانہ و دام نیست

گردغارت چشم تو خوابم از انک روز و شب چشم تو جز خوابیدہ نیست

ازیں محیط کہ ہیچش کرانہ نیست پدید بجز بے نتوانیم بر کنارہ کشید
بیار جام ہلالی توائے برخ چوں ماہ کہ بدرویم بدیں داس۔ غم زدل چو خوید

درصورت لیلیٰ ہمہ کس دیدہ ہمیٰ نگریست بہاں دیدہ کہ مجنوں خدنی بود
ہر سینہ بجز سینۂ موسیٰ بے آتش کز طور برافروخت۔ نہ کانون شدنی بود
عشق تو یکے خانہ ہمے جست در آفاق بر کلبۂ آدم زد و مسکوں شدنی بود
قانع شدمے از لب شیریں تو باسے گر چارۂ میخوارہ بافیوں شدنی بود
باخوئے جہاں ساختمے چوں دگراں من
گر ہمت من چوں دگراں۔ دوں شدنی بود

برکلبۂ آدم زد۔ والے شعر کے ساتھ حافظ کا یہ شعر بھی پڑھ لیجئے۔

جلوہ کرد رخش دید ملک عشق نداشت عین آتش شد ازیں غیرت و بر آدم زد

بہار آمد ہموارہ در گلستاں باش بہر کجا کہ دمد گل ہزار دستاں باش
چو غنچہ خون جگر میخوار از دروں لیکن بچشم خلق چو گل تازہ روی وخنداں باش
زخود چو مایہ ندارد ازاں بکاہد ماہ ہمیشہ از گہر خود چو خور زر افشاں باش

دوسرے شعر کے متعلق حافظ کا شعر بھی سنئے۔

بادل خونیں لب خنداں بباید ہمچو جام
نے گرت زخمے رسد آئی چو چنگ اندر خروش

اے آفاق مہراں جادوئے مکحول | تو مشتغل از خلق و جہانے بتو مشغول

سحر بوئے نسیمت بمژدہ جاں سپرم | اگر اماں دہد امشب فراق تا سحرم
بکشت غمزۂ خونریز تو مرا صد بار | من از خیالِ لبِ جانفزات زندہ ترم
برغم فلسفیاں بشنو ایں دقیقہ زمن | کہ غائبی تو و ہرگز نرفتی از نظرم

ساقی بیا و در گہِ مے خانہ باز کن | مطرب تو نیز پردۂ مستانہ ساز کن
طرز غزل رہا کن و حکمت طراز باش | بشنو زمن حقایق و ترکِ مجاز کن

مکن اے خواجہ ملامت کہ پس از عہد شباب | ہوسِ دلبر و را مشگر و ساقی دارم
وامِ ایامِ جوانی ست کہ نگزاردہ ماند | خواہم۔ ار عمر اماں نے دہدم۔ بگزارم

زشمشیرِ محمود برّندہ تر | نگاہے کہ چشم ایاز آورد

مندرجہ بالا تین شعر اور مجنوں شدنی والا شعر مرزا عبداللطیف خاں نے خاص طور سے دیوانِ ادیب سے منتخب کئے تھے۔

قطعات | چند متفرق شعر اور سنئے۔

برتر ز نیستی و ز ہستی ست پایہ ام | مارا مجالِ بحثِ وجود و عدم کجاست
گیتی پُر از خسانِ پرندہ زباد ہاست | مردے چو کوہ ثابت و راسخ قدم کجاست
بگذر ازیں ہمہ کہ ز دل رست بیخِ غم | سیلے کہ برکند ز دلم بیخِ غم کجاست
ظلمت فرا گرفت اقالیم شرق را | رخشندہ آفتاب کہ روبد ظلم کجاست

آتشے کز جگرِ جام دلم را بفروخت | دود ازیں ملک دو سہ روزہ برآورد و بسوخت

سندباد

از ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ڈی لٹ پیرس

"یہ مختصر سا مقالہ میں نے بزمانۂ قیام یورپ ۱۹۳۲ء میں ایک فاضل ترکی دوست کی فرمایش پر لکھا تھا لیکن اُس وقت سے اب تک یونہی میرے مسودات میں پڑا رہا اب برہان میں شائع کرا رہا ہوں شاید ارباب علم اسے دلچسپی سے پڑھیں"

عبداللہ چغتائی

سندباد صاحبِ برہان قاطع کے بیان کے مطابق ایک کتاب کا نام ہے[1] جو حکمت میں ہے اور ابوبکر ازرقی نے اسے نظم کیا ہے جو ابوالفوارس طغانشاہ بن الپ ارسلان محمد بن جغری بیگ سلجوقی کا مداح تھا لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ "سندباد" دراصل گشتاسپ بن لہراسپ کے لڑکے کا نام ہے جو اسفندیار کا بھائی اور قدیم ملوک فرس میں سے تھا۔ اور بقول یاقوت حموی۔ قدیم قلعہ باب الآن کا بانی تھا[2]۔ حکمت و دانش میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ اس نے حکمت و نصیحت اور عقلیات میں ایک کتاب بھی تالیف کی تھی جو غالباً اس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہی "سندباد نامہ" کہلائی۔ شیخ سعدی بوستاں میں لکھتے ہیں ؎

---

[1] ملاحظہ ہو برہان قاطع و فرہنگ انجمن آرائے ناصری و مصنف قلزم وکادہ پرس مطہ ص ۱۳

[2] معجم البلدان مطبوعہ یورپ ج ۱ ص ۳۱۵

چہ خوب آمد ایں نکتہ در سندباد کہ عشق آتش ست اے پسر پند باد

بعض لوگوں کے نزدیک سندباد کے معنی یا حقیقت واضح نہیں ہے انھوں نے اسے "سند باد" پڑھا ہے حکیم ازرقی نے ایک قطعہ میں یوں لکھا ہے[1]

زاں پیشتر کہ چشم کشانم زخوابِ خویش در خانہ گردم بہ قضائے بام داد

از کیسہ ورع شمارم بہ پیشِ او گفتار شاہنامہ امثال سند باد

بعضوں نے سندباد کو بروزن بغداد لکھا ہے اور دال کو حذف کردیا ہے۔ یہ ایک مجوسی کا نام تھا جو نیشاپوری الاصل اور مذہبی فرق کے باوجود ابومسلم مروزی کے ساتھ گہری دوستی رکھتا تھا۔ بعضوں کے نزدیک "سنباد" کے لغوی معنی پتھر کے ہیں جس پر شمشیر وغیرہ تیز کرتے ہیں جس کا "سنباج" معرب ہے۔ مگر کتاب سندباد قصص وحکایات ایران وہند پر مشتمل ہے۔ اسلام سے قبل تالیف ہوئی۔ مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں "باب اخبار ہند وملوک قدیمہ" کے تحت یوں بیان کیا ہے۔

"ثم ملک بعدہ کوش فاحدث ہند اراء فی الدیانات علی حسب ما رای من صلاح الوقت وما یحمل من التکلیف اہل العصر وخرج من مذہب سلف وکان ملکتہ وعصرہ سندباذ ولہ کتاب الوزراء السبعۃ والمعلم والغلام وامرأۃ الملک وہند (ہو) الکتاب المترجم بکتاب السندباد"[2]

ابن ندیم (متوفی ۳۸۵ھ) نے اپنی تالیف کتاب الفہرست میں "اخبار السامرین والمخرفین واسماء الکتب المصنفہ فی الاسمار والخرافات" کے تحت بیان کیا ہے کہ کتاب کلیلہ ودمنہ کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ کتاب دراصل ہند میں تصنیف ہوئی جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے

---

[1] دیوان ازرقی مخطوطہ ایڈیشن موزیم۔ [2] ملاحظہ ہو۔ مروج الذہب از مسعودی۔

اوراسے شاہان اسکانیہ نے تالیف کرایا تھا پھر فارس کو بطور تحفہ دیدیا۔ یا فارس میں تالیف ہوئی اور ہند کو بطور تحفہ دی گئی۔ ایک گروہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ حکیم بزرجمہر نے اس کو تالیف کیا تھا واللہ اعلم۔[1]

بہرحال اصل کتاب یا تالیف "سندباد نامہ" حکمار ہند کی تصنیف ہو یا ایران والوں کی لیکن اس کے قدیم نسخہ کا پتہ ملتا ہے جسے الملک الرضا امیر نوح بن منصور بن نصر بن احمد بن اسمٰعیل سامانی (۳۶۶ - ۳۸۷ م) کے حکم سے خواجہ عبد الفوارس قناوزی نے زبان پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔[2] اور عربی نظم میں آبان ابن عبد الحمید الاحقی الرقاشی نے ابتدائی دور خلفائے عباسیہ میں پہلوی سے ترجمہ کیا۔[3] قناوزی کے فارسی ترجمہ کا ثبوت برٹش موزیم کے ایک مخطوطہ سے بھی ملتا ہے جس کا اول صفحہ نہیں ہے اور اس کے دوسرے باب میں جہاں مصنف کا نام لقب وغیرہ درج ہیں یوں مذکور ہے :۔

"میگوید مقرر این کلمات و محرر این مقامات الصدر الاجل الروحہ ملک الادبا والکتاب بہار الدین سعد الاسلام صاحب نظم و نثر معجز البیانین مفخر اللسانین بحر الفصاحت والبلاغت مقبل زبان و علامہ جہاں فرید الدھر وحید العصر محمد بن علی بن محمد بن عمر الظہیر الکاتب السمرقندی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "[4]

اس نے بیان کیا ہے کہ "سندباد" پہلے قدیم فارسی یعنی پہلوی میں تالیف ہوئی حتیٰ کہ اسے ابو الفوارس قناوذی نے نصیر الدین ابو عمید نوح بن منصور سامانی کے حکم سے فصیح فارسی میں ۳۳۹ھ میں ترجمہ کیا جو تاریخ مندرجہ کے اعتبار سے غلط ہے کیونکہ نوح بن منصور نے

---

[1] ابن ندیم۔ کتاب الفہرست (مطبوعہ مصر) ص ۴۲۳ - ۴۳۲ ۔ ومطبوعہ یورپ ص ۳۰۴ و ۳۰۵ ۔

[2] حواشی چہار مقالہ از علامہ قزوینی مطبوعہ یورپ ص ۱۷۵ ۔ [3] عربی ادب از زیراکلسمین مطبوعہ برلن ۱۹۰۱ء ص ۹۷ - ۹۶ ۔ [4] برٹش موزیم فہرست ۲۵۵ ص ۷۴۸

۳۶۶ھ سے ۳۸۷ھ تک سلطنت کی۔ کاتب کو تاریخ درج کرنے میں سہو ہو گیا ہے اس کی ادبی حیثیت کے متعلق بیان کرتا ہے کہ سادہ اور غیر مکلف زبان میں ہے۔

عوفی نے اپنی تالیف "لباب الالباب" میں دقائقی المروزی کے تذکرہ میں درج کیا ہے کہ:۔

"سندبادرا لباس عبارت پوشانیدہ است" [۱]

بہاء الدین محمد بن علی الظہیر الکاتب السمرقندی کافی عرصہ تک سلطان طمغاج خاں ابراہیم کا دیوان انشار رہا اس نے ترجمہ قناوزی کی اصلاح وتہذیب کرکے اس کو ابیات و امثال زبان عربی سے مزین کیا۔ اس بات کو امین رازی نے بھی ہفت اقلیم[۲] میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ بہاء الدین محمد بن علی نے تین یادگاریں چھوڑیں[۳] مثلاً۔

(۱) سندبادنامہ۔ (۲) اغراض السیاست۔ (۳) سمع الظہیر فی جمع الظہیر۔ [۴]

دوسری تصنیف کو قلیج طمغاج خاں کے نام معنون کیا گیا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بعد وفات سنجر (۵۵۲ھ) مکمل ہوئی۔ قلیج طمغاج خاں کے متعلق محض اس قدر معلوم ہے کہ یہ چھپن صدی ہجری میں ترکستان میں حکمراں تھا جسے ابن اثیر نے ۵۶۴ھ کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ رضی الدین نیشاپوری متوفی ۵۹۸ھ اس کے عہد کا بہت بڑا شاعر ہوا ہے۔ زیر بحث مخطوطۂ برٹش موزیم اس کی تعریف میں یوں گویا ہے۔

"رکن الدین والدنیا غیاث الاسلام والمسلمین فی العالمین قتلغ ایلکان طمغاج خاں بن قلیج قراخاں . . . . . "

اس کو عظیم الشان بادشاہ بیان کیا گیا ہے اس نے اپنے دشمنوں کو ۵۶۰ھ کے حدود میں توران میں

---

[۱] عوفی لباب الالباب ج ۱ ص ۱۹۱۔ [۲] ہفت اقلیم نسخۂ برٹش موزیم لندن ورق ۵۵۹۔
[۳] کشف الظنون مطبوعہ یورپ ص ۳۶۵ج ۱ [۴] کشف الظنون ج ۱ ص ۶

شکست دی تھی اور اپنی سلطنت کو وسعت دی اور انصاف بحال کیا۔

متذکرہ بالا بیان کو مدنظر رکھ کر علامہ قزوینی شرح چہار مقالہ میں فرماتے ہیں کہ سندباد کا نسخہ برٹش موزیم جو بہاء الدین ظہیری سمرقندی کی طرف منسوب ہے عوفی کی تغلیط کرتا ہے۔ البتہ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے دو نسخے ہوں ایک مروزی اور دوسرا بہاء الدین ظہیری سمرقندی کی طرف منسوب ہونے والا لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ ظہیری اور مروزی ہمعصر ہیں اس لئے دونوں ایک ہی کتاب کی اصلاح و تہذیب اپنے ذمہ لے لیں ذرا قابل غور معلوم ہوتا ہے۔ اول الذکر قلیج طمغاج خاں کا صاحب دیوان تھا۔ جبکہ "سندباد نامہ" سے ظہیر سمرقندی کا تعلق معلوم ہوتا ہے اور پھر عوفی خود بھی مروزی اور ظہیری کا ہمعصر ہے اور مروزی سے اپنی ملاقات بیان کرتا ہے۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ عوفی کو سہو ہو گیا ہے[1]۔ دراصل سندباد نامہ کی اصلاح و تہذیب دو نسخوں کی نہیں ہے بلکہ ایک ہی نسخہ کی ہے اور وہ بہاء الدین ظہیری سمرقندی کی طرف منسوب ہے حاجی خلیفہ صاحب کشف الظنون بھی عوفی کے اس قول میں مترددمعلوم ہوتا ہے[2]۔

غرضکہ متذکرہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوالفوارس قناوزی نے سندباد کو قدیم پہلوی زبان سے نوح بن منصور سامانی کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا اور بعد میں بہاء الدین الظہیری السمرقندی نے اس کی اصلاح و تہذیب کی پھر حکیم ازرقی نے اسے نظم کیا۔ اس کے قصیدہ کا وہ حصہ جو عضد الدولہ ابوبکر طغان شاہ کی مدح میں ہے ملاحظہ ہو[3]

شہریارا بندہ اندر مدحت فرمان تو گر توا ند کرد بنماید ز معنی ساحری
ہر کہ بیند شہریارا پندہائے سندباد نیک داند کاندر و دشوار باشد شاعری

---

[1] حواشی چہار مقالہ ص ۱۷۷ و ۱۷۱ و ۱۸۹۔ [2] کشف الظنون ص ۲/۴۱
[3] دیوان ازرقی مخطوطہ برٹش موزیم 3713، ورق ص ۲۵۹/ب

مہ معانیہاۓ اورا یا ور دانش کنم   گر کند بخت تو شاما عاظم را ملوری

اگر فی الواقع ازرقی کا یہ نسخۂ نظم وجود میں آیا تھا تو کم سے کم آج نا پید ضرور ہے انڈیا آفس میں ایک نسخہ بنام "سندباد" موجود ہے[1] جو ۷۷۶ھ میں نظم ہوا جس کا ناظم یعنی مصنف کوئی نامعلوم شخص ہے۔ علامہ قزوینی کا قول ہے کہ یہ نسخہ عیوب سے پُر ہے۔

اس مختصر مضمون سے صرف "سندباد" کی تاریخی، ادبی، اور ثقافتی حیثیت و حقیقت پر روشنی ڈالنا مقصود ہے نہ کہ نفسِ کتاب کی تفصیل۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (ص ۴۳۵) میں اسے سندباد نامہ کے زیرِ عنوان درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ایک مجموعۂ قصص ہے جن کا عام مفہوم یہ ہے:۔

ایک بادشاہ اپنے لڑکے کی تعلیم کو ایک فاضل "سندباد" کے سپرد کرتا ہے وہ اتالیق اس لڑکے کو سات یوم خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ملکہ اس لڑکے کو اس عرصہ میں تہمت لگاتی ہے اور بادشاہ اس کو جان سے مارنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس بادشاہ کے سات وزیر ہیں ان میں سے ہر ایک ایک یا دو قصے سنا کر اس لڑکے کے قتل کو ملتوی کرا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب آٹھویں روز لڑکا اپنی خاموشی چھوڑ کر گفتگو شروع کرتا ہے تو بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے۔

بہر حال یہ کتاب مسلمانوں کا ایک اثر ادبی ہے اور اس سے ان کے ذوقِ قصہ گوئی پر روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] از اتھے مولف فہرست مخطوطات انڈیا آفس ع ۱۳۳۶

دنیا کے تین جاہلی تمدن

از جناب مولوی صالح صاحب اعظمی جالپور

دنیا میں انسان کی زندگی کے لئے جو نظام نامہ بھی بنایا جائیگا اس کی ابتدار لامحالہ چند بنیادی عقائد سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہئے اور کس طرح اسے اس دنیا میں کام کرنا چاہئے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا۔ پھر اسی نظریہ اخلاقی کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی۔ پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورتیں اختیار کریں گے، اور آخرکار تمدن کی پوری عمارت ان ہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لئے جتنے مذہب و مسلک بنے ہیں ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے اور اصول سے لیکر فروعات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطۂ نظر ہے، کیونکہ یہ دستور زندگی

کا مزاج اس چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے اور یہ اس کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔

دنیا میں سب سے قدیم جاہلی تمدن یونان کا ہے جس کے افکار و نظریات پر دنیا کی تمام جاہلی تہذیبوں نے اپنا نشیمن بنایا ہے اور موجودہ مغربی تمدن بھی کوئی ایسا نو عمر تمدن نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں نہ ہوئی ہو، دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال کی پرانی ہے، اس کا نسبی تعلق یونان اور روما سے ہے، ان دونوں جاہلی تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ، اور مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر اور عقلی اور علمی سرمایہ چھوڑا تھا۔ وہ سب کے سب اس مغربی تمدن کے حصہ میں آئے۔

یونانی تہذیب و تمدن یونانی تہذیب موجودہ مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا واضح مظہر اور نمونہ تھی یہ پہلی تہذیب تھی جو خالص مغربی فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوئی، اور اس میں مغربی نفسیات کا پورے طور پر ظہور ہوا۔ یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی تعمیر ہوئی۔ جس میں بھی وہی یونانی روح کام کر رہی تھی۔ مغربی قوموں نے صدیوں تک ان دونوں تہذیبوں کی خصوصیات کو حرز جاں بنائے رکھا، انیسویں صدی میں انھیں خصوصیات کے ساتھ انھوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا، اس لباس کی چمک دمک سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں، اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یونانی اور رومی تہذیبوں کا مطالعہ کیا جائے تاکہ بصیرت اور معلومات کے ساتھ مغربی تہذیب پر تنقید کی جاسکے۔ یونانی تہذیب کو اگر اندر سے کھنگالا جائے تو اس کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے، اور اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

۱- یہ ملک غیر خدا پرستانہ تہذیب تھی، ان کے یہاں کسی حاکمِ علی الاطلاق کا تصور نہیں پایا جاتا، اور تقریباً خدا کے وجود میں بھی اشتباہ ہے۔

۲۔ آخرت کے تصور سے خالی، اور روحانیت سے بے نیاز۔

۳۔ عاجلہ پرستی اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید

۴۔ وطنیت اور قومیت کے بت کی پرستش اور عبادت۔

یعنی مختصر لفظوں میں اس کی تعبیر ایک لفظ "مادیت" سے کی جاسکتی ہے، پس یونانی تہذیب کی نمایاں خصوصیت مادیت ہے اور یہ خصوصیت یونان کی ایک ایک چیز سے ظاہر اور عیاں ہے آپ ان کے لٹریچر کا مطالعہ کریں تو ان کی شاعری، ان کا فلسفہ کائنات، ان کے دین، سب ان کی عاجلہ پرستی اور مادی دلچسپیوں کی غمازی کریں گے۔ ان کے یہاں خدا کا ایک موہوم اور دھندلا سا تصور پایا جاتا ہے، ان کا نظریہ کائنات بالکل مادی ہے، خدا کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ بت پرست قوموں کی طرح ان کے یہاں بھی خدا کے کام دیوتاؤں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں، ان کے یہاں بھی ایک روزی کا دیوتا ہے، ایک رحمت کا اور ایک قہر و عذاب کا، ایک محبت کا اور ایک حسن کا۔ ارسطو کے فلسفہ میں "عقول عشرہ" اور "افلاک تسعہ" کا جو شجرہ ملتا ہے وہ بھی اسی مادی عقلیت کا کرشمہ ہے۔

ڈاکٹر ہاس نے جینوا میں "یورپی تہذیب و تمدن کیا ہے؟" کے عنوان سے تین لکچر دیئے تھے جو یونانی تہذیب کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں، ان کا اقتباس ہم مشہور ترک خاتون خالدہ ادیب خانم کے توسط سے نقل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

> "موجودہ مغربی تہذیب و تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا۔ اس کا اصل الاصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ نشوونما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے، جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی، ڈرامہ، فلسفہ

سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی، ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پائی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچے، یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا عنصر ہے نہ باطنیت کا نہ علم دین ہے نہ پیشوایانِ دین کا طبقہ۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تمدن سرتاپا خدا سے بغاوت پر قائم تھا اور ایک یوم آخر کے تصور سے نابلد، ان کے نزدیک نفع عاجلہ ہی سب کچھ ہے۔

کسی قوم کے آرٹ اور کلچر سے آپ اس قوم کے مخصوص رجحانات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ یونان کے لٹریچر اور ان کی خرافیات (میتھالوجی) کے مطالعہ سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ جو قوم حسن و عشق کے دیوتا رکھتی ہو۔ جہاں دیوتاؤں کے حسن و عشق کے قصے مذہبی روایات کا درجہ رکھتے ہوں۔ کیا یہ خدا اور آخرت سے بے پروائی کا نتیجہ نہیں؟

تاریخ اخلاق کا مصنف "لیکی" لکھتا ہے کہ یونانی تحریک تمام تر عقلی اور عیش پرستانہ رجحانات رکھتی تھی۔ تاریخ یونان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں مذہب کے مراسم میں بھی جشن، کھیل تماشے کی اتنی آمیزش پائی جاتی تھی کہ جس کا تصور ایک مذہبی اور خدا پرست انسان کر نہیں سکتا تھا ان کے یہاں خدا کا تقدس سب اسی درجہ کا تھا جتنا کسی بزرگ شخصیت کا ہوتا ہے اور اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لئے بالکل کافی تھا۔[1]

یونانیوں کے ان مراسم پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ جو قوم اتنی مادہ پرست اور خوگرِ محسوسات ہو، جس کے عقائد سراسر بت پرستانہ ہوں، جو ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کا کوئی اچھا تصور نہ رکھتی ہو، جو اس کے حاکم علی الاطلاق اور قادر فعل و تصرف کا عقیدہ نہ رکھتی ہو، جو خدا کو ایک معطل اور بے صفت وجود مانتی ہو۔ جس کا نظریہ کائنات یہ ہو کہ یہ کائنات بے مقصد اور بے غایت ہے تو

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ از لیکی ترجمہ مولانا عبدالماجد صاحب بی۔ اے دریابادی۔

لامحالہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی زندگی میں خدا سے کوئی دلچسپی اور تعلق نہ ہوگا۔

عقائد کا اثر عملی زندگی پر | ان عقائد کا اثر یونانی معاشرت اور سوسائٹی پر یہ ہوا کہ دنیاوی لذائذ کی قدر و قیمت میں افراط و غلو، مجسموں اور عریاں تصویروں سے دلچسپی، سرود و موسیقی سے انہماک، فنونِ لطیفہ کی قدر دانی اور غیر محدود شخصی آزادی پیدا ہوئی اور زندگی سے زیادہ تمتع اور لطف اندوزی اور بوالہوسی کا داعیہ شدید سے شدید تر ہوگیا اور ان کے اسی چھچھورپن نے ان کے تمدن کے قصرِ رفیع کو بالآخر پیوند خاک کردیا۔ اور ان کے اندر بداخلاقی اور فحاشی اتنی عام ہوگئی کہ زندگی اور اخلاق کی قدریں بدل گئیں۔ اس دور میں زنانِ بازاری کو وہ عروج حاصل ہوا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرجع و مرکز بنا ہوا تھا۔ فلاسفہ، شعرار، مورخین، اہلِ ادب اور ماہرِ فنون۔ غرضکہ علم و فن کے تمام سیارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ رنڈی صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین نہ تھی بلکہ سیاست اور معاشرت کے مہماتِ مسائل میں بھی اس کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ یونانیوں کے ذوقِ جمال اور حسن پرستی نے ان کے اندر شہوانیت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکا دیا وہ اپنے اس ذوق کا اظہار جن مجسموں میں کرتے تھے وہی ان کی شہوانیت کو اور زیادہ ہوا دیتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کے ذہن سے یہ تصور ہی محو ہوگیا کہ شہوت پرستی بھی کوئی اخلاقی عیب ہے، ان کا معیارِ اخلاق اتنا بدل گیا تھا کہ بڑے فلاسفہ اور معلمینِ اخلاق بھی زنا اور فحش میں کوئی قباحت اور کوئی چیز قابلِ ملامت نہ پاتے تھے۔ ان کی سوسائٹی میں نکاح ایک غیر ضروری رسم سمجھی جانے لگے۔ آخر کار ان کے روایاتی مذہب نے بھی ان کی حیوانی خواہشات کے آگے سپر ڈالدی۔ کام دیوی کی پرستش تمام یونان میں پھیل گئی جس کی داستان یونانی "رومان" میں یہ تھی کہ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے تین اور دیوتاؤں سے آشنائی کر رکھی تھی، اور ان کے ماسوا ایک

ایک فانی انسان کو بھی اس کی جناب میں سرفرازی کا فخر حاصل تھا۔ اسی کے بطن سے محبت کا دیوتا "کیوپڈ" پیدا ہوا جو ان دیوی صاحبہ اور ان کے ایک دوست کی باہمی لگاوٹ کا نتیجہ تھا۔

یہ فحاشہ اس قوم کی معبود تھی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں جو قوم اس کیرکٹر کی دیوی صاحبہ کو اپنا معبود بنا لے اس کی اخلاقی پستی کا کیا عالم ہوگا۔ یہ اخلاقی انحطاط کا وہ مرتبہ ہے جس میں گرنے کے بعد کوئی قوم پھر کبھی نہیں ابھرتی۔ ہندوستان میں بام مرگ اور ایران میں مزدکیت[1] کا ظہور اسی دورِ انحطاط میں ہوا۔

عظیم الشان بابل میں قحبہ گری اور عیش پرستی کو مذہبی تقدس کا درجہ اس زمانہ میں حاصل ہوا جس کے بعد پھر دنیا نے کبھی بابل کا نام افسانۂ ماضی کے سوا کسی دوسری حیثیت سے نہ سنا۔ یونان میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہوگیا۔ فاحشہ عورتیں دیوداسیاں بن گئیں اور زنا ترقی کر کے ایک مقدس مذہبی فعل کے مرتبہ تک پہنچ گیا۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ اس ذواقیت اور لذتیت کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا کوئی دوسرا دور نصیب نہیں ہوا۔

قوم پرستی | یونانی تہذیب کی چوتھی خصوصیت قوم پرستی ہے۔ قوم پرستی کا سب سے پہلا درس دنیا کو یونان نے دیا اور وطن پرستی کو ایک مذہبی حقیقت کا درجہ یونانی فلسفیوں کے ذہن کی اختراع ہے، مقدس وطن اور مادرِ وطن کے الفاظ پہلے پہل انھیں کے لٹریچر میں استعمال کئے گئے۔ موجودہ جارحانہ وطن پرستی اسی شجرۂ خبیثہ کا ثمرِ غیر صالح ہے۔ ارسطو جسے لوگ معلم اخلاق کہتے ہیں اس کا سارا نظام اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے۔ یونانی حکماء نے فضائلِ اخلاق کی جو فہرست تیار کی تھی اس کے سرِ فہرست جو چیز رکھی گئی تھی وہ "حب الوطنی" تھی۔ ارسطو اس حب الوطنی کی تفسیر کرتے

---

[1] مزدکیت کے بنیادی اصول یہ تھے "زر" "زمین" "زن" کو مشترک اور سوسائٹی کی ملکیت ہونا چاہئے۔ یہ پہلی اشتراکی تحریک تھی جس کے بطن سے موجودہ اشتراکیت نے جنم لیا ہے۔

ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے کہ "یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں۔"

تاریخِ یونان میں زمرۂ فلاسفہ میں سے صرف حکیم سقراط ایسا نظر آتا ہے جو انسانیت اور اخلاق کو کسی قوم کی میراث اور جائیداد نہیں سمجھتا اور نہ "حق" کو کسی مخصوص گوشہ میں محصور کردینا چاہتا ہے اس استثنار کے سوا پورے یونان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو جہانیت اور آفاقیت کا قائل ہو۔ سقراط نے ایک موقع پر یہ کہدیا کہ میری ہمدردیوں کا حلقہ صرف یونان تک محدود نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان تک وسیع ہے تو لوگ حیرت اور استعجاب سے دیکھنے لگے۔[1]

رومی تمدن | یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا وہ اہلِ روم تھے، یہاں پھر وہی اتار چڑھاؤ کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے جو اوپر دیکھ چکے ہیں۔ رومی لوگ وحشت و تاریکی سے نکل کر جب تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو اُن کے نظامِ زندگی کا سارا نقشہ یونانیوں کے کھنڈر پر تعمیر ہوا نظر آتا ہے۔ رومی چونکہ بداوت اور وحشت کی زندگی گذار رہے تھے اس لئے انھیں علم وفن سے کوئی سروکار نہ تھا، لیکن جب ان کے ہاتھ میں دنیا کی زمام کار آئی تو ان کے سامنے بھی زندگی کے تمدنی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی مسائل آئے۔ چونکہ ان کے پاس علم وفن کی کوئی اپنی میراث آبائی نہ تھی اس لئے انھوں نے علم وفلسفہ، ادب وشاعری، اصولِ زندگی، قوانینِ معاشرت ومعیشت، شائستگی اور تمدن سب کچھ یونان سے لیا۔ گو یونانیوں کے ہاتھ سے طاقت واقتدار چھینا جا چکا تھا لیکن یونانی علوم وفنون کی برتری کا سکہ ابھی تک دنیا میں جاری تھا۔ یہ پہلی مثال تھی کہ ایک فاتح قوم اپنے مفتوحوں کے آداب واطوار، ذہنی اور فکری کمالات اختیار کرتی ہے۔ رومی عسکرانہ ذہنیت رکھتے تھے اور ادبِ عالیہ زبان و کلچر سے ناواقف تھے۔ نئے نئے

---

[1] گولڈ اسمتھ کا مضمون "قومی تعصبات" کتاب English essays Galiban.

تمدنی مباحث، معاشرتی مسائل، مابعد الطبیعی نظریات کے لئے ایسی زبان کی ضرورت پڑتی ہے جو اپنے دامن میں ایک وسیع ادب رکھتی ہو، موزوں اسلوبِ بیان کی حامل ہو اور اس میں اعلیٰ درجے کے اشارے اور کنایے کا ذخیرہ موجود ہو۔ چونکہ رومی زبان ان خصوصیات سے خالی تھی اس لئے رومیوں کے پڑھے لکھے طبقہ نے اپنے خیالات اور نظریات اور اپنے تصنیف و تالیف کے کاموں کو یونانی زبان میں شروع کیا، جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ رومی اپنے افکار و خیالات میں بالکل یونان کے غلام بن گئے اور یہ دستور عرصۂ دراز تک قائم رہا اور صرف تصنیف و تالیف پر کیا موقوف اطوار و خصائل، طرزِ معاشرت، جذبات و احساسات۔ غرضکہ ہر شعبۂ حیات میں یونانی تمدن، رومی تمدن پر غالب آگیا اور رومی پوری طرح یونان کے ذہنی غلام ہو گئے۔ یونانیوں کی جن چار خصوصیات کی طرف اوپر ہم نے اشارہ کیا، رومیوں کے یہاں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

رومیوں کا نظریۂ کائنات رومی بت پرست تھے، ان کے پاس کوئی آسمانی مذہب نہ تھا، ان کے عقائد چند خرافاتی اور توہماتی تخیلات پر مبنی تھے۔ بت پرستی نے ان کے اندر تمام بت پرستانہ خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ یونانیوں کی ذہنی اور فکری غلامی میں آجانے کے بعد ان کے عقائد اور توہمات پر ایک کلامی اور فلسفیانہ رنگ ضرور چڑھ گیا تھا۔ چونکہ زندگی کی مشعلِ ہدایت یونان کے پاس بھی نہ تھی اس لئے رومی بھی روحِ ہدایت سے خالی رہے اور اس طرح آہستہ آہستہ ان میں مادیت سے لگاؤ اور مذہب سے نفور پیدا ہونے لگا۔ ان کے یہاں اخلاق اور سیاست کی دوئی پہلے ہی سے تسلیم شدہ تھی، بت پرستانہ اخلاق ان کو ورثہ میں ملا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں کو زمین و آسمان کے انتظام سے کیا مطلب، دنیاوی زندگی بے مقصد اور بے غایت ہے، زندگی کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ "کھاؤ" "پیو" "عیش کرو"۔ دیوتا لوگ خود عرش پر بیٹھ کر سیاست اور امورِ دنیا سے بے تعلق ہیں۔ سسرو (Cicero) بیان کرتا ہے کہ تھیٹر میں جب اس مضمون کے

اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیاوی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تو لوگ انھیں نہایت شوق سے سنتے تھے[1]

رومی زندگی کی تمام روحانی قدروں سے [illegible] ناواقف تھے۔ انھوں نے کبھی بھی سنجیدگی اور واقعیت کے ساتھ دینداری اختیار نہیں کی، ان کے تقلیدی دیوتا محض یونانی حکایات اور خرافات کی بھکی نقل تھے۔ انھوں نے محض اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور قومی وحدت کے خیال سے ان ارواح اور بتوں کو تسلیم کرلیا تھا، انھوں نے اپنے ان دیوتاؤں کو کبھی بھی اپنی عملی زندگی میں قدم رکھنے نہ دیا، انھوں نے ان کو یہ حق بھی کبھی نہ دیا کہ وہ لوگوں پر اپنے اخلاقی قوانین نافذ کریں۔

قوم پرستی | قومیت اور وطنیت جو ایک مغربی مزاج قوم کی فطرت ہے اس کا شدت سے ان کے اندر احساس پایا جاتا تھا، وہ "روم"[2] کو خدا سے بلند و برتر سمجھتے تھے۔ "طاقت" ان کے یہاں بھی "حق" اور "باطل" کا واحد معیار تھی۔ اس لئے رومی شہنشاہی پر جو خاص خیال حاوی تھا وہ محض ملک گیری اور جلبِ منفعت کا خیال اور مادرِ وطن کے لئے دوسری قوموں کو معاشی اور سیاسی حیثیت سے تباہ کرنا تھا۔ رومی رؤسا اور امرا اور اونچے طبقے کے لئے فارغ البالی اور عیش و عشرت کی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لئے کسی ظلم و ستم کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ خود ملک کے اندر اقتصادی جنگ برپا تھی۔ پرولتاریہ اپنی موجودہ حالت کو بے چینی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، ٹیکسوں اور دیگر ذرائع سے ان کی تمام دولت حکومت کے پروردہ طبقہ کی جیبوں میں جا رہی تھی۔

نظامِ معاشرت | خدا سے بغاوت پر جو نظام عائلی بنتا ہے، اس کی اساس تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ یونان کے نظامِ معاشرت کی تباہی کی داستان ہم آپ کے کانوں تک پہنچا چکے ہیں، وہی

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ۔ [2] صرف روم ہی نہیں کہا جاتا تھا بلکہ مقدس روم (Holy .) کہا جاتا تھا۔

اسباب اور امراض اس نظامِ معاشرت میں بھی اثر انداز تھے جسے رومی تمدن کہا جاتا ہے۔

یہاں تاریخ پھر اپنا فیصلہ دہراتی ہے، جب روم میں شہوانیت، عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لئے ضروری ہوگئیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ نصیب ہوا کہ قیصر ٹائریس کے عہد میں معزز خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لئے ایک قانون نافذ کرنا پڑا فلورآ نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کو برسرِ عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش و عریاں مضامین بھی بے تکلف بیان کئے جاتے تھے اور عوام و خواص میں وہی ادب مقبولِ عام تھا جس میں استعارہ اور کنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔

آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس فحاشی کی اشاعت میں بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار فلسفیوں تک نے حصہ لیا۔ کاٹو (Cato) جس کو روم کا محتسبِ اخلاق کہا جاتا ہے صریح طور پر آوارگی کو حق بجانب ٹھیراتا ہے۔ اپکٹیٹس (Epictetus) جو فلاسفہ رواقیین (Stoics) میں بہت ہی سخت اخلاقی اصولوں کا پابند سمجھا جاتا ہے اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے شادی سے پہلے عورت سے اجتناب کرو۔ مگر جو اس معاملہ میں ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اس کو ملامت مت کرو۔

یہ ہے رومی تمدن کی پاکئ داماں کی حکایت اور یہ ہیں ان کے نظامِ عائلی کے روشن کارنامے۔

رومی تمدن میں انسانی جان کی قدر و قیمت | انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے مدنی حقوق میں اولیں حق زندہ رہنے کا حق ہے۔ اس کے مدنی فرائض میں اولیں فرض زندہ رہنے دینے کا حق ہے۔

ان دونوں اصولوں کو سامنے رکھ کر جب ہم رومی تمدن کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس تمدن میں ان دونوں اصولوں کو کبھی بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ ان کا خون کیا گیا، روم کے کولوسیم (Colosseum.) کے فسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ جس میں ہزار ہا انسان شمشیر زنی کے کمالات اور رومی امراء کے شوقِ تماشہ کے نذر ہوگئے۔ مہمانوں کی تفریح کیلئے یادوستوں کی تواضع کے لئے غلاموں کو درندوں سے پھڑوا دینا یا جانوروں کی طرح ذبح کردینا یا ان کے آگ میں جلنے کا تماشہ دیکھنا کوئی معیوب نہ تھا۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے کر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا۔ جاہل اور خونخوار امراء سے لے کر یونان و روم کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صورتیں جائز تھیں۔ ارسطو اور افلاطون جیسے اساتذۂ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے کہ وہ اپنے جسم کے ایک حصہ (یعنی جنین) کو الگ کردے یونان اور رومہ میں اسقاطِ حمل کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق تھا۔ رومی مقننوں کو اپنے قانون کی اس خصوصیت پر فخر تھا کہ اس میں اولاد پر باپ کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ حکماء رواقیئین (Stoies) کے نزدیک خودکشی کوئی بری چیز نہ تھی۔ بلکہ ایک ایسی عزت کی چیز تھی کہ لوگ جلسے کرکے خودکشیاں کیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ افلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہیں سمجھتا تھا۔ شوہر کے لئے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کردے اس لئے قانون میں اس فعل کی کوئی سزا نہ تھی۔

رومیوں کا فوجی اخلاق وسیع پیمانہ پر اُن کے قتل وغارت کے واقعات آج بھی تاریخ کے ریکارڈ ہیں۔ لیکن ان واقعات کو لکھنے سے پہلے روم کے فوجی نظام پر ایک نظر ڈالتے چلیں تاکہ واقعات کی روح آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ روم کا فوجی نظام، زمانۂ حال کے فوجی نظام کی طرح تھا

جس میں اخلاقی حدود و ضوابط کی کوئی پابندی ممکن نہ تھی، اُن کو اخلاقی تربیت، جنگ کی تعلیم اور عسکری ضبط و نظم کے قائم رکھنے کا کوئی بندوبست نہ تھا، جنگ کے موقع پر عام جنگجو باشندوں کا ایک انبوہ امنڈ کر آیا کرتا تھا اور ان کا یہ شوق صرف انھیں قتل و خوں کے کھیل میں شرکت کیلئے لاتا تھا تاکہ ہمسایہ ممالک کو لوٹیں، مخالف قوموں کو تہس نہس کریں، خوش باشی کے لئے مال و دولت خدمت کے لئے لونڈی غلام اور شہوت رانی کے لئے خوبصورت لڑکیاں حاصل کریں۔ خود ان کے بادشاہوں کے سامنے جنگ کا کوئی اخلاقی مقصد نہ تھا بلکہ محض نام و نمود کی خواہش، دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے تلوار اٹھائی جاتی تھی، یہی وجہ ہے کہ جب ان کی کوئی فوج کسی ملک میں پیشقدمی کرتی تھی تو بچے، بوڑھے، عورتیں، جانور، درخت، معبد، مندر، غرض کوئی چیز ان بدمستوں کے دستبرد سے نہ بچتی تھی، جو لوٹا جا سکتا تھا لوٹ لیا جاتا اور جو نہ لوٹا جا سکتا تھا اس کو آگ کی نذر کردیا جاتا تھا۔ روم سے افریقہ کے ونڈالوں (Vandals) اور یورپ کے گاتھوں (goths) کی ہمیشہ جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا اس کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ قیصر جسٹینن کے عہدِ حکومت میں جب ونڈالوں پر چڑھائی کی گئی تو ان کی پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا، جنگ سے پہلے اس قوم میں ۶۰۰۰۰ ہزار جنگجو مرد تھے اور ان کے علاوہ عورتوں، بچوں، مردوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ مگر جب رومی فاتحوں نے ان پر قابو پالیا تو ان میں سے ایک شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ سارا ملک ایسا تباہ کردیا گیا تھا کہ ایک اجنبی سیاح اس کے ویرانوں میں سارے سارے دن گھومتا تھا اور کہیں آدمزاد کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی، پیروکوپیوس ایک مشہور سیاح نے جب اول اول اس سرزمین پر قدم رکھا تھا تو اس کی آبادی کی کثرت اور تجارت اور زراعت کی فراوانی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا تھا مگر ۲۰ سال کے اندر وہ تمام گہما گہمی ویرانی سے بدل گئی اور پچاس لاکھ کی عظیم الشان آبادی قیصر روم کے

حملوں اور جفاکاریوں کی بدولت فنا کے گھاٹ اتر گئی۔[1]

یورپ کے گاتھوں کے ساتھ یہی وحشیانہ سلوک ہوا، یہاں تک ہم سنتے ہیں کہ ان کا بادشاہ ٹوٹیلا جب میدان سے زخمی ہو کر بھاگا اور ایک دور دراز مقام پر جا کر مر گیا تو رومی سپاہی اس کی تلاش میں نکلے۔ اس کی لاش کا سراغ لگایا، اس کو برہنہ کر کے ڈال دیا اور اس کے خون آلود کپڑوں کو تاج سمیت قیصر جسٹینین کے پاس تحفۃً بھیجا۔

سنہ ۷۰ء میں ٹیٹوس رومی نے جب بیت المقدس فتح کیا تو کہا جاتا ہے کہ دراز قد حسین لڑکیاں فاتح کے لئے چن لی گئیں، ۱۷ سال سے زیادہ عمر کے آدمی ہزار در ہزار پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے، کئی ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے اور شمشیر زنوں سے کٹوانے یا خود آپس میں ایک دوسرے کو کاٹنے کے کام لایا جا سکے، دوران جنگ میں ۱۷ ہزار آدمی گرفتار کر لئے گئے جن میں گیارہ ہزار صرف اس وجہ سے مر گئے کہ ان کے نگہبانوں نے انھیں کھانے کو نہیں دیا، ان کے علاوہ جنگ اور قتل میں جو لوگ ہلاک ہوئے ان کی مجموعی تعداد ۱۳۳۷۴۹۰ بتائی جاتی ہے۔[2]

یونانی اور رومی اپنے سوا دوسری قوموں کو وحشی اور بربری کہتے تھے اور ان کے قانون میں غیر یونانی اور رومی کے لئے غلامی اور قتل کے سوا کوئی تیسری صورت موجود نہ تھی، ارسطو جیسا انسان اس بات کا قائل تھا کہ قدرت نے بر ابرہ کو محض غلامی کے لئے پیدا کیا ہے۔

باغیانہ سوسائٹی اور لادینی کے ماحول میں رہتے رہتے رومی اتنے درندے اور وحشی ہو گئے تھے کہ لوگ اپنے کھیل تماشوں میں ہیبتناک نظارے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور ان نظاروں میں مجاز کی بجائے حقیقت کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے اگر ان کو کسی گھر کو جلتے ہوئے دکھانا ہو تو فی الواقع

---

[1] Gibbon. [2] Early days of Christianity by Ferror.

وہ چاہتے تھے کہ ایک گھر جلا دیا جائے۔ قیصر آگسٹس نے اپنی وصیت کے ساتھ جو تحریک منسلک کی تھی اس میں لکھتا ہے کہ ۸ ہزار شمشیر زنوں اور ۳۵۱۰ جانوروں کے کھیل میں دیکھ چکا ہوں۔ رومیوں کی تاریخ میں جنگ وجدال، قتل وغارت گری کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ تعمیری فلاح وبہبود کے کاموں سے انہیں کچھ بھی شوق نہ تھا۔ طوالت کے باعث میں ان کی سفاکیوں کی بہت بڑی داستان چھوڑ رہا ہوں۔

رومہ کی اقتصادی حالت رومہ کی اقتصادی حالت کے متعلق ہمارے لئے اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ عظیم الشان رومہ جس کے افسانے آج تک بیان کئے جاتے ہیں۔ اور جس کے تمدن کی عظمت وشوکت کے گیت گائے جاتے ہیں، یہ تمام رومی باشندوں کا تمدن نہ تھا بلکہ جس تہذیب وتمدن کو اس قدر حیرت اور استعجاب سے دیکھا جاتا ہے وہ دراصل وہاں کے اعیان وامراء کا تمدن ہے جو "پروردۂ حکومت" تھے وہاں کے غرباء اور چھوٹے طبقہ کے لوگ طرح طرح کی معاشی دقتوں میں مبتلا تھے۔ طبقہ امراء کا دارومدار زیادہ تر جنگوں اور معرکوں کے مالِ غنیمت پر تھا یا عوام الناس کے ٹیکسوں پر۔

ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی مشہور کتاب "معرکۂ مذہب وسائنس" میں رومیوں کی عیاشیوں اور لہو ولعب کی بڑی دردناک داستان لکھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:۔ "جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما انتہائے ترقی پر فائز ہوگئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ اہل رومہ کی عیش پرستی اور عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ زندگی کو سلسلۃ العیش بنادے، پاک بازی، حفظِ نفس کے خوانِ نعمت پر بمنزلہ نمکداں ہے اور اعتدال سلسلۂ حفظِ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے، ان کے دسترخوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی چمکتے ہوئے نظر آتے تھے، ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ہوئے ان کی خدمت کیلئے کمربستہ کھڑے رہتے تھے، ماہردیان روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیروں کی قید سے آزاد تھیں، ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف بالا کرنے کے لئے محو ناز رہتی تھیں، عالی شان حماموں، دل کشا

تماشہ گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی درندوں سے اس وقت تک مصروفِ زور آزمائی رہتے تھے جب تک کہ حریفوں میں ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سو نہ جائے۔ اہلِ روما کے سامانِ تعیش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی ہے تو وہ "قوت" ہے، اسلئے کہ اس قوت کی بدولت ہی سرمایہ حاصل کیا جاسکتا ہے جو دوسروں کی محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال اور املاک کی ضبطی، صوبہ جات کے محاصل کی تشخیص، زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولتِ روما اس زور قوت کا نشان ہیں۔ غرض روما کے نظامِ تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی ہے لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک سے مشابہ تھی جو یونانِ عہدِ قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا"

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر اقتصادی لوٹ مچی ہوئی تھی، اس کے لئے رومی لوگوں کو غلام بنا رہے تھے اور قتل کر رہے تھے، تن آسانی اور عیش پرستی پر قوم و ملک کا کتنا سرمایہ اڑایا جا رہا تھا، جب ایک طبقہ کی ہوسناکیوں کی یہ داستان ہے تو دوسرا طبقہ کس قدر مفلوک الحال رہا ہوگا؟ مانا کہ رومی امراء نے اپنی قوم کو اقتصادی حیثیت سے غلام نہ بنایا ہو لیکن اپنے مفتوحوں کے ساتھ ان کا یہ فعل کب جائز ہو سکتا ہے؟ ہم نے جہاں تک رومہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ خود اہلِ روما کا ایک بڑا طبقہ نانِ شبینہ کا محتاج رہتا تھا اور ان کے گلے میں مفلوک الحالی کا جوا ہر وقت پڑا رہتا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:۔

"جب ایرانیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش ان کا معبود بن گیا تو ان کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش و عشرت میں منہمک بن جائیں۔ چنانچہ ان کے طبقہ خواص (Privileged group.) کا ہر شخص دادِ عیش دینے لگا اور ان میں ایک طرح تفاخر کی شان پیدا

ہوگئی۔ یہ دیکھکر دنیا کے ہر گوشہ سے علما اور حکما ان کے ارد گرد جمع ہونے لگ گئے جو ان کے لئے سامانِ عیش مہیا کرنے کیلئے عجیب عجیب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے پر فضیلت اور فوقیت حاصل کرنے کی کوشش اور ان ایجادوں پر فخر کرنے لگے حتی کہ ان امرا اور سرمایہ داروں کا یہ حال ہوگیا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم مالیت کا پٹکا یا ٹوپی ہوتی تھی اسے بخیلی کا عار دلایا جاتا تھا۔ ایسے ہی انھوں نے عالی شان سربفلک محل، آبزن حمام، بے نظیر پائیں باغ، سواری کے نمایشی جانور خوبصورت غلام اور حسین باندیاں اپنی زندگی کا لازمہ قرار دے لیں اور زندگی کی ضرورت اصلی اسے سمجھ لیا کہ صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں جمع ہوں، جن میں طرح طرح کے لذیذ کھانے وسیع دسترخوانوں پر جمع ہوں اور فوق البھڑک لباس فاخرہ خوشبوؤں سے بسا ہوا زیب تن ہو۔

ان ملوک اور امرا کی زندگی کے یہ طور طریقے رفتہ رفتہ عوام کی معاشی حالت پر برے اثرات لائے اور ان کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی مسلسل خانہ جنگیوں سے اسبابِ معیشت تباہ ہوگئے جس کی وجہ سے سوسائٹی تباہ و برباد ہوگئی۔ اس ہمہ گیر بالی مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامانِ عیش کثیر دولت صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا اس کے لئے امرا اور حکمران طبقہ کاشتکاروں اور تاجروں پر نئے ٹیکس لگاتے تھے۔ سامانِ معیشت چونکہ پہلے ہی سے تباہ تھا اس لئے کسان اور تاجر نئے ٹیکس دینے سے انکار کردیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زبردستی ان سے ٹیکس وصول کئے جاتے تھے اور زیادہ سرکشی پر فوجی کارروائی عمل میں لائی جاتی تھی اور انھیں گرفتار کر کے طرح طرح سے عذاب دیا جاتا تھا۔"

جاگیردارانہ نظام سرمایہ داری کا یہ وہ مرقع جس کی صحیح تصویر شاہ صاحب کے فنکار قلم نے کھینچی ہے۔ یہ تمدن کے دو عظیم الشان ڈھانچے تھے جو غیر خدا پرستانہ نظریہ زندگی (Materialistic Conception) کی اساس پر قائم تھے لیکن چونکہ ان کی بنیاد زندگی کے صحیح تصور پر قائم نہ تھی اس لئے اس کا تباہ ہو جانا لازمی تھا۔

(باقی)

عوالمِ خمسہ اور مراتبِ وجود

ترجمہ از جناب خواجہ محمد علی رحمانی صاحب سہارنپور

ذیل کا مضمون حضرت شاہ فتح محمد صاحب محدث ابن حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ رحمہم اللہ
کی تصنیف رسالہ "مخزونات رحمانی" کا اردو ترجمہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد
وآلہ واصحابہ اجمعین۔ تمام تعریفیں اول سے آخر تک ظاہر و باطن میں جو کچھ ہیں حق تعالیٰ ہی کیلئے
ہیں۔ جو مدبر و سربی ہے کل عالم اور سارے جہانوں کا۔ اور رحمت و فضل، سلامتی و برکت نازل ہو اس
کے برحق پیغمبر جناب ختمی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی اولاد و ازواج اور
اصحاب و احباب پر۔ اور ان کے ساتھ جمیع امت پر تا قیام قیامت تک۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد ہر طالب حق اور
سالک طریقت کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرات صوفیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی اصطلاح میں
وجود کے پانچ مرتبے ہیں اور یہ حضرات کرام وجود کے ہر ایک مرتبہ کو عالم کہتے ہیں۔

اول عالم لاہوت ہے۔ دوم ہاہوت ہے۔ سوم جبروت۔ چہارم ملکوت اور پنجم ناسوت۔

مبتدی کی آسانی کیلئے پہلے ہم ناسوت کے مراتب بیان کرتے ہیں۔ عالم ناسوت صوفیہ
کی اصطلاح میں مرتبۂ ملک ہے۔ اور اسی کو عالم شہادت بھی کہتے ہیں۔ عرشِ اعظم سے مرکزِ خاک تک
عالمِ ناسوت کہلاتا ہے اور اس دائرۂ ناسوت کا مجموعہ کل تیرہ چیزیں ہیں۔ اول عرش مجید محیط عقلانی

نے شرح بخاری میں بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ عرش عظیم یاقوتِ سرخ سے بنا ہوا ہے اور اس کی دوری ودرازی اور بُعد کی مقدار ہر دو جانب میں پچاس ہزار برس کی راہ کی مسافت ہے اور اُس کی چوڑائی اوپر اور نیچے دونوں طرف پچاس پچاس ہزار برس کی راہ کا فاصلہ ہے۔

فضائلِ اعمال کی ایک حدیث مرفوع ہے کہ عرش عظیم کے سو پائے ہیں اور ملائکہ جب سے پیدا ہوئے ہیں اس وقت سے قیامت تک اگر ایک پائے کی مسافت طے کرنا چاہیں تو ہرگز طے نہیں کر سکتے

عرش کے بعد کرسی ہے جو بہشت کی زمین ہے۔ بہشت کے تمام بڑے بڑے درجے ایک ہزار چھ سو سولہ ہیں۔ ۱۶۱۶ اور اس کے بعد فلک[۳] زحل ہے جو آسمان اول ہے۔ پھر فلک مشتری[۴] ہے جو آسمانِ دوم ہے۔ پھر فلک[۵] مریخ جو آسمانِ سوم ہے پھر فلک شمس[۶] جو آسمانِ چہارم ہے پھر فلک[۷] زہرہ جو آسمانِ پنجم ہے۔ پھر فلک[۸] عطارد جو آسمانِ ششم ہے۔ پھر فلکِ[۹] قمر جو کہ آسمانِ ہفتم ہے۔ فلک قمر کو اگر اوپر کی طرف سے شمار کریں تو آسمانِ ہفتم ہے اور اگر نیچے کی طرف سے حساب لگائیں تو یہ آسمان اول ہے۔

علامہ نوویؒ وغیرہ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ کرسی اور جو چیزیں کہ کرسی کے اندر موجود ہیں عرش مجید کے مقابلہ میں رائی کے ایک دانہ کے برابر ہیں کہ جس طرح ایک وسیع میدان میں رائی کا ایک دانہ پڑا ہوا کالعدم معلوم ہوتا ہے اسی طرح کرسی اور جو چیزیں اس میں ہیں عرش مجید کے مقابلہ میں معلوم ہوتی ہیں اور اسی طرح ساتوں آسمانوں کا اپنی وسعت وگہرائی کے باوجود کرسی کے مقابلہ میں یہی حال ہے۔

فلکِ ہفتم کے بعد کرۂ[۱۰] آتش ہے جس میں شہاب پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کرۂ[۱۱] ہوا ہے جس میں ابر وغیرہ ہوتا ہے اور اس کے بعد کرۂ[۱۲] آب ہے جو دریائے محیط کے مانند ہے اور زمین[۱۳] کرۂ آب کے اندر گیند کی طرح ہے۔ زمین کا نصف سے زائد حصہ غرقِ آب ہے اور نصف سے کم حصہ پانی کے

باہر اور خارج ہے۔ زمین کا جو حصہ پانی سے باہر ہے پھر اُس کے دو حصے ہیں ایک حصہ محض ویران اور غیر آباد ہے اور اس میں کسی سمت اور جہت میں بھی عمارت و آبادی کا نام و نشان تک نہیں دوسرا حصہ معمور و آباد ہے اس کو معمورہ کہتے ہیں اور وہ ربع مسکون ہے۔ اسی معمورہ میں تمام دنیا آباد ہے۔ دریا جنگل میدان۔ پہاڑ۔ شہر۔ آبادیاں اور بستیاں اسی میں واقع ہیں اس کی مسافت کا اندازہ ایک سو بیس برس برابر چلتے رہنے کی مدت کا راستہ ہے۔ اس میں نوے برس کی راہ میں بستی ہے یاجوج و ماجوج کی جو یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اور بارہ برس کی راہ میں حبشی اور آٹھ برس کی راہ میں رومی اور تین برس کی راہ میں عرب بستے ہیں۔ اور سات برس کی راہ میں مغ یعنی آفتاب پرست و آتش پرست رہتے ہیں۔ یہ تفصیل بخاری شریف کی شرح میں خطیب عسقلانیؒ نے بعض کتب سے نقل کی ہے مگر یہ تمام تعبیریں متقدمین و سلف کی تحقیقات کی بنیاد پر ہیں۔

زمین پر حق تعالیٰ شانہ کی پیدا کی ہوئی انواع و اقسام کی مخلوق بکثرت موجود اور آباد ہے مگر اور دوسری مخلوقات ملائکہ، شیاطین، جنات وغیرہا کے مقابلہ میں انسان ایک ہزار کے مقابلہ میں صرف ایک ہوتا ہے۔ خطیب عسقلانیؒ ہی کی شرح میں ہے کہ زمین اپنی تمام وسعت اور پھیلاؤ، ہمہ گیری کے باوجود آسمانوں کے مقابلہ میں ایک خشخاش کے دانہ کے برابر ہے۔ کسی عارفِ کامل نے اسی مضمون کی طرف اشارہ کر کے انسان کو اس کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا ہے کہ

جہاں در جنبِ ایں نہ سقفِ مینا　　چو خشخاشے بود بر روئے دریا

بہ بیں خود را کزیں خشخاش چندے　　سزد گر بر بروتِ خود بخندے

اس کا ماحصل یہ ہے کہ (یہ تمام دنیا جہانِ کائنات، نو آسمانوں کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسا کہ خشخاش کا ایک دانہ دریائے وسیع و عمیق اور قلزم زخار میں پڑا ہوا ہو۔ تو تُو بھی اے غافل بندے اور خود بیں انسان اپنے آپ کو اور اپنی حقیقت کو دیکھ غور کر اور سوچ سمجھ کہ تو کتنا ہے۔ اور

تیری حقیقت اور ہستی کیا ہے، بے سوچے سمجھے اگر تو اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اپنی طاقت اور مونچھ بل پہ زور گھمنڈ رکھ کر ہنسے تو کیا یہ تجھ کو لائق اور سزاوار ہے۔ یہانتک بہت اختصار کے ساتھ عالمِ ناسوت کا بیان کیا گیا۔ اب اے جویائے صداقت اور جویندہ حقیقت عالم ملکوت کا حال معلوم کر۔

عالمِ ملکوت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملکوتِ اعلیٰ۔ دوسرے ملکوتِ اسفل۔ ملکوتِ اعلیٰ عالم ارواح کو اور ملکوتِ اسفل عالم مثال کو کہتے ہیں۔ ملکوتِ اسفل اور عالمِ مثال عرش عظیم کے اوپر ہے شارح قیصریؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ عالمِ مثال کی وسعت اور گیرائی اس قدر ہے کہ اس کے مقابلہ میں عرشِ عظیم مع اپنی تمام محتویات و موجودات اور اشیار مشتملہ کے ایسا ہے جیسے ایک صحرائے عظیم اور لق و دق بیابان میں ایک بہت چھوٹی سی انگوٹھی کا حلقہ پڑا ہوا ہو۔

عالمِ ناسوت جو کہ عالمِ اجسام ہے اور عالمِ ارواح جو کہ ملکوتِ اعلیٰ اور ارواحِ نورانی مجرد ہیں ان دونوں کے درمیان یہ عالم مثال ایک برزخ اور درمیانی شے کے طریق پر ہے۔ ہر ممکن اور موجود کے لئے جو کچھ اس عالم اجسام و عالمِ ناسوت میں ہوتا ہے اور مقدر و مقدور ہے اس کے لئے اس عالمِ مثال و عالم برزخ میں ایک صورت ہوتی ہے جو ممثّل و مناسب ہوتی ہے عالم ارواح کے۔ پھر وہ صورت ارواح سے فیض حاصل کر کے اجسام میں پہنچاتی ہے اور اس ترتیب کے ساتھ کائنات و عوالم کی ترتیب و تدبیر اور تنظیم و تنسیق ہوتی ہے اور اس عالمِ مثال کو عالمِ خیال بھی کہتے ہیں۔ اور ملکوتِ اعلیٰ جو کہ ارواح نورانی اور مجرد ہیں۔ اس کا نام عالمِ امر بھی ہے اور یہ ایک ایسا عالم ہے جس کی طرف حس و احساس کے ذریعہ (حسی طور پر) اشارہ نہیں کیا جا سکتا۔ ملکوتِ اعلیٰ کی جملہ موجودات دو قسم پر ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جن کا بوجوہ عالمِ اجسام سے کوئی تعلق نہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو عالمِ اجسام سے صرف چند وجوہ کی بنا پر تدبیر و تصرف کا تعلق رکھتی ہے۔

اول قسم جس کا عالمِ اجسام سے کوئی تعلق نہیں ایک خاص قسم ہے اور ملکوتِ اعلیٰ کی اس قسم کو

کروبی کہتے ہیں۔ پھر یہ بھی دو طرح پر ہیں۔ ایک قسم وہ ہے کہ جن کو عالمِ اجسام کی بالکل خبر نہیں اور عالمِ اجسام و عالمِ ناسوت کی طرف مطلق توجہ نہیں۔

وَهُمْ هَامُوا فِي جَلَالِ اللهِ تَعَالَى وَجَمَالِهِ مُنْذُ خَلْقِهِمْ

یعنی کروبیوں کی یہ خاص قسم ایسی ہے کہ جب سے حق تعالیٰ شانہ نے ان کو پیدا فرمایا ہے اس ذاتِ عالی صفات کے جلال و جمال میں ہائم و مستغرق اور متوجہ و محو ہیں۔ اسی لئے اُن کو مُهَيَّمِيَّة کہتے ہیں اور ان کی دوسری قسم وہ ہے کہ اگرچہ ان کو بھی عالمِ اجسام سے تعلق نہیں ہے مگر وہ بارگاہِ الوہیت کے دربان اور فیض ربوبیت کے وسیلے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ سے (جو اصل مبدع وجود و ایجاد اور سرچشمۂ فیضانات و کمالات ہے) فیض حاصل کرتے اور پھر تمام ارواح کو پہنچاتے ہیں۔ ان ارواح میں سب سے افضل و اعلیٰ، اجل و ارفع، اور اکمل و اتم روحِ اعظم ہے جو تعبیر و مراد ہے روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور روحِ اعظم کی نسبت افاضۂ فیض اور احاطۂ کمال میں تمام عوالم سے خواہ عالمِ ارواح ہو یا عالمِ مثال۔ عالمِ خیال ہو یا عالمِ شہادت، ایسی سمجھنی چاہئے کہ انسان کے نفس کی نسبت ہوتی ہے اس کے جسم و بدن کے ساتھ۔ حتیٰ کہ اگر مبدء فیاض کے سرچشمۂ فیض سے ان وسائط و ذرائع اور علائق و وسائل کے ذریعہ صدورِ فیضان اور ایصالِ فیض نہ ہو تو ہرگز ہرگز ممکن نہیں کہ وجود یا شہود کے اعتبار سے کوئی چیز بھی خارج اور واقع میں صورت پذیر ہو سکے اور کوئی صورت حاصل کر سکے۔

ملکوتِ اعلیٰ کی پہلی قسم کا حال معلوم کر چکے کہ اس کا عالمِ اجسام سے بچند وجوہ کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یہ کہ اس کی دو قسمیں بھی ہیں جن کا حال ذکر کیا جا چکا۔ اب ملکوتِ اعلیٰ کی دوسری قسم کا حال معلوم کیجئے جس کو کہ عالمِ اجسام سے تعلق و ارتباط ہوتا ہے اور وہ تعلق و ربط تدبیر و تصرف کا تعلق و رابطہ ہے اس لئے کہ نوعِ انسانی کے ہر فرد کے لئے ایک روح مجردہ ہوتی ہے اور اس

شخص اور فرد انسانی کے تعلق و تصرف کا تمام تر معاملہ اس روح مجردہ پر موقوف و مبنی ہوتا ہے، انسان کے نفس اور اس کے جسم و بدن میں جیسی صلاحیت و استعداد اور قابلیت و لیاقت ہوتی ہے اسی کے مقتضا کے مطابق ہوتی ہے اور روح مجردہ اسی کے موافق روح سے فیض حاصل کر کے اس شخص کی مثالی صورت اور برزخی ہیئت کے واسطہ سے جو کہ عالم مثال میں مُمَثَّل و مناسب ہے اس جسم و بدن اور نفس کو پہنچاتی ہے۔

نیز ان ارواحِ مجردہ کے علاوہ اور دوسری مَلَکی روحیں اور ملکوتی ارواح بھی ہیں۔ جن کی صحیح تعداد و شمار حق تعالیٰ شانہ ہی کے علم و احاطہ میں ہے اور وہ ملکی روحیں ان ارواح مجردہ کی خاص معاون و مددگار ہوتی ہیں۔ اور ان کو بھی ملکوتِ اسفل کہتے ہیں۔ اسی بنا پر اربابِ مشاہدہ و اہلِ کشف نے فرمایا ہے کہ جب تک سات فرشتے نہ ہوں اس وقت تک درخت کا ایک پتہ بھی باہر نہیں نکلتا۔ چنانچہ پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ مَلَکًا" یعنی ہر چیز اور ہر شے کے لئے ایک نہ ایک فرشتہ ضرور ہوتا ہے جو اس شے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے "یَنْزِلُ لِکُلِّ قَطْرَۃٍ مَلَکًا" کہ بارش کے ہر قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے۔

اسی طرح احادیث و روایات میں قسم قسم کے ملائکہ، ملکوتی ارواح اور مَلَکی روحوں کا ذکر وارد ہے۔ چنانچہ ملک الریح (ہوا کا فرشتہ) ملک الرعد (کڑک کا فرشتہ) ملک البرق (بجلی کا فرشتہ) ملک السحاب (بادل کا فرشتہ) وغیر ذلک، ملائکہ کی احادیثِ صحیحہ میں تصریح موجود ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عالمِ ناسوت میں جو کچھ کون و فساد اور حرکت و سکون کے قبیل سے ہوتا ہے یہ تمام فیضان حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے جو کہ مبدءِ فیاض ہیں اولاً و بالذات اسماء الٰہیہ کو جو کہ ارباب مقیدہ ہیں پہنچتا ہے۔ اور ذات پاک مبدءِ فیاض سے یہ تمام فیضانات بواسطہ اسمائے الٰہی اعیان ثابتہ و (حقائق الٰہیہ) پر فائز و وارد ہوتے ہیں۔ اور اعیانِ ثابتہ و اسمائے کونیہ کے ذریعہ

واسطہ سے روح اعظم کو یہ جملہ فیوض حاصل ہوتے ہیں۔ پھر روحِ اعظم سے ارواح کو ان کی استعدادات اور صلاحیت کے مناسب ولائق ان اسمائے الٰہیہ کا فیضان حاصل ہوتا ہے پھر ہر روح بواسطہ اپنی صورت معنوی کے اپنے عالمِ ناسوت میں خود متصرف ہوتی اور تدبیر و نظم کرتی ہے۔ روح کا اپنے اجسام و نفوس میں اس تصرف وتدبیر معنوی کا بعض افراد کو شعور واحساس ہوتا ہے جیسے انسانی افراد اور حیوانی افراد۔ اور بعض افراد کو شعور واحساس نہیں ہوتا جیسے نباتاتی وجماداتی افراد۔

اگرچہ یہ امر پایۂ ثبوت اور مرتبۂ یقین کو پہنچ چکا ہے اور کشف ومشاہدۂ اربابِ بطون سے یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ نباتی وجمادی افراد کو بھی ایک خاص قسم کا شعور وادراک ہوتا ہے۔ مگر اہلِ کشف بیان کرتے ہیں . . . . کہ نباتات وجمادات اور معدنیات کے شعور وادراک کا یہ ڈھنگ اور طریقہ نہیں جیسا کہ انسان وحیوان کے ادراک وشعور کا حال ہے بلکہ ان کا علم وشعور ان کی اپنی صورت نوعیہ کے مناسب ہے۔

یہاں تک جو مذکور ہوا یہ سب عالمِ ملکوت کا بیان تھا اور اس سے قبل ہم عالمِ ناسوت کا ذکر کر چکے ہیں اب عالمِ جبروت کا ذکر سنئے۔ عالمِ جبروت عالمِ ملکوت کے اوپر ہے اور یہ عالمِ جبروت الٰہی صفات اور ربانی اوصاف ہیں اور اسی کو عالمِ واحدیت کہتے ہیں اور یہ عالم تمام اسمائے الٰہی اور اسمائے کونی پر مشتمل وحاوی ہے۔ اور سب کا مخزن وجامع۔ صوفیۂ محققین نے اپنی اصطلاح میں اٹھائیس اسمائے الٰہی اور اٹھائیس اسمائے کونی مقرر کئے ہیں۔ ان کی تفصیل اور مکمل تحقیق کتاب جام جہاں نما کے دائرہ واحدیت میں لکھی گئی ہے۔

قدر ضروری اس کا یہ ہے کہ اسمائے الٰہی میں سے ہر ایک اسم کو حقائقِ الٰہیہ کہتے ہیں اور اسمائے کونی وکیانی کو اعیانِ ثابتہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اسمائے الٰہیہ اربابِ مقیدہ ہیں اور ہمیشہ وپیوستہ اسمائے الٰہیہ کا فیض اسمائے کونیہ کو

چونکہ اعیان ثابتہ اور مظاہر جمالی اسمائے الٰہیہ میں پہنچتا رہتا ہے۔ اور پھر اُن سے بواسطہ روحِ اعظم خارج وواقع میں ظاہر وصادر ہوتا ہے جیسا کہ سابق میں بیان کیا گیا۔ الغرض اس مجموعہ کو عالمِ جبروت کہتے ہیں۔

اور اس مرتبہ کے اوپر ذات پاک الٰہی ہے اور اس کو ہاہوت کہتے ہیں۔ یہی عالمِ وحدت ہے حق تعالیٰ شانہ کی ذات مقدس اپنی وحدت میں صفتِ احدیت کے ساتھ متصف وموصوف ہے۔ جس میں تمام اعتبارات وتعینات اور نسب وقیود واضافاتِ ساقط وکالعدم ہیں اور تمام صفات واوصاف مسلوب ومنفی۔ اور یہی ذات تبارک وتقدس صفت واحدیت کے ساتھ بھی موصوف متصف ہے اور اس مرتبہ میں تمام اعتبارات کا اثبات بھی ہے اور تمام صفات لائقہ سے اتصاف بھی۔ یہ مرتبہ تمام موجودات کے مربی ومالک اور تمام ممکنات کے مرجع (اور مرجوع الیہ) کا مرتبہ ہے اور اس مرتبہ کو حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ کے بعد مظہر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبۂ ظہور (وعیان اور وجود وشہود) میں سوائے وجوبِ ذاتی کے یہ کلمات (صفات واعتبارات) بھی شامل ہوگئے۔

اس دقیقہ اور نکتہ کو حقیقتِ انسانی اور افرادِ انسانی کی مثال میں اس طرح سمجھو کہ مرتبہ جبروت، حقیقتِ انسانی کو کہتے ہیں۔ اب یہ مرتبہ جو تمام اسمائے الٰہی اور اسمائے کونی پر مشتمل ہے بالاجمال اور فی الاصل ہر فردِ انسان میں موجود وثابت ہے لیکن اگر کسی فردِ انسان کی استعداد وصلاحیت کامل اور قابلیت تام ہو تو اس فرد میں کامل ومکمل طور پر اس مرتبہ کا ظہور ہوگا۔ اور اگر کسی فردِ انسان کی صلاحیت واستعداد وقابلیت مکمل نہ ہو تو اس میں کامل طور پر اس کا ظہور نہ ہوگا۔ حالانکہ ہر انسان میں بالاجمال اور ہر فرد کی حقیقت میں بالاصل مستور وکامن ہے۔ اکثر اہلِ کشف وارباب مشاہدہ کے اعتقاد کے بموجب تمام سالکین طریقت اور طالبین سلوک سے

یر و سلوک کا منتہی اسی مرتبۂ جبروت تک ہوتا ہے۔

بعض محققین جیسے شیخ محی الدین ابن عربیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ سالکِ صادق یعنی ۔۔۔ِ محقق یا غوث، یا فردِ کامل جو جناب رسالت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت اور پوری پیروی کرتا ہے اور حضرت نبوت (ارواحنا و ارواح ابینا و امہاتنا بداہ) کے قدم بہ قدم چلتا ہے۔ سنت نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے اتباع اور پیروی کی وجہ سے تام ہاہوت تک پہنچ جاتا ہے اور اس کی سیر اور اس کا سلوک اس اول مرتبہ سے متصف ہو جاتا ہے ن وہ دوسرے جن کو کمال متابعت کا درجہ اور پوری پیروی کا حصہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس رتبہ کی سیر کے ساتھ متصف نہیں ہوتے بلکہ جبروت میں پہنچنے کے بعد رک جاتے ہیں البتہ اس مرتبہ کا صرف مشاہدہ ان کو ہوتا ہے۔

یہ تمام مراتب جو بیان کئے گئے یعنی مرتبۂ ہاہوت۔ مرتبۂ جبروت، مرتبۂ ملکوت۔ مرتبۂ اسوت۔ یہ جملہ مراتب اربعہ تعین اول میں داخل ہیں جو تمام تعینات کو شامل ہے اور اس مرتبہ کے پر (یعنی مرتبۂ تعینِ اول کے اوپر) مرتبہ لاتعین ہے جس کو لاہوت کہتے ہیں۔ اس مرتبہ کے ال اور انتہا تک کسی نبی اور ولی کا علم نہ دنیا میں آج تک پہنچ سکا ہے اور نہ آخرت میں پہنچیگا۔

برخلاف ان مراتب اربعہ کے کہ ہر فردِ انسان جو سالکِ طریقت طالبِ حقیقت اور ۔ورد شاہراہِ معرفت ہو اپنی فطری استعداد اور جبلی قابلیت کی بنا پر درجہ بدرجہ ان مدارج کی ۔ف صعود و عروج کرتا ہے اور اپنے جوہرِ قابل اور قابلیتِ صالح کے موافق مراتبِ اربعہ بتدریج ۔ے کرتا جاتا اور ترقی و ارتقاء سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

تو مستحق نظر شو کمال و قابل فیض
کہ منقطع نشود فیض ہرگز از فیاض

Abn Maskawaih. | از خواجہ عبدالحمید صاحب۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۳۰ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد عہ

علامہ ابن مسکویہ المتوفی سنہ۴۲۱ھ جس طرح اپنے عہد کے نامور طبیب۔ مورخ۔ اور علم الاخلاق کے ماہر وفاضل تھے ایک بلند پایہ فلسفی بھی تھے چنانچہ انھوں نے الفوز الاصغر کے نام سے فلسفہ میں بھی ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ اس کتاب میں علامہ نے وجودِ صانع روح اور نبوت پر ایک مسلمان فلسفی کی حیثیت سے کلام کیا ہے۔ خواجہ عبدالحمید صاحب نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے ہی استاد ہیں اس کتاب کا خلاصہ انگریزی میں منتقل کیا ہے اور پھر تقریباً چالیس صفحات میں علامہ ابن مسکویہ کے فلسفہ کی نمایاں خصوصیات پر فاضلانہ کلام کیا ہے اور اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ علامہ مرحوم کے مخصوص طرزِ فکر و طریقِ استدلال کے دراصل ماٰخذ کیا ہیں اور انھوں نے ارسطو اور افلاطون کے علاوہ خود فارابی سے جس کے فلسفہ کی شہرت ابنِ مسکویہ کے عہد میں کمال کو پہنچ چکی تھی۔ کس حد تک استفادہ کیا ہے۔ اربابِ ذوق کے لئے عموماً اور فلسفہ کے طلبا اور اساتذہ کے لئے خصوصاً اس کا مطالعہ دلچسپی، افادہ اور ذہنی بصیرت کا موجب ہوگا۔

Muslim Contribution to Geography. | از جناب نفیس احمد صاحب ایم۔ اے پروفیسر جغرافیہ اسلامیہ کالج کلکتہ۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۸۰ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد پانچ روپے۔

علم جغرافیہ کی تحصیل وتکمیل اور پھر اس کی ترقی وترویج میں مسلمانوں نے جو عظیم الشان کام کیا ہے. زیرِ تبصرہ کتاب میں اس پر سلیقہ مندی سے مرتب ومہذب کلام کیا گیا ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ حج اور تجارتی شوق کی وجہ سے مسلمانوں میں کس طرح ابتداءً جغرافیہ دانی کا شوق پیدا ہوا اور پھر کس طرح عہد بعہد اس نے ترقی پذیر ہو کر علم جغرافیہ میں مسلمانوں سے شاندار تحقیقات واکتشافات کرائے اور انھوں نے صرف نظری طور پر نہیں بلکہ ملک ملک کی خاک چھان کر اور سمندروں کی گہرائیاں ناپ کر اس علم کا عملی تجربہ کیا اور اس سلسلہ میں اپنے مخصوص افکار ونظریات قائم کئے۔ اگرچہ موضوع کی وسعت وپہنائی کے اعتبار سے کتاب مختصر ہے تاہم کام کی باتیں سب آگئی ہیں اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ جس وقت یورپ جغرافیہ ارض سے متعلق حد درجہ مضحکہ انگیز معلومات پر قانع بیٹھا تھا مسلمان اس زمانہ میں ایک طرف مشرق ومغرب کی وسعتوں کا جائزہ لے رہے تھے اور دوسری جانب اجرام سماویہ کے ابعادِ ثلاثہ کی پیمائش اور ان کے حرکات وافعال کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ متعدد نقشوں نے کتاب کی اہمیت اور افادیت کو دوچند کردیا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں کتابوں کو شیخ محمد اشرف صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان اور غیر مسلم حکومت | از پروفیسر محمد سرور صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ تقطیع خورد ضخامت ۲۳۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ؎ پتہ:۔ ادارہ ادبیات نوٹمبل روڈ۔ لاہور۔

سنہ۲۱ء کا مشہور مقدمہ کراچی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا اس مقدمہ میں حکومت برطانیہ مدعی تھی اور مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی، شوکت علی وغیرہم مدعا علیہم حکومت کا دعویٰ یہ تھا کہ ان حضرات نے فوج کی ملازمت کو حرام کہہ کر حکومت کے خلاف بغاوت

پیدا کرنی چاہی ہے۔ اس کے جواب میں مجاہدینِ ملت کا کہنا یہ تھا کہ ایک مسلمان کے لئے ایک مسلمان کو قتل کرنا قطعاً حرام ہے اور جو لوگ انگریزی فوج میں داخل ہوتے ہیں انھیں ایک نہ ایک دن ترکوں سے ضرور لڑنا پڑے گا۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے فوج میں ملازم ہونا ناجائز اور حرام ہے۔ اور اگر حکومت پھر بھی مسلمانوں کو فوجی ملازمت پر مجبور کرتی ہے تو گویا وہ مذہب میں مداخلت کرتی ہے اور ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے مطابق اسے ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد علی مرحوم نے جو بیانات اپنی اور اپنے رفقار کی طرف سے عدالت کے روبرو دیئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ حق گوئی، جذبۂ آزادی وولولۂ ایمانی۔ پھر ساتھ ہی سوز وگداز، درد اثر اور جرأت دیباکی کے لحاظ سے حددرجہ ایمان افروز بھی ہیں اور جرأت آموز بھی۔ پروفیسر محمد سرور نے زیرِ تبصرہ کتاب میں اسی مقدمۂ کراچی کے مختصر روئداد نقل کرکے مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد علی مرحوم کے یہ بیانات اور جج کا فیصلہ یہ سب چیزیں مرتب کردی ہیں۔ اس کے بعد لائق مرتب نے "محاکمہ" کے عنوان سے ایک دلچسپ اور مفید بحث کی ہے جس میں انھوں نے ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کی تحریکاتِ قومی کا وسعتِ نظر اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا ہے اور پھر بتایا ہے کہ اب مسلمانوں کو کس طرح قیادت کے بدلنے کی ضرورت ہے ورنہ ان کے لئے خطرات بیشمار ہیں محاکمہ کے زیرِ عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے ہمارے نزدیک وہ اگرچہ تشنہ و ناتمام ہے۔ پھر مصنف کے نقطۂ نظر سے کلی اتفاق بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم جو کچھ لکھا ہے بڑی سنجیدگی، معقولیت اور متانت سے لکھا ہے۔ اربابِ ذوق کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

محاوراتِ داغ | ازجناب ولی احمد خاں صاحب وزیرِ اعظم دوجانہ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۳۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد چھ روپیہ پتہ:۔ مکتبہ ادب۔ اردو بازار دہلی۔

نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کا کلام اردو زبان کے مستند اور ٹکسالی محاوروں اور

ضرب الامثال سے بھرا پڑا ہے۔ ولی احمد خاں صاحب نے کئی سال کی محنت کے بعد ان سب کو ایک کتاب میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا ہے۔ ترتیب کی صورت یہ ہے کہ ہر صفحہ میں چار کالم ہیں۔ پہلے کالم میں محاورہ، دوسرے میں اس کے معنی اور تشریح۔ تیسرے کالم میں وہ شعر جس میں محاورہ آیا ہے اور پھر آخر کالم میں شاعر کے اس دیوان کا حوالہ ہے جس سے وہ شعر لیا گیا ہے۔ اس طرح ۴۴۶۴ اشعار اور ان کے محاورات مع تشریحات کے یکجا ہوگئے ہیں۔ شروع میں داغ مرحوم کی شاعری اور حالات پر ایک مختصر مگر سنجیدہ مقدمہ بھی ہے۔ لائق مرتب کی یہ ادبی خدمت بے شبہ لائق و سزاوار آفریں ہے۔ امید ہے زبان کا ذوق رکھنے والے حضرات اس کی قدر کریں گے۔

ہم اور وہ از خواجہ محمد شفیع تقطیع کلاں ضخامت ۸۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ گردپوش خوبصورت پتہ: مکتبۂ ادب اردو بازار دہلی۔

خواجہ صاحب نے کئی سال ہوئے مذکورہ بالا نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس عام خیال کی تردید کی گئی تھی کہ ہمارے بزرگ سراپا محاسن تھے اور ہم اُن کے اخلاف سرتاسر عیب و نقصان ہیں۔ پیرایۂ بیان تمثیل کا ہے۔ خواجہ صاحب کی یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ تھوڑی مدت میں ہی اس کے تین اڈیشن ختم ہوگئے اب مکتبۂ ادب نے اس کا چوتھا اڈیشن نسبۃً زیادہ ٹیپ ٹاپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زبان و بیان۔ فصاحت و بلاغت، زورِ کلام اور جوشِ اظہار، روانی و بیاختگی اور عبارت کی سلاست و انسجام ان سب اوصاف کے لحاظ سے یہ کتاب اس زمانہ کا بہترین ادبی شاہکار ہے۔ امید ہے کہ ادب و زبان کا ذوق رکھنے والے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور سچی قدر کریں گے۔

سرخ افسانے از اسرار احمد صاحب آزاد۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۲۸۸ صفحات طباعت و کتابت بہتر۔ قیمت تین روپیہ۔ پتہ نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ انقلاب کے بعد کے روس کی زندگی سے متعلق انیس روسی افسانوں کا اردو ترجمہ ہے۔ ان افسانوں میں اشتراکیت کی روح پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کے مطالعہ سے غنودگی کی کیفیت طاری نہیں ہوتی بلکہ رگوں میں زندگی کی امنگ، ولولہ و شجاعت انسانی ہمدردی اور جدوجہد عمل کا خون تیزی کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے۔ ہم روسی زبان سے واقف نہیں۔ البتہ ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ عبارت کا زور اور اس کی روانی اور برجستگی دیکھکر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادیب جو اشتراکیت پرستی کی آڑ میں عریاں نویسی کی ترویج کر رہے ہیں وہ ان افسانوں سے اگر چاہیں تو کافی سبق لے سکتے ہیں کہ ان میں زندگی کی دردناک اور گوناگوں تصویریں جگہ جگہ نظر آتی ہیں لیکن فحاشی کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔

دیوان امام ابوبکر بن درید الازدی

امام ابوبکر بن درید تیسری صدی ہجری کے نامور محدث اور ادیب ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ مولانا سید محمد بدرالدین صاحب علوی استاد عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے کئی سال کی محنت اور وسیع مطالعہ کے بعد آپ کا دیوان اشعار مرتب کیا اور مصر سے شائع کیا گیا۔ کاغذ اور ٹائپ نہایت عمدہ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں انڈکس اور حاشیہ میں مشکل الفاظ کی شرح بھی ہے۔ ارباب علم و ادب کے لئے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ہے۔ قیمت تین روپیہ

منیجر مکتبہ برہان قرول باغ دہلی سے طلب کیجئے

خلافتِ راشدہ: تاریخِ ملت کا دوسرا حصہ جدید اڈیشن

قیمت ۸ مجلد ۱۲ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ

سنہ ۱۹۴۳ء: مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول

لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ۸ مجلد للعہ

سرمایہ: کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ

ورفتہ ترجمہ، جدید اڈیشن۔ قیمت عہ ۱۲

اسلام کا نظامِ حکومت۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت

کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث ۶ مجلد عہ

خلافتِ بنی امیہ: تاریخِ ملت کا تیسرا حصہ ۸

مجلد ۱۲ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ۔

سنہ ۱۹۴۴ء: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت

جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت

جلد ثانی للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم انبیاء علیہم السلام

کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی۔ ۸ مجلد صہ ۸

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی ۸ مجلد للعہ ۸

سنہ ۱۹۴۵ء: قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف

پر جدید اور محققانہ کتاب عہ مجلد ے

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان صہ ۸ مجلد ۸

انقلابِ روس۔ ے

سنہ ۱۹۴۶ء: ترجمان السنہ: ارشاداتِ نبوی کا جامع

اور مستند ذخیرہ جلد اول عہ مجلد ۱۲

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا نظمِ مملکت للعہ مجلد صہ

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابنِ بطوطہ

قسم اعلیٰ ے قسم دوم دو روپئے آٹھ آنے۔

مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر

نتیجہ خیز اور دلچسپ کتاب۔ دو روپے۔

مفصل فہرستِ کتب دفتر سے طلب فرمائیے

اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل

بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

Registered. No. L. 4305

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) محسنِ خاص ۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین ۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین :۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے، وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کیلئے ۱؎ ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی قرول باغ سے شائع کیا